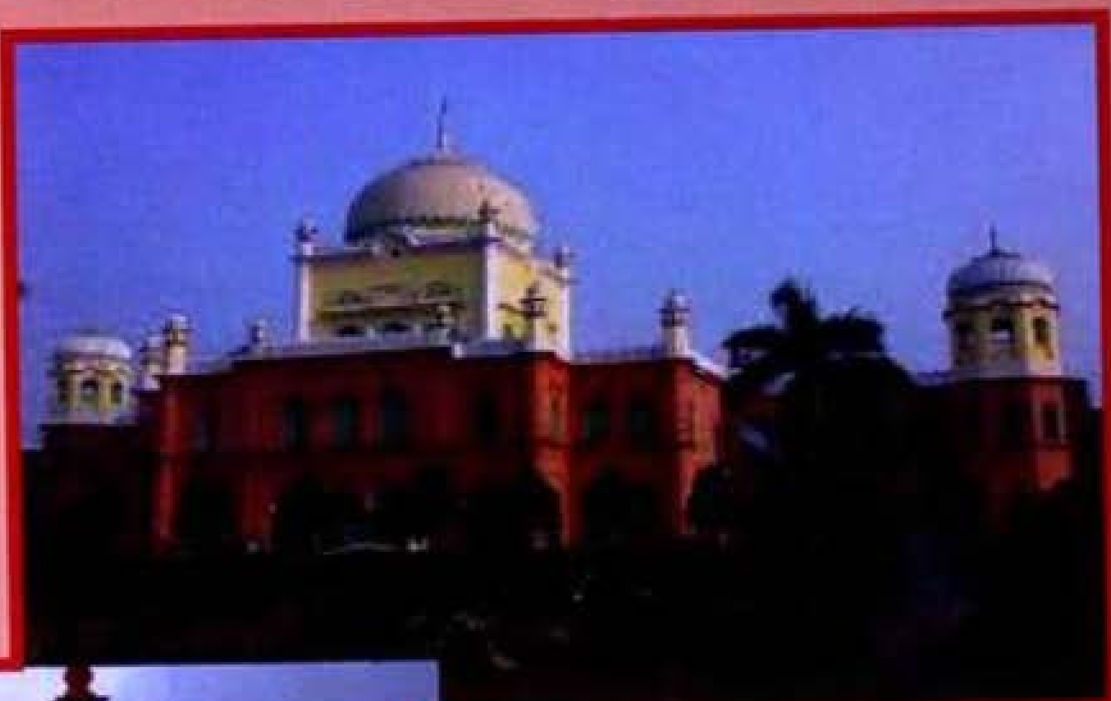
مرج البحرین

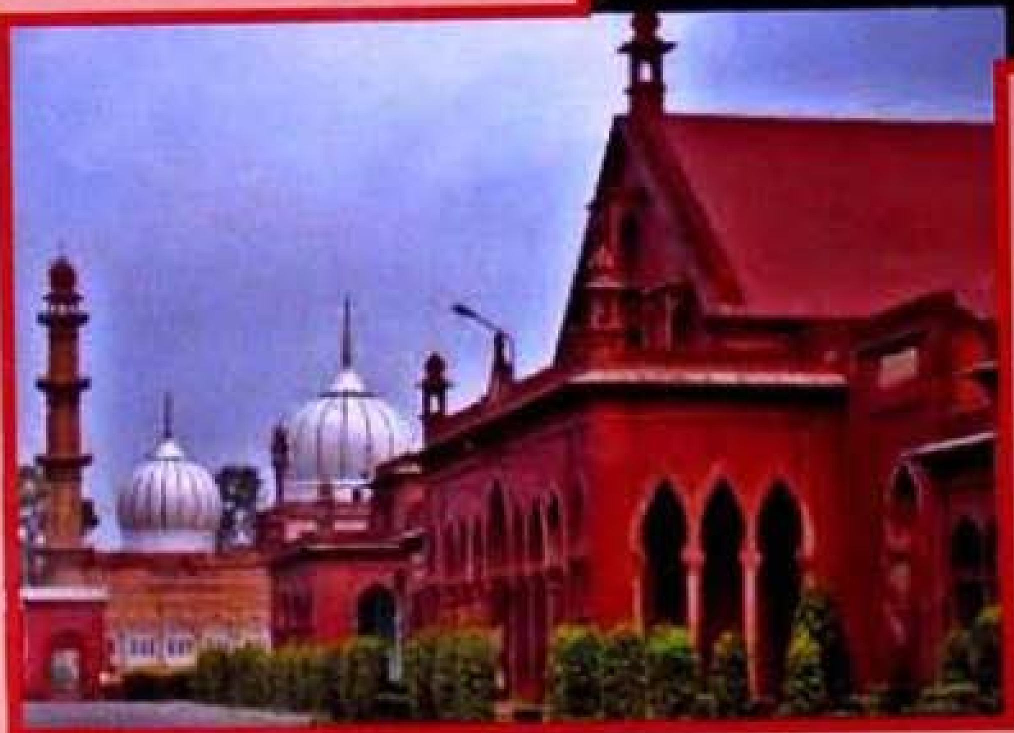
سوانح شیخ الاسلام

مولانا عبداللہ انصاریؒ



مؤلف

نورالحسن راشد کاندھلوی



دیوبند اور علی گڑھ کے دو تعلیمی دھاروں کا سنگم

سوانح شیخ الاسلام

مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی

مرج البحرین

دیوبند اور علی گڑھ کے دو تعلیمی دھاروں کا سنگم

نورالحسن راشد کاندھلوی

معاونین:

مہر الٰہی ندیم

مفتی مشتاق احمد تجاروی

نام کتاب : مرج البحرین: سوانح مولانا عبداللہ انصاری

مؤلف : نورالحسن راشد کاندھلوی

معاونین : مہر الٰہی ندیم، مولانا مشتاق تجاروی

قسم موضوع : سوانح - تاریخ - دیوبند - علی گڑھ

اشاعت اول : ۱۴۳۹ھ / ۲۰۱۸ء

ISBN 978-81-936231-6-9

قیمت : Rs.300

ملنے کے پتے

مکتبہ ملت. دیوبند ۲۴۷۵۵۴ (سہارنپور) یو. پی.	013-3622-5268
کتب خانہ عبدالسلام قاسمی. بھنڈی بازار ممبئی ۴۰۰۰۰۳.	093-2260-3836
فردوس کتاب گھر. بھنڈی بازار ممبئی ۴۰۰۰۰۳.	098-9218-4258
ہندستان پیپر امپوریم. ۱۲۷ مچھلی کمان. حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲.	092-4654-3507
دکن ٹریڈرس. ۲۳-۲-۳۷۸ مغل پورہ. حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲.	099-4886-9464
حنفی کتب خانہ. موتی. بنگلور (کرناٹک)	098-4561-5504
قاسمی کتب خانہ. ۶ لکی پلازا ایسمنٹ. ہائر سندرامن روڈ. تلک نگر. بنگلور.	098-8066-0766
مکتبہ الغزالی. مدینہ چوک. گاؤکدل. سری نگر. (جموں وکشمیر)	
محفوظ بک ڈپو. مالیگاؤں.	093-7363-9359

امریکہ میں: Iqra Book Center

2751 W. Devon. Chicago. Illinois. 60659. Tel: 773-274-2665

ناشر : **اقرا ایجوکیشن فاؤنڈیشن**

A-2 Firdaus. 24 Veer Savarkar Road. Mahim (W) Mumbai 400016. India

Tel: +91-22-2444-0494

Email: contact@iqraindia.org www.iqraindia.org

طباعت : پرنٹس کنگ، نئی دہلی

شیخ الاسلام

مولانا عبد اللہ انصاری انبہٹوی

۱۸۵۲-۱۹۲۵ء

حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی کے خلیفۂ راشد

تحریک دیوبند اور تحریک علی گڑھ کے درمیان رابطے کی پہلی کڑی

مدرسۃ العلوم مسلمانان ایم.اے.او.کالج علی گڑھ

کے سب سے پہلے ناظم دینیات

علی گڑھ کالج کے پہلے ڈین (عمید-Dean)

یکے از مفکرین و بانیانِ دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ

مدار المہام ریاست گوالیار مولانا خواجہ انصار علی کے صاحبزادے

شیخ طریقت مولانا شاہ احمد علی انبہٹوی کے پوتے

شیخ طریقت شاہ قطب علی گنگوہی کے پڑپوتے

استاذ الاساتذہ مولانا مملوک العلی نانوتوی کے نواسے

مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے تلمیذ اور بھانجے

بانی دار العلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی کے شاگرد اور داماد

☆

دیوبند اور علی گڑھ کے نام

مرحبا اے چارہ آساں می کشائی کار خلق
ناخنے بس تیز داری رخنۂ در کار ما

عرفی شیرازی

فہرست

☆ ☆ ☆

سپاس گزاری

شیخ الاسلام مولانا عبداللہ انصاری کی سوانح حیات پر تحقیق، حقائق کی تنقیح اور تدوین بڑا صبر آزما کام تھا. اس سلسلہ میں مفتی راشد کاندھلوی، محترم مہر الٰہی ندیم اور مفتی مشتاق احمد تجاروی کی تحقیقی اور تحریری مساعی خصوصی طور پر قابل ذکر و شکر ہیں. ان حضرات نے جس جانفشانی سے چار طرف بکھری ہوئی معلومات تک رسائی حاصل کی، ان کی علمی جانچ پڑتال کی، انہیں ترتیب دیا اور پھر یہ مبسوط سوانح مرتب کی وہ بلا شبہ ایک بڑا علمی کارنامہ ہے. اقرا انٹرنیشنل ایجوکیشنل فاؤنڈیشن ان کی اس بے مثل علمی خدمت کا تہہ دل سے اعتراف کرتا ہے. اس ذیل میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری، اور دارالعلوم دیوبند کے مرکزی کتب خانہ کا ذکر بھی ضروری ہے جن کے محافظ خانہ سے قدیم اہم دستاویزوں اور تاریخی معلومات تک رسائی ہوئی. ڈاکٹر عابداللہ غازی کے ذاتی کتب خانہ اور ذخیرۂ دستاویزات سے مولانا عبداللہ انصاری اور ان کے لواحقین اور اہل خاندان کے بارے میں وہ معلومات حاصل ہوئی جو کہیں اور سے ممکن نہیں تھیں. ان کی توجہات اور ذاتی نگرانی کے بغیر یہ کام اس پیانہ پر نہیں ہو سکتا تھا.

مولانا عبداللہ انصاری کی حیات و تاریخ پر مولانا ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی اور ڈاکٹر راحت ابرار کے مقالوں کے لئے ہدیہ سپاس ہے. مولانا عبداللہ انصاری کی اولاد میں جن لوگوں نے نجی زندگی اور سلسلۂ اجداد و اولاد و احفاد پر بیش قیمت معلومات مہیا کیں اور دیگر امور میں مساہمت کی ہے ان میں علاوہ دیگر کئی افراد کے خصوصی ذکر کے مستحق ہیں ڈاکٹر عابداللہ غازی (سکوکی/شکاگو، امریکہ)، محمد طارق غازی (وھٹبی/ٹورانٹو، کینڈا)، شہناز غازی (علی گڑھ)، سلمان غازی (ممبئی)، ارشد منصور غازی (نئی دہلی)، عمر منصور انصاری (جلال آباد، افغانستان)، ہاجرہ منصور انصاری (ہیوسٹن ٹیکساس، امریکہ)، رضی الدین اسد انصاری (ٹورانٹو، کینڈا).

عرض اول

الحمدللہ، ایک بہت پرانے اور بڑے ملی قرض کی ادائیگی کی توفیق اللہ تعالی نے ہمیں دی ہے.شیخ الاسلام حضرت مولانا ابو محمد عبداللہ الانصاری انبہٹوی کی سوانح حیات تو مدتوں پہلے مرتب اور شائع ہو جانی چاہیئے تھی لیکن تقدیر الٰہی میں ہر کام کا وقت مقرر ہے اور جو اچھا کام جس وقت پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے دراصل وہی زمانہ اس کار لائقہ کی تکمیل کا ہوتا ہے.مولانا عبداللہ انصاری کی سوانح ان کی رحلت کے تقریبا سو سال بعد شائع ہو رہی ہے تو قیاس ہے کہ ان معلومات سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت اس موجودہ زمانہ ہی کو ہے.

مولانا عبداللہ انصاری کے بارے میں عام خیال بس یہ ہے کہ انہوں نے دیو بند اور علی گڑھ تحریکوں کے مابین خلیج کو پر کیا تھا. یہ خاصی سادہ سی بات ہے.انہوں نے زیادہ بڑے کام کی داغ بیل ڈالی تھی.وہ بذات خود ایک تحریک تھے، ایک تجدیدی فکر کا منبع تھے، اگر چہ ان کے زمانۂ حیات میں اس تحریک کا برپا ہونا تو درکنار اس فکر کا فی الجملہ ادراک بھی پوری طرح نہیں تھا کیونکہ حالات دنیا ابھی کسی بہت بڑے علمی انقلاب کے مناسب نہیں تھے.آج امت کو اس فکر کا بہتر ادراک بھی ہے اور مولانا عبداللہ انصاری جس بنیادی عمرانی ضرورت پر امت مسلمہ کو علی العموم اور اسلامیان ہند کو بالخصوص متوجہ کر رہے تھے اس کا احساس عہد رفتہ کے مقابلہ میں عہد رواں میں زیادہ ہے.

موجودہ دور میں دیو بند اور علی گڑھ کا اختلاف باقی نہیں رہا.دیو بند کے مدرسوں میں انگریزی زبان اور کسی حد تک جدید مادی علوم کی تعلیم رائج ہو چکی ہے.علی گڑھ میں اداری سطح پر علوم اسلامی اور دینیات کی متوازی اہمیت ابھی تسلیم نہیں کی گئی لیکن وہاں انفرادی سطح پر امت کے ہمہ گیر مزاج میں اور معاشرتی اور عمرانی نظام میں بھاری تبدیلیوں کی ضرورت کا پورا احساس ہے؛ اگر چہ اس سمت میں کھلنے والے راستہ کا تعین ابھی مادیاتی مدراس میں ہوا

ہے نہ دینی درس گاہوں میں.

مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی کے افکار میں اس راستہ کے اشارے ملتے ہیں. ان کی زندگی اور ان کے افکار کا سنجیدہ مطالعہ اس باب میں رہنمائی کرے گا. زیر نظر سوانح اسی سلسلہ میں ایک ابتدائی کوشش ہے.

مولانا عبداللہ انصاری اسلام اور مسلمانوں کو قدیم و جدید کی اصطلاحوں میں محدود نہیں کرتے تھے اور نہ ہی اس طرح کی تقسیم کو ملت کے وحدانی وجود کے مناسب سمجھتے تھے. وہ اسلام اور امت مسلمہ دونوں کو متکامل اور مستقل اکائیوں کے طور پر دیکھتے تھے. اسلام درحقیقت انسانی تاریخ میں بجائے خود عہد جدید کے آغاز کا نقارہ تھا اور تکوینی دور سے گزرنے والی امت مسلمہ کو اس ربانی اعلان کی دلیل بنایا گیا تھا. جس لمحہ غار حرا میں جبل نور کی بلندی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے لفظ اقراء ادا ہوا تھا اس لمحہ دنیا ایک طویل عہد عتیق کے اندھکار اور فرسودگی سے باہر نکل کر مستقبل کی روشنی کے دائرہ میں آ گئی تھی. اس دن سیکڑوں صدیوں پر محیط بحران کا زمانہ لپیٹ دیا گیا تھا، نورانی انقلاب کی بساط عدل بچھادی گئی تھی، پرانے دساتیر اور پراچین اساطیر اور بے علمی کے پروردہ توہمات و خرافات پر خط تنسیخ کھینچ دیا گیا تھا اور عدل واعتدال کا تازہ کار نظام عالم انسانیت کو بخش دیا گیا تھا.

اٹھارھویں اور انیسویں صدیوں میں مسلم دنیا اس جادہ اعتدال سے ہٹ گئی تھی تو ان زمانوں کے اکابر مفکرین اسی راستہ پر امت کو دوبارہ گامزن کرنے پر مامور ہوئے تھے. مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی موتیوں کی اس تسبیح کا آخری دانہ تھے. اور یہ کتاب اس عبقری فکر کا پہلا بیانیہ ہے.

قدیم وجدید کی اہم کڑی

ڈاکٹر عابد اللہ غازی

مولانا عبداللہ انصاری (۱۸۵۲-۱۹۲۵ء) برصغیر کی قدیم وجدید تاریخ کی اہم کڑی تھے. قوم کی بے حسی یا خاندان کی غفلت کے سبب جدید تاریخ کا یہ نا قابل فراموش ورق نقش ونگار طاقِ نسیاں بنا رہا مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی اور مفتی محمد مشتاق تجاروی کی یہ تحقیقی سوانح اس تاریخی فروگذاشت کا بہت حد تک ازالہ کرتی ہے.

مولانا عبداللہ انصاری انبہٹہ، نانوتہ اور دیوبند کے علمی خاندانوں سے وابستہ تھے اور دارالعلوم دیوبند کے اولین ذہین ومتین طلباء وفارغین میں سے تھے. سرسید احمد خاں کی شعبۂ دینیات کی نظامت کے لئے انتخاب نے انہیں مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ کا اہم باب بنادیا مولانا انصاری کی کالج میں شرکت کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے خود سرسید کے افکار واعتقادات اور پس منظر کو مختصراً جاننے کی ضرورت ہے. سرسید احمد خاں کی ہمہ جہت شخصیت متنازعہ فیہ تھی اور اسے ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ ایک طرف تو وہ دردمند، سیدھے سچے مسلمان تھے دوسری طرف وہ جدید دور کے لئے اسلام کی ایسی تفہیم جدید کے حامی تھے جس کو اکثر علماء اور مسلمان تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے. مشکل یہ تھی کہ سرسید نہ صلح کل تھے، نہ مصلحت پرست، پھر انہیں اپنی فکر کی اصابت پر مکمل یقین تھا. اس لئے وہ ان متنازعہ افکار سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھے. دستبردار وہ ہو جو اپنے خیالات کو یا غلط سمجھے یا کسی لالچ میں آکر وقتی منفعت کا سودا کرے. سرسید اِن دونوں کرداروں سے برَی تھے.

سرسید کے ساتھ دوسرا اہم مسئلہ مغرب کی سائنٹفک اسپرٹ کی تفہیم اور اس کے لائے ہوئے سیاسی نظام اور اجتماعی اقدار سے مفاہمت کا تھا. مسلمان قوم انگریز کی غلامی کے خلاف نبرد آزما تھی لیکن سرسید کو انگریزوں کا حریف بننے کے بجائے حلیف بننے میں اپنی قوم

کی راہ نجات نظر آ رہی تھی. مسلمانوں میں وہ واحد شخصیت تھے جنہیں برطانوی استعمار میں علم وفراست اور تنظیم وتدبر کی ایسی روشنی نظر آئی جس سے مسلمانوں کے مستقبل کی راہ روشن ہوسکتی تھی. ان کی رائے میں استعمار کی طاقت سے ٹکر لے کر خود کو زخمی کیا جاسکتا تھا لیکن مغل دور حکومت کو واپس نہیں لایا جاسکتا تھا. سرسید مغرب کے نظام تعلیم اور نظم سلطنت دونوں کے اس قدر قائل تھے کہ وہ مسلمانوں کو مغرب کا سبق پڑھا کر اس کا حصہ بنانا چاہتے تھے.

سرسید کے سامنے تیسرا مسئلہ مسلمانوں کی تہذیب اخلاق کا تھا. مسلمانوں نے بہت سے رسم ورواج کو دینی اور اخلاقی مسلمات اور مذہبی اقدار کا درجہ دیدیا تھا. اکثر فرسودہ روایات نے عیب کو مسلمانوں کے سامنے صواب بنادیا تھا. سرسید نے رسالہ **تہذیب الاخلاق** کے ذریعہ مسلمانوں کے حال پر تنقید بھی کی، اور اصلاح کے لیے لائحۂ عمل بھی پیش کیا. سرسید کی تہذیبِ اخلاق کی تحریک نے بعض نفوس کو متاثر بھی کیا لیکن اس نے ان لوگوں کو بھی اپنے سے دور کرلیا جو سرسید کی تعلیمی کوششوں کے تو مخالف نہ تھے لیکن ان کی اصلاح معاشرہ کی کوششوں کو اصلاح مذہب سمجھ رہے تھے.

سرسید سے ان کے عقائد، افکار، اصلاح معاشرہ کی مساعی کے سبب بعض اوقات ان کے مداح بھی ان سے بھڑک جاتے. سرسید نے بڑی دانشمندی سے یہ فیصلہ کیا کہ ایک وقت میں اتنی بہت سی باتیں ساری قوم سے نہیں منواسکتے ہیں. انہوں نے فیصلہ کیا کہ مغربی طرز کا ادارہ قائم کرکے مغربی علوم کی تعلیم سب سے اہم مسئلہ ہے. اگر مسلمان جدید تعلیم کی طرف مائل ہوگئے تو شاید وہ ان کے دوسرے افکار کے بھی قائل ہوجائیں، اور اس طرح اب نہ سہی آگے چل کر ہی مسلمان ان کی روشنیِ فکر کو اپنا کر ایک ترقی پذیر قوم بن سکیں گے.

ہندستان کے مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اور علماء کا مخصوص حلقہ ان کے سارے ہی افکار کا مخالف تھا لیکن مسلمانوں میں اور علماء میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو مغربی علوم کی تحصیل کو دنیا کی منفعت کے لئے رہ گزر سمجھتے تھے اور آخرت کی نجات کے لئے پُر خطر نہ گردانتے تھے. سرسید کے اولین رفقاء میں شبلی اور حالی کی شخصیات معروف ہیں. علماء میں محمد

اسماعیل، تلمیذ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، ایڈیٹر **انسٹیوٹ گزٹ**، اتنے متعارف نہیں ہیں.

سرسید نے اکثر اپنے مذہبی اور تہذیبی خیالات سے یکسو ہو کر مغربی تعلیم کی ترویج اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے قیام کے لئے ایک ایسی جماعت پیدا کرلی جو ان کی شریک کار بن گئی. ان کے تعلیمی کام میں ۱۸۹۳ سے مولانا عبداللہ انصاری کی شرکت نے ان کے ہاتھ پاؤں مضبوط کر دیئے اور ایک ایسا رفیق کار مل گیا جس کے خاندان اور علمی حسب ونسب پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا. مقاصد کی راہ میں مولانا عبداللہ انصاری کا شریک کار بننا سرسید کی سب سے بڑی کامیابی تھی.

مولانا عبداللہ انصاری دارالعلوم دیوبند کے ہونہار عالم تھے. ان کا عقیدہ اور علمیت شبہات سے بالاتر تھی. وہ مصلحین و معلمین کی پہلی نسل کے معلم اول اور پروفیسر دلی کالج، مولانا مملوک علی نانوتوی (۱۲۰۴-۱۲۶۷ھ/ ۱۷۸۹-۱۸۵۱ء) کے نواسے تھے اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی ان کے ماموں اور استاد تھے. مولانا عبداللہ انصاریؒ کی علمیت اور قابلیت نے انہیں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا داماد بنا دیا تھا. مولانا نانوتویؒ مولانا عبد اللہ انصاری کے استاد پہلے سے تھے ہی. اب اس نئے رشتہ نے انہیں اقرب بنا دیا.

سہارنپور کے مردم خیز قصبہ انبیہٹہ پیرزادگان کے جس علمی خاندان سے مولانا عبد اللہ انصاریؒ کا تعلق تھا اس میں کئی نسلوں سے علم و عمل، تصوف و روحانیت کا چرچا تھا. وہ چشتی صابری سلسلہ کے بزرگ سید شاہ ابوالمعالیؒ (متوفی ۱۱۱۶ھ) کی دختری اولاد میں تھے اور پیرزادہ کہلاتے تھے. ان کے دو علاتی بھائی مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ، **بذل المجھود فی شرح ابی دائود** کے مصنف، اور مولانا صدیق احمد مفتی اعظم ریاست مالیر کوٹلہ اپنے دور کی معتبر اور غیر متنازعہ شخصیات تھیں. مولانا عبداللہ انصاری عالم دین کے ساتھ صوفی با تمکین بھی تھے. حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ سے بیعت تھے اور دستارِ خلافت حاصل تھی. خود تصوف کے چاروں معروف سلسلوں میں بیعت فرماتے تھے. ان کی مثنوی **بارہ ماسہ ربانی** خود ان کے روحانی سفر کی داستان معلوم ہوتی ہے جسے انہوں نے

''برہ'' کے صنف سخن میں تصنیف فرمایا ہے.

خانوادۂ انبیہٹہ اور مدرسۂ دیوبند کے اس درِ بے بہا کے حصول پر سرسید کو جس قدر ناز ہو کم تھا. انہوں نے اس جذبۂ تشکر کے اظہار میں کسی تکلف سے کام نہیں لیا. مولانا عبداللہ انصاریؒ کی علی گڑھ میں آمد سرسید کی مصلحت پسندی نہیں تھی بلکہ دردمندی تھی. سرسید ان کی نسبتوں اور علم دونوں کے قائل اور ان کی علمی فضیلت کے قدر دان تھے. اپنی زندگی میں انھوں نے مولانا عبداللہ انصاری کی رائے اور مشوروں کو غیر معمولی اہمیت دی. وہ کہتے تھے کہ مدرسے میں ان کی آمد کو وہ باعث خیر و برکت سمجھتے ہیں. ان جذبات کی تصدیق سرسید کے پورے طرز عمل سے ہوتی ہے. مولانا عبداللہ انصاریؒ کو سرسیدؒ نے شبلی نعمانیؒ جیسے عالم اور مؤرخ کی موجودگی میں نظامت شعبۂ دینیات پر فائز کیا اور فل پروفیسر کا مقام دیا جس پر وہ تاحیات فائز رہے. سرسید کی نگاہ میں مولانا کی تدریسی ذمہ داری سے زیادہ اہم ان کا تربیتی کردار تھا. سرسید کا انتقال ۱۸۹۸ء میں ہوا اور سرسید کی وصیت کے مطابق ان کی نماز جنازہ مولانا عبداللہ انصاریؒ نے پڑھائی.

مولانا عبداللہ انصاری کو کالج میں لانے میں تو سرسید ضرور کامیاب ہو گئے تھے مگر مولانا انصاری کے لیے یہ فیصلہ آسان نہیں تھا. سرسید کی رفاقت ان کے اپنے مکتب فکر میں ان کے عقائد کو مشتبہ اور اعمال کو داغدار کر رہی تھی. ان کے اکابر مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ دونوں نے بوجوہ سرسید کی دعوت کو رد کر دیا تھا. سرسید نے نومبر ۱۸۷۴ء میں (انتظام وسلسلہ تعلیم مجوزہ مدرسۃ العلوم مسلمانان کا) ایک اطلاع نامہ مسلمان علماء سے صلاح و مشورہ کی غرض سے جاری کیا تھا جس کا مقصد کمیٹی کے مدبران تعلیم مذہب اہل سنت والجماعت کا تقرر تھا. اس طرح کی کمیٹی مذہب شیعہ کے لئے بھی غالباً تجویز ہوئی تھی (**انسٹیوٹ گزٹ** صفحہ ۵۷۸/۱۸۷۴ء: دیوبند اور عبداللہ انصاری منصراہ **تہذیب الاخلاق**). مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اپنے اور سرسید کے ہم جماعت قاضی محمد عارف انبہٹوی کے ذریعہ سرسید کی دعوت کا جواب بھجوا دیا تھا: ''ایلوے میں کتنا بھی شہد

ڈالو اس کی کڑواہٹ نہ جائے گی"۔ مولانا محمد یعقوب نے مولانا نانوتوی کی ایماء پر تحریری جواب بھیجا تھا جس میں سرسید کے کالج کے ساتھ ان علماء کا عدم تعاون کا سبب واضح تھا اور راہ تعاون مسدود تھی. مولانا نے تحریر فرمایا:

احقر کا نام اور مولوی محمد قاسم صاحب قبلہ کا نام اس فہرست میں نظر آیا کہ جس کو اہل شوریٰ نے تجویز فرمایا. ہر چند تائید مذہب اہل تشیع اس مدرسہ میں ایک جداگانہ چیز ہے مگر ہم لوگوں کے دل میں یہ امر بہت خلجان کرتا ہے کہ ایسے مجمع میں ایک شعبہ ہو، تائید ایسے لوگوں کی ہے جن کا فرض مذہبی ہمارے بزرگوں کو برا کہنا. ایسے مجمع کے مریدوں میں شامل ہو کر خدا اور رسول کو کیوں کر منہ دکھلائیں گے.

بالجملہ اب ہم خاک نشینوں کو اپنے گوشہ عنایت [میں] ایسا منسی اور محو فرمادیں کہ پھر بھولے سے بھی یاد نہ کریں. (حوالہ بالا)

مولانا عبداللہ انصاری کے بزرگوں کے انکار کے بعد ان کے لئے کالج کی دعوت قبول کرنے کا کوئی جواز نہ تھا. ان دو بزرگوں (جو اساتذہ بھی تھے اور اقارب بھی) کے واضح انکار پر مستزاد وہ تاثر تھا جس کا اظہار حاجی امداداللہ مکی نے فرمایا تھا. مولانا انصاری کے فیصلہ سے ان کے اختلاف کے دو اسباب تھے. ایک تو کالج کا نیچری ماحول خطرۂ ایمان تھا. دوسرے وہاں کی دنیاداری اور مادی آسودگی میں خدشۂ ایمان بھی تھا. حاجی امداداللہ نے مولانا رشید احمد گنگوہی کو جو خط تحریر فرمایا تھا اس میں انھوں نے تفصیل سے اپنے سارے اشکالات تحریر کر دیئے تھے:

مولوی عبداللہ صاحب کے حالات سن کر تعجب ہوا اور افسوس کہ باوجود دعویٰ صوفیت اور بزرگ زادگی کے اس مدرسہ کے متعلق ہو گئے جس کا نام علمائے آخرت کے نزدیک دارالالحاد ہے اور جو مذہب اور مشرب کے خلاف ہے اور یہ جو آپ سے کسی نے کہا ہے کہ وہ فقیر کی اجازت سے مدرسہ نیچریہ میں ملازم ہوئے ہیں سبحانك هذا بهتان عظيم .

آپ کو خوب معلوم ہے کہ فقیر کا مسلک ہر امر میں سواد اعظم کا اتباع ہی ہمیشہ سے ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال رہا تو یہی تادم مرگ رہے گا.

بریں زیستم ہم بریں بگذرم.

وجہ اس کی یہ ہے کہ علمائے آخرت اس مدرسہ کے متعلقین کو دیندار نہیں سمجھتے بلکہ نصوص الدین جانتے ہیں خواہ وہ علماء ہوں یا بزرگ زادے، کیونکہ آخرت میں نہ تو مجرد علم کام آوے گا نہ بزرگ زادگی. خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اپنی اولاد کے بارے میں وارد ہیں جس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اولاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں وہ بھی داخل ہے جس کا عمل اچھا ہے پھر متعلقین مدرسہ علی گڑھ کس شمار میں ہوئے.

فقیر کے نزدیک عالم اس کو کہتے ہیں کہ اپنی ضرورت دنیا کے وقت جب دنیا کا دین سے مقابلہ ہو تو دین کو اختیار کرے اور دنیا کو منہ نہ لگائے کیونکہ امتحان کا وقت یہی معلوم ہوتا ہے کہ "نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد.

لیکن اتنے واضح حکم کے باوجود مولانا عبداللہ انصاری نے سرسید کی دعوت کو قبول کیا. حاجی صاحبؒ پوری جماعت کے پیر و مرشد تھے. مولانا انصاری نہ صرف حاجی صاحب سے بیعت تھے بلکہ ان کے خلفاء میں تھے. اہل طریقت میں پیر و مرشد کی مرضی کے خلاف عمل ناممکنات میں سے ہوتا ہے بقول حافظ:

بے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ ورسم منزل ہا
اپنی جانماز کو شراب سے رنگیں کرلو اگر پیرِ مغاں فرمائے
کیونکہ سالکِ طریقت منزل کے راہ ورسم سے بے خبر نہیں ہوتا.

مولانا انصاری نے اپنے پیر و مرشد کی بات کو نظر انداز کرنے اور علی گڑھ میں دعوت و تبلیغ اور حکمت و موعظت کے روشن امکانات کو دیکھ کر بیعت و سلوک کے آداب کے خلاف فیصلہ کیا تھا لیکن نہ مولانا انصاری نے بیعت ختم کی اور نہ حاجی امداد اللہ نے انھیں اپنے حلقۂ خلافت سے خارج کیا. البتہ حاجی صاحبؒ اور بزرگان دیوبند سے ان کے تعلقات یقیناً متاثر ہوئے ہوں گے.

یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ مولانا عبداللہ انصاری نے وہ کیا امکانات اس کالج میں

دیکھے تھے جس کے سبب انہوں نے اپنے بزرگوں، استادوں اور مرشدوں کے اُسوہ اور نصیحت سے روگردانی کی؟

مولانا انصاری کی خدمات کی یہ داستان اسی سوال کا جواب ہے. مختصراً یہ کہ:

۱- سرسید کے مشن میں مولانا عبداللہ انصاری کی شرکت سے اس مشن کو غیر معمولی تعاون حاصل ہوا. وہ لوگ جواب تک متامل تھے شریکِ کار ہو گئے جو شریک کار تھے وہ رفیق سفر ہو گئے.

۲- مولانا انصاری نے شعبۂ دینیات قائم کر کے اس کا نصاب مدارس کی مروجہ اور مستند روایات کے مطابق بنا کر لوگوں کے ان شبہات کو دور کر دیا جو انھیں سرسید کے عقائد کی ترویج کے سلسلہ میں لاحق تھے.

۳- مولانا انصاری کی تدریس و تربیت اور موجودگی سے کالج میں ایسی دینی فضا قائم ہوئی جس سے عقیدہ اور عبادات اور شعائر کا تحفظ ہوا.

۴- مولانا انصاری کے علمی مقام سے ملک کے مختلف ادارے مستفید ہوئے. خاص طور پر ندوۃ العلماء کی تاسیس اور ترقی میں مولانا نے خصوصی رہنمائی فرمائی.

۵- مولانا انصاری کا وجود علماء اور جدید ذہن کے درمیان ایک رابطہ بن گیا جس نے مستقبل میں تعاون کی راہیں ہموار کیں.

٦- مولانا انصاری کے ابتدائی کام نے یونیورسٹی میں سنی اور شیعہ دینیات کی فیکلٹی، اسلامک اسٹڈیز، عربی، فارسی، اردو وغیرہ کے لئے راہیں ہموار کیں.

سرسید کی غیر معمولی قدردانی، مولانا انصاری کی دینی تعلیمی خدمات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان سے جو امیدیں سرسید نے قائم کی تھیں وہ پوری ہوئیں اور مرتے دم تک سرسید کی عقیدت واحترام میں فرق نہیں آیا. اور آخرت کے سفر کی امامت کے لئے انھوں نے مولانا انصاری کو منتخب فرمایا. تعظیم وتکریم کی. یہ صورت حال مولانا انصاری کی سرسید کی رحلت کے بعد تا وفات (۱۹۲۵ء) جاری رہی. لیکن جب ۱۹۰۴ء میں دینیات کمیٹی نے مولانا کو

علیحدہ کرنے کی بات چھیڑی تو ہر حلقہ سے اس کے خلاف ردعمل ہوااور مولانا انصاری کی پوزیشن برقرار رہی. ہر چند کہ دینیات کمیٹی کی سربراہی نواب حبیب الرحمٰن خان شروانی فرمارہے تھے، لیکن میری تعلیم کے دوران مجھ سے نواب عبیدالرحمٰن خاں شروانی کے خصوصی تعلق میں ان کے مولانا عبداللہ انصاری سے شاگردی کے رشتے کو بہت دخل تھا. وہ ہر ملاقات میں مولانا انصاری کا ذکر پورے ادب واحترام سے فرماتے اوراس رشتے کی نسبت سے مجھ سے ملاقات کے وقت، میرے احتجاج کے باوجود کھڑے ہوجاتے.

علی گڑھ میں مولانا انصاری کی تدریسی خدمات کے ساتھ ہندستان کے مدارس کے نصابی اور انتظامی امور پران کی آراءاور ندوۃ العلماء کی ترویج وترقی میں ان کا حصہ غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے. انہوں نے جن مسائل پر گفتگو فرمائی اور توجہ دلائی وہ آج بھی اسی طرح فکراور توجہ کے محتاج ہیں.

دارالعلوم دیوبند (۱۸۶۶ء) اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ (۱۸۷۵ء) کے قیام کو ڈیڑھ سو سال کا عرصہ ہوگیا ہے. ۱۹۴۷ء کے انقلاب نے ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات اور تجزیئے کو تاریخ کا باب بنادیا. تقسیم ہند نے پہلے دو اور پھر ۱۹۷۱ء میں تین ملکوں میں برصغیر کے مسلمانوں کو تقسیم کردیا. ہندستان کا مسلمان ۱۹۴۷ء کے بعد سے جن حالات کا شکار ہے اس کا بہت تھوڑا سا ہی تعلق پاکستان یا بنگلہ دیش سے ہے. اسی طرح جنوبی ایشیا کے دونوں مسلم ملکوں کے مسائل کا تعلق بھی ایک دوسرے سے یا ہندستان کے مسلمانوں سے نہیں ہے. دیوبند اور علی گڑھ کی مخاصمت کب کی ختم ہوچکی لیکن دونوں جگہ دین ودنیا کی تقسیم کا راب بھی باقی ہے. نئے حالات میں نئے ارادوں، نئے تجربوں اور پروگراموں کی ضرورت ہے.

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ فاضل علماء کے لئے خصوصی نظام کے تحت عربی، اسلامیات، دینیات وغیرہ کے شعبوں میں داخلے کی سہولت اور اسناد عطا کردیتی ہے جس سے انھیں ملازمتوں کی دنیا میں اعتماد حاصل ہوتا ہے.

مدارس اسلامیہ کے نصاب میں تبدیلی کی گفتگو سو سال سے چل رہی ہے اور ابھی

یہ گفتگو جاری ہے. مدارس اسلامیہ کے تعلیمی نصاب کی سیکولر تعلیمی اداروں کے انداز پر تشکیل جدید کرنے سے علماء اور ملت کے نقصان کی کچھ تلافی ہو سکتی ہے. لیکن ان مدارس کے اپنی روایتی روش پر بغیر تبدیلی کے برقرار رہنے سے علماء، ملک اور ملت تینوں کا خسارہ ہے.

سرسید، مولانا نانوتویؒ اور مولانا عبداللہ انصاریؒ کی خدمات کا اعتراف آج اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ مدارس اسلامیہ جدید علوم کے کچھ متعلقہ مضامین کو داخل نصاب کر کے اپنے پیغام کو وسعت دیں اور طلبہ کو نئے مواقع عطا کریں. مسلم سیکولر تعلیمی ادارے اپنے پروگرام میں اسلامیات کی تعلیم کو لازمی قرار دیں یا مسلمان اسلامیات کو اضافی مضمون کی حیثیت سے شام کی یا ہفتہ واری کلاسوں میں اس طرح پڑھائیں کہ ان کی نسلیں سیکولرزم اور ہندوتوا کے سیلاب میں اپنی دینی میراث سے محروم نہ ہو جائیں اور وہ ہندستان کی تعمیر و ترقی میں بامعنی شرکت کر کے شریک رزم و بزم ہو سکیں. سیکولر ہندستان کے قوانین دینی اور تہذیبی ورثہ کی حفاظت اور ترویج کی اجازت ہی نہیں دیتے بلکہ ان کے تحفظ اور ترقی میں اکثر اوقات ہماری مساعدت بھی کرتے ہیں. ہمیں اپنے اداروں اور اپنے ملک کے قوانین اور وسائل سے پورا پورا مستفیض ہونا چاہئے.

مولانا عبداللہ انصاریؒ کی یہ سوانح ہر چند کہ دیر سے شائع ہو رہی ہے لیکن بعد از وقت نہیں. اس کی تاریخی، مذہبی، تہذیبی اہمیت ہے اور عبداللہ انصاری کی ہر دور کو ضرورت ہے جو اپنے بزرگوں کے احترام کے باوجود جدید فکر کے دروازوں کو مستقبل کی نسلوں پر کھولنے میں قدیم و جدید، مذہب اور سیکولرزم، شوریٰ اور جمہوریت، روایت اور جدت میں رابطہ بن سکیں.

☆ چیرمین اقراء انٹرنیشنل ایجوکیشنل فاؤنڈیشن، شکاگو، امریکہ.

ایک عہد کا تعارف

مولانا محمد سعود عالم قاسمی

مولانا عبداللہ انصاری (۱۸۵۲-۱۹۲۵ء) کی حیات و خدمات پر مشتمل اس کتاب کا میں نے دلچسپی سے مطالعہ اور اس سے استفادہ کیا ہے. مرتبین نے عرق ریزی اور دیدہ وری کے ساتھ ایک صدی پیشتر کے حالات اور واقعات کو جمع کر کے ایک دستاویز مرتب کی ہے. جس سے نہ صرف مولانا عبداللہ انصاریؒ کے ذاتی کوائف اجاگر ہوئے ہیں بلکہ برصغیر کی دو عظیم عصری اور دینی درسگاہوں یعنی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور دارالعلوم دیوبند کے مابین ربط و تعلق کی نوعیت کی بھی گرہ کشائی ہوتی ہے. اسی کے ساتھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی تاریخ کا ایک ایسا باب روشن ہوتا ہے. جس میں دینی اور تہذیبی تعلیم و تنظیم کی بہت سی نادر معلومات پنہاں ہیں. گویا یہ کتاب صرف ایک شخصیت کی سوانح نہیں بلکہ ایک عہد کی علمی اور دینی سرگرمیوں کی تاریخ ہے.

مولانا عبداللہ انصاریؒ دارالعلوم دیوبند کے طلبہ کی پہلی جماعت کے فاضل تھے، بانی دارالعلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے داماد تھے، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے مرید تھے اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کی تاسیس کی تحریک سے وابستہ تھے. سر سید احمد خاںؒ کی نگاہ انتخاب نے ایم. اے. او. کالج کے مذہبی امور کی نگرانی اور سربراہی کے لئے ان کو پہلا ناظم دینیات مقرر کیا تھا اور اس اعتماد کے ساتھ کہ:

میں ان کا مدرسہ میں تشریف لانا اور یہاں رہنا باعث خیر و برکت سمجھتا ہوں.

مولوی اسماعیل پانی پتی. مکتوبات سر سید ص ۲۶۷.

علامہ شبلی نعمانیؒ کے مقابلے میں مولانا انصاری کی تنخواہ بھی دوگنی مقرر کی گئی تھی.

سر سیدؒ کی وصیت کے مطابق ان کی نماز جنازہ بھی مولانا عبداللہ انصاریؒ نے پڑھائی تھی.

14058

انہوں نے ۱۸۹۳ء سے ۱۹۲۵ء تک ایک طویل عرصہ یونیورسٹی کی خدمت اور آبیاری میں صرف کیا تھا. کالج کے مذہبی نظام کو پختہ کرنے اور اس کو شکل دینے میں مولانا انصاری کا نمایاں کردار رہا ہے، بلکہ مسلمانان ہند میں کالج کی ساکھ اور اعتماد قائم کرنے میں انہوں نے خاموش اور مثبت کردار ادا کیا تھا. سید افتخار عالم مارہروی نے مولانا عبداللہ انصاری کے درس اور وعظ کا مشاہدہ ان لفظوں میں قلم بند کیا ہے:

> ہر جمعہ کے عام وعظ و پند کے علاوہ جناب مولانا صاحب طلباء مدرسۃ العلوم کو اسٹریچی ہال کے عظیم الشان کمرہ میں روزانہ بلا ناغہ مدرسہ کے اوقات سے قبل کلام مجید کی تفسیر پڑھاتے ہیں جہاں تمام اسکول اور کالج کے طلبہ پیشتر جمع رہتے ہیں. ان مسلمان طالب علموں میں وہ دونوں مشہور فرقے شامل رہتے ہیں جو سنی اور شیعہ کے نام سے معروف ہیں.

افتخار عالم مارہروی. **محمڈن کالج ہسٹری** ص ۱۲۵ مطبوعہ آگرہ ۱۹۰۱ء

یہ کتاب ان خدمات کا مفصل تعارف کراتی ہے. مصنف نے سر سید کے بعد مولانا انصاریؒ کے خلاف ہونے والی منفی کوششوں کا بھی تذکرہ کیا ہے. عجیب بات ہے کہ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے بھی **حیات شبلی** میں علامہ شبلی کے علی گڑھ سے بددل ہونے کا تذکرہ کیا ہے. مگر علمی اداروں میں اختلاف عموماً رہتا ہے. اس سے فرار نہیں. اگرچہ اختلاف کی نوعیت اور شدت میں فرق آتا رہتا ہے، کوئی خوش دلی سے جھیلتا ہے اور کوئی بددلی سے ترک تعلق کر لیتا ہے.

مصنف نے یونیورسٹی کے تذکرہ نگاروں، مورخوں اور بہی خواہوں سے شکوہ کیا ہے کہ انھوں نے سر سید کے یہاں علماء کی قدر و منزلت کو نظر انداز کر دیا ہے، بلکہ لکھا ہے کہ:

> سر سید کالج میں دینی علوم اور ان کی تعلیم اور اس کے ساتھ ہی دینی اخلاق و مزاج اور دینی تربیت کو کس قدر ضروری سمجھتے تھے اور اس کا سر سید کے مکتوبات، مضامین، خطبات اور کالج کی رپورٹوں اور فائلوں میں جو تذکرہ ہے اس کو قطعاً نظر انداز کر دیا گیا ہے. جس کا ایک بڑا اثر اور نتیجہ یہ ہے کہ کالج کی دینی خدمات اس سے علماء کے

تعلق ،کالج میں علماء کے متواتر تقرر، یہاں ان کے اثرات، ان کی خدمات و تصانیف،شعبہ دینیات کی کالج سے گہری وابستگی اور شعبہ دینیات کے تمام سربراہوں، ذمہ داروں، علماءاور لائق فرزندوں کو ہمیشہ جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا اور یہ کوشش کی گئی کہ کالج کا امیج سیکولر نظر آئے.

جنوری ۲۰۰۶ء میں الہ آباد ہائی کورٹ کی ڈویژن بینچ نے جس طرح مسلم یونیورسٹی کو اقلیتی ادارہ ماننے سے انکار کیا ہے اوراس کے اس تاریخی کردار پر سوالیہ نشان لگادیا ہے جس کی آبیاری مسلمانوں کے خون جگر سے ہوئی تھی اس کے پیش نظر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس ستم ظریفی کا موقع فراہم کرنے میں یونیورسٹی برادری سے بھی کہیں نہ کہیں چوک ہوئی ہے جس کے ایک پہلو کی طرف مصنف نے توجہ دلائی ہے. راقم کا احساس ہے یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کے تحفظ کے ساتھ اس کے دینی اور اسلامی کردار پر بھی یکساں توجہ دینے کی ضرورت ہے.

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں دینیات کی تعلیم کا جو خواب سرسید نے دیکھا تھا اور جس کی تعبیر ڈھونڈنے کی مولانا انصاری جیسے عالموں نے کوشش کی تھی اس کے مکمل تعبیر آشنا نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یونیورسٹی کی مرکزی توجہ جدید مادی علوم بلکہ پیشہ ورانہ علوم پر مرتکز رہی، دینیات کی تعلیم و تنظیم پر توجہ ضمنی رہی اور شعبہ دینیات کو یونیورسٹی کے تتمہ اور ضمیمہ کی حیثیت حاصل رہی. اگر چہ شعبہ دینیات کے ذمہ داروں نے یونیورسٹی کے دینی اور تہذیبی ماحول کو بہتر بنانے میں کوششیں کیں مگر سرسید کے خواب کی مکمل تعبیر ابھی تک باقی ہے. اس میں دینیات کے اساتذہ اور یونیورسٹی انتظامیہ دونوں کے لئے لمحۂ فکریہ ہے.

دارالعلوم دیوبند کے ایک دوسرے فاضل مولانا سعید احمد اکبرآبادی ۱۹۵۹ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل کا عہدہ چھوڑ کر علی گڑھ آگئے اور شعبۂ دینیات کے صدر بنائے گئے. اس موقع پر کنیڈین مستشرق ولفرڈ کینٹول اسمتھ (Wilfred Cantwell Smith) نے مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے نام خط میں شعبہ دینیات کے بارے میں اس تاثر کا اظہار کیا تھا:

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا شعبۂ دینیات جس کسمپرسی کے عالم میں تھا اسے دیکھ کر سخت افسوس ہوتا تھا اور مسلمانوں کی بے حسی پر ماتم کرنے کو جی چاہتا تھا، چنانچہ ۱۹۵۶ء میں علی گڑھ گیا اور یونیورسٹی میں ایک تقریر کرنے کا موقع ملا تو میں نے یونی ورسٹی کے ذمہ داروں کو اس طرف توجہ دلائی اور کہا کہ یورپ اور امریکہ میں اہلامی دینیات (کذا) پر جو کام ہو رہا ہے اور وہاں اس مضمون کو جو اہمیت دی جاتی ہے افسوس ہے کہ اس یونیورسٹی میں جو مسلم یونیورسٹی کہلاتی ہے یہ مضمون اس قدر بے وقعت ہے.

مولانا سعید احمد اکبرآبادی. **احوال و آثار** ص ۵۴.

اپنے مذہب کی تعلیم کے لحاظ سے یورپ اور امریکہ تو دور کی بات ہے خود بنارس ہندو یونیورسٹی میں ہندو مذہب کی تعلیم کے لئے جو سہولتیں فراہم کی گئی ہیں وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی فیکلٹی دینیات میں نہیں ہیں.

مسلم یونیورسٹی میں دینیات آج بھی گریجویشن تک لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی ہے مگر انجینئرنگ، میڈیکل، اور پالی ٹکنک میں براہ راست داخلہ لینے والے طلبہ نہ جانے کیوں اس تعلیم سے مستثنٰی بلکہ محروم رکھے گئے ہیں. اس لازمی تعلیم کا ایک کمزور پہلو یہ ہے کہ اس کے امتحان کے نمبر شمار نہیں کئے جاتے اس لئے کلاس روم میں طلبہ کی حاضری متاثر ہوتی ہے. راقم نے بھی ارباب انتظام کو بارہا اس کی طرف توجہ دلائی ہے.

ان سب کے باوجود جب ہم ایک صدی پیشتر کے مولانا عبداللہ انصاریؒ کے عہد کا موازنہ آج کے عہد سے کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ جو پودسرسید نے لگائی تھی اور مولانا انصاریؒ نے جس کی آبیاری کی تھی وہ سایہ دار درخت بن چکا ہے. مولانا عبداللہ انصاری کے عہد میں دینیات کی تعلیم اور دینی امور کی نگرانی کا ایک ہی یونٹ تھا. آج یہ دونوں یونیورسٹی کے دو مستقل اور اہم محکمے ہیں:

ایک شعبہ دینیات جو لازمی دینی تعلیم کے علاوہ گریجویشن، پوسٹ گریجویشن اور پی ایچ ڈی کے کورسز میں داخلہ دیتا ہے، سرٹیفکیٹ اور ڈپلوما اِن قرأت کی تعلیم دیتا ہے، یعنی

دینی تعلیم وتحقیق کی سرگرمیوں کا مرکز ہے.اس کی سربراہی چیرمین شعبہ دینیات کرتا ہے.

دوسری نظامت دینیات جو یونیورسٹی کے احاطہ اور ہاسٹلوں میں ۲۶ مساجد میں نماز باجماعت کا اہتمام کرتی ہے، یونیورسٹی قبرستان کی نگرانی کرتی ہے، مذہبی تقاریب اور مذہبی امور کی نگرانی کرتی ہے.اس کی سربراہی ناظم دینیات کرتا ہے.

مولانا عبداللہ انصاری نے بحیثیت ناظم دینیات جس مذہبی اصلاح وتربیت کی روایت قائم کی تھی ان کے جانشینوں نے اس کو وسعت دی اور آگے بڑھایا.ان میں مولانا ابوبکر شیث جونپوری، مولانا وصی علی ملیح آبادی، مولانا محمد شفیع انصاری فرنگی محلی، مولانا مفتی محمد حفیظ اللہ اور مولانا محمد تقی امینی جیسے علماء شامل ہیں .اور ۱۹۸۷ء سے (۲۰۰۶ء تک) اس روایت کا امین یہ خاکسار ہے.

شعبۂ دینیات پر مولانا عبداللہ انصاریؒ کا یہ قرض تھا کہ ان کی حیات وخدمات پر کوئی دستاویز مرتب کر کے شائع کرتا مگر یہ سعادت اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر عابداللہ غازی کو بخشی کہ انھوں نے خوش اسلوبی اور سلیقے سے مولانا عبداللہ انصاری کے حالات زندگی مرتب کروائے. مصنفین اور ناشرین سب یونیورسٹی برادری کے شکریہ اور دعاؤں کے مستحق ہیں.

نام نیکو رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نام نیکت برقرار

۲۱ جنوری ۲۰۰۶ء

☆ سابق ڈین اور ناظم دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ.

تین بزرگ، مقصد ایک

ڈاکٹر راحت ابرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی سرسیّد احمد خان اور دارالعلوم دیوبند کے معمارِ اعظم مولانا محمد قاسم نانوتوی کو بعض انگریزی اسکالرز نے ایک دوسرے کا مخالف قرار دیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ اِن دونوں بزرگوں نے مغربی تہذیب و تمدن کے بڑھتے ہوئے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لئے تعلیم کے میدان کو منتخب کیا۔ دونوں ہی دو بڑے اداروں کے محرک بنے، دونوں ہی نے دینی تعلیم کی اشاعت کو ضروری اور مقدم سمجھا۔ اِن اداروں کے درمیان باہمی ربط و تعارف کی فضا پیدا کرنے کے لئے سرسید احمد خان نے خاص کوششیں کیں مگر سرسید کے بعض مذہبی عقائد کی بنا پر مولانا قاسم نانوتوی نے سرسید کی پیش کش کو تو قبول نہیں کیا لیکن دونوں بزرگوں میں ذہنی رابطہ بہر حال قائم رہا۔

سرسید احمد خان نے ۱۸۳۶ء میں جب سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی تو اس سوسائٹی میں اپنے وقت کے ممتاز ہندو مسلم اور انگریزی حکام کے ساتھ ساتھ علماء کو بھی شریک کیا۔ سائنٹیفک سوسائٹی کے جلسوں میں علماء اور اکابر بھی شرکت کرتے تھے۔

سرسید احمد خان نے ''کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان'' میں مسلمانوں کے طریقہ تعلیم پر تمہیدی گفتگو کی تھی۔ جس کی رپورٹ **تہذیب الاخلاق** میں درج ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ایک جماعت ایسی ہے کہ علوم و فنون کو حاصل کرنا اور ان میں واقفیت کامل حاصل کرنا پسند کرتی ہے۔ ایک جماعت ایسی ہے کہ اس کو ان تمام چیزوں سے چنداں تعلق نہیں ہے بلکہ وہ بہ لحاظ اپنے معیار کے علوم دین میں دستگاہ کامل حاصل کرنا اور اس میں زندگی بسر کرنا چاہتی ہے۔ اور ایک جماعت عوام الناس کی ہے جن کے لئے کسی

قدر عام تعلیم کا ہونا ضروری ہے. بایں ہمہ ایک کو اپنی اولاد کی نسبت یہ خواہش ہے کہ اس کے عقائد مذہبی درست ہوں اور وہ ادائے فرائض مذہبی سے بھی غافل نہ ہو جائے.

اپنی اس تقریر میں مسلمانوں کے طریقۂ تعلیم کی مزید وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا:

دینیات کی تعلیم کو اولیت دی جانی چاہئے جس میں فقہ، اُصول فقہ، حدیث، اُصول حدیث، تفسیر، علم سیر اور علم عقائد کے علاوہ علم ادب کے تحت زبان دانی اور انشاء پردازی، فارسی، عربی، انگریزی، لیٹن، علم تاریخ، علم جغرافیہ، علم اخلاق، علم قوائے انسان، علم منطق، علم سیاست اور علم انتظام مدن یعنی پولیٹکل اکونمی پڑھائے جائیں.

اس تعلیم گاہ میں ایک مسجد بنائی جاوے جس میں مؤذن وامام مقرر ہو. اور ایک کتب خانہ بنایا جاوے اور ایک بڑا کمرہ کھانے کے لئے اور ایک بڑا کمرہ ایسے کھیلوں کے کھیلنے کے لئے جو مکان کے اندر کھیلے جاتے ہیں اور باقی منفرد مناسب کمرہ اس طرح پر کہ ہر ایک لڑکے کو ایک مناسب کمرہ پڑھنے کو ملے.

ان تمام لڑکوں کے لئے لازم ہوگا کہ مسجد میں ہر روز کی نمازیں جماعت سے پڑھیں اور صبح کی نماز کے بعد کسی قدر قرآن مجید بموجب اُس قاعدہ کے پڑھ لیا کریں جو تجویز کیا جاوے. اتفاقیہ بیماری یا اتفاقیہ ضرورت کے واسطے ایک طبیب ملازم رہے.

تعلیمی پالیسی کے تحت سرسید کی یہ بھی خواہش تھی کہ ہر شہر اور قصبہ میں مدارس اور مکاتب قائم کئے جائیں اور اِن مدرسوں کے فارغین مدرستہ العلوم علی گڑھ میں داخل ہوں تاکہ اس ادارے کا اسلامی کردار بن سکے. وہ ان مکاتب میں قرآن مجید کو چھ ماہ میں پورا کرنے کا طریقہ بھی بتاتے ہیں اور ان مکاتب میں نماز پڑھنے پر بھی زور دیتے ہیں. ساتھ ہی ساتھ چھوٹی چھوٹی اردو کتابیں جیسے **راہ نجات**، **حقیقت الصلوٰۃ** وغیرہ کو بھی شامل نصاب کرنا چاہتے ہیں. قرآن مجید حفظ کرنے پر بھی اُن کا زور ہے. وہ چھ سے دس سال تک

کے لڑکوں کو قرآن مجید کے حفظ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں. وہ بچوں کی مذہبی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے بعد جدید تعلیم کو اپنانے پر زور دیتے ہیں. سر سید درس نظامی میں وقت اور حالات کے مطابق تبدیلی لانا چاہتے ہیں اور سلسلۂ جدید قائم کرنے پر زور دیتے ہیں.

مستقبل کے اس تعلیمی منصوبے کو بروے کار لانے کے لئے سر سید احمد خان ملک بھر کے ممتاز علماء سے رابطہ قائم کر کے دینیات کے نصاب کے لئے ۱۸۷۴ء میں ایک کمیٹی کا اعلان کر دیتے ہیں.

دینیات کی اس کمیٹی میں جن علماء کو شامل کیا گیا اُن میں سرفہرست نام مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی مدرسہ عربی دیوبند تھا. دیگر علمائے کرام تھے حاجی مولوی محمد یعقوب نانوتوی دیوبند، مفتی محمد سعد اللہ ریاست رامپور، حاجی مولوی علی بخش گورکھپور، مولوی محمد احسن نانوتوی گورنمنٹ کالج بریلی، مولوی عبد القادر عثمانی بدایوں، حافظ مولوی محمد اسماعیل علی گڑھ، مولوی محمد شکور مچھلی شہر اور مولوی محمد سمیع اللہ خان.

سر سید نے ان تمام علماء گرامی کو یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ دینیات کا نصابِ تعلیم کالج انتظامیہ اور خود اُن کی مداخلت سے آزاد ہوگا اور اس اہتمام کے لئے کمیٹی مدبران تعلیم مذہب اہل سنت والجماعت تشکیل دی گئی جس میں علماء کی بھرپور نمائندگی تھی.

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور سر سید احمد خان دونوں ہی نے مذہب کی ابتدائی تعلیم دہلی کالج کے متبحر عالم مولانا مملوک علی سے حاصل کی. ایک ہی استاذ کے دونوں شاگردوں کا طرز فکر اور طرز عمل مختلف شکلوں میں رونما ہوا. دونوں قوم کی اصلاح چاہتے تھے. ایک نے قومی سلامتی کے لئے خالص مذہبی تعلیم کی اشاعت کو ضروری سمجھا، دوسرے نے دینی اور دنیوی تعلیم کو وقت کی ضرورت خیال کیا. سر سید کا مقصد ایم. اے. او. کالج میں دینی تعلیم کو جسم میں روح کی حیثیت کا درجہ دینا تھا.

مولانا محمد قاسم نوتویؒ نے جب دار العلوم دیوبند قائم کیا تو سر سیدؒ پہلے شخص تھے جنھوں نے اس درس گاہ کی حمایت میں **انسٹیٹوٹ گزٹ** کے ایک مضمون میں

مولانا نانوتوی کی تعلیمی خدمات کو سراہا اور ملک بھر کے مسلمانوں سے دارالعلوم دیوبند کی مدد کرنے کی درخواست کی کیونکہ مولانا نانوتوی اور سرسید کا مقصد ایک ہی تھا.

سرسید کے دوست اور میرٹھ میں مطبع احمدی کے مالک مولوی ممتاز علی کے پریس میں مولانا نانوتوی علمی مشاغل سے الگ کتب حدیث میں متن حدیث کی تصحیح کا کام کرتے تھے. غالب کے خطوط کا مجموعہ بھی پہلے اسی پریس سے شائع ہوا تھا. دارالعلوم کی تاسیس کے بعد جب تدوین نصاب کا مرحلہ درپیش ہوا تو اکابر کا نگاہِ انتخاب تھے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ.

سرسید کو مدرسہ دیوبند کی پہلی رپورٹ جب موصول ہوئی تو انہوں نے اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے لکھا:

> دیوبند کی ایک چھوٹی سی بستی ہے، کوئی بہت بڑا نامی گرامی شہر نہیں، مگر اس کے باشندوں کی عالی ہمتی اور نیک نیتی کو دیکھ کر بڑے بڑے مشہور شہروں پر اس کو فوق دینا واجب ہے. مولوی محمد یعقوب صاحب مدرس، خلف مولانا مملوک علی صاحب مرحوم اور مولوی محمد محمود صاحب دیوبند کی محنت اور توجہ از بس قابل تحسین ہیں اور آفریں کے ہے کہ ان کی توجہ سے اس تھوڑے سے عرصہ میں بہت کچھ ترقی، تعداد اور استعداد ظہور میں آئی.

مولانا نانوتوی کا انتقال ۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء کو دیوبند میں ہوا تو ان کے ہم سبق سید احمد خان نے جو تعزیتی پیغام تحریر کیا اس سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا نانوتوی اور سرسید ایک دوسرے کے حریف نہیں بلکہ حلیف تھے. سرسید لکھتے ہیں:

> زمانہ بہتوں کو رویا ہے اور آئندہ بھی بہتوں کو روئے گا لیکن ایسے شخص کے لئے رونا جس کے بعد کوئی اس کا جانشین نظر نہ آوے نہایت رنج وغم اور افسوس کا باعث ہوتا ہے. ایک زمانہ تھا کہ دلی کے علماء میں سے بعض لوگ جیسے اپنے علم اور فضل اور تقویٰ اور ورع میں معروف ومشہور تھے ویسے ہی نیک مزاج اور سادہ وضع مسکینی میں بے مثل تھے. لوگوں کا خیال تھا کہ بعد جناب مولوی محمد اسحاق صاحب کے کوئی شخص ان کی مثل تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں ہے. مگر مولوی محمد قاسم

صاحب مرحوم نے اپنی کمال نیکی اور دینداری اور تقویٰ اور ورع اور مسکینی سے ثابت کر دیا کہ اسی دلی کی تعلیم و تربیت کی بدولت مولوی اسحاق صاحب کی مثل اور شخص بھی خدا نے پیدا کیا ہے بلکہ چند باتوں میں ان سے زیادہ ہے۔

سرسید اپنی طالب علمی کے دور کی یاد کو تازہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

بہت کم لوگ زندہ ہیں جنھوں نے مولوی محمد قاسمؒ صاحب کو نہایت کم عمر میں دہلی میں تعلیم پاتے ہوئے دیکھا ہے۔ انہوں نے جناب مولوی مملوک علیؒ صاحب سے تمام کتابیں پڑھیں تھیں۔ ابتداء سے آثار تقویٰ اور ورع اور نیک بختی اور خدا پرستی کے ان کی اوضاع واطوار سے نمایاں تھے۔ زمانہ تحصیل علم میں جیسے کہ وہ ذہانت اور عالی دماغی اور فہم فراست میں معروف ومشہور تھے، ویسے ہی نیکی اور خدا پرستی میں زبان زد اہل فضل وکمال تھے۔ ان کی تمام خصلتیں فرشتوں کی سی خصلتیں تھیں۔ ہم اپنے دل سے ان کے ساتھ محبت رکھتے تھے اور ایسا شخص جس نے ایسی نیکی سے اپنی زندگی بسر کی ہے بلاشبہ نہایت محبت کے لائق ہے۔ اس زمانہ میں سب لوگ تسلیم کرتے ہیں اور شاید وہ لوگ بھی جو ان سے بعض مسائل میں اختلاف کرتے تھے، تسلیم کرتے ہوں گے کہ مولوی محمد قاسم اس دنیا میں بے مثل شخص تھے۔ ان کا پایہ اس زمانہ میں شاید معلومات علمی میں شاہ عبدالعزیز سے کچھ کم ہو، الاّ اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا۔

افسوس کہ ہماری قوم بہ نسبت اس کے کہ علمی طور پر کام کرے زبانی عقیدت اور ارادت بہت زیادہ ظاہر کرتی ہے۔ ہماری قوم کے لوگوں کا یہ کام نہیں ہے کہ ایسے شخص کے دنیا سے اُٹھ جانے کے بعد صرف چند کلمے حسرت وافسوس کے کہہ کر خاموش ہو رہیں یا چند آنسو آنکھ سے بہا کر اور رومال سے پونچھ کر چہرہ صاف کرلیں، بلکہ ان کا فرض ہے کہ ایسے شخص کی یادگاری کو قائم رکھیں دیوبند مدرسہ ان کی نہایت ہی عمدہ یادگاری ہے اور سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ وہ مدرسہ ہمیشہ قائم اور مستقل قائم رہے اور اس کے ذریعہ سے تمام قوم کے دل پر ان کی یادگاری کا نقش سجا رہے۔

خود مولانا نانوتویؒ بھی سرسیدؒ کے خلوص نیت کے معترف تھے اگر چہ ان کی مذہبی

آراء سے اتفاق نہیں کرتے تھے. بقول مہدی علی صاحب کے

سرسید کے اٹھارہ اقوال پر کفر کے فتوے دیئے گئے اوران فتوؤں پر ملک اور بیرون ملک کے نوسو علماء نے دستخط کئے مگران فتوؤں میں ایک بھی فتویٰ ایسا نہیں جس پر مولانا محمد قاسم نانوتوی کے دستخط ہوں.

سرسیداور مولانا نانوتوی کے درمیان مذہبی افکار پر جو طویل خط وکتابت ہوئی وہ **تصفیۃ العقائد** میں موجود ہے.

مولانا سخاوت علی سہارنپوری انبہٹہ پیرزادگان میں جب مدرسہ قائم کرتے ہیں تو اس مدرسے کے قیام کا سبب **تہذیب الاخلاق** ہی کو قرار دیتے ہیں اور ضلع کے کل مدارس دیوبند، سہارنپور اور گنگوہ کے طلباء کے لئے محمڈن کالج علی گڑھ کو وہ ''قصر اُمید'' سے تعبیر کرتے ہیں.

سرسید کی زندگی میں اُن کے قریب ترین رفیق نواب محسن الملک جب ۱۸۹۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سلسلہ میں میرٹھ تشریف لے گئے تو انہیں سہارنپور کے قدیم ومعروف مدرسہ مظاہر علوم کے ذمہ داروں نے جلسہ تقسیم اسناد شرکت کی دعوت دی. نواب صاحب نے اسے بخوشی قبول کرلیا اور جلسہ میں شریک ہوئے جس میں سہارنپور کے علماء کے علاوہ دیوبند کے علماء بھی تشریف فرما تھے. اس موقعہ پر نواب محسن الملک کو ایک سپاسنامہ بھی پیش کیا گیا جس میں اس خیال کی تردید بھی کی گئی تھی کہ ارباب مدرسہ اسلامیہ انگریزی تعلیم کو بُرا سمجھتے ہیں.

ایک خاندانی روایت کے مطابق خود مولانا نانوتوی بھی انگریزی زبان سیکھنا چاہتے تھے جس کے لئے وہ انگلستان تک کا سفر کرنے کو تیار تھے.

سرسیدؒ نے سب سے پہلے مولانا قاسم نانوتویؒ اوران کے قریبی رفقاء مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے مراسلت کی اوران سے یہ درخواست کی ان میں سے کوئی ایک یا ان کا کوئی نمائندہ ناظم دینیات کی ذمہ داری قبول کرلے لیکن ان حضرات

نے معذوری ظاہر کی. آخر میں حلقۂ دیوبند کے ایک ممتاز عالم دین مولانا عبداللہ انصاریؒ (داماد مولانا قاسم نانوتوی) سے رابطہ قائم کیا گیا اور ۱۸۹۳ء میں اولین ناظم دینیات کی حیثیت سے سرسید انھیں علی گڑھ لانے میں کامیاب ہو گئے. سرسید کا دیوبند سے عالم دین بلانے پر اصرار واضح ہے. مولانا عبداللہ انصاری کے تقرر کے بعد ایم.اے.او. کالج سے متعلق علمائے وقت کی بہت سی بدگمانیاں دور ہو گئیں.

مولانا عبداللہ انصاریؒ کے تقرر سے متعلق حافظ سعید احمد فاروقی تھانوی نائب منیجر بورڈنگ ہاؤس کے نام ایک خط میں سرسیدؒ نے مولانا عبداللہ انصاریؒ سے بڑی اپنائیت کا اظہار کیا ہے (اُس خط کا متن اس کتاب میں موجود ہے). سرسید بہت پُر اُمید ہیں کہ مولوی عبداللہ جس خانوادے کے فرد ہیں ان بزرگوں سے میری ذاتی واقفیت ہے، دینی کاموں کو وہ بحسن وخوبی انجام دیں گے. اس خط میں سرسید مدرسہ میں اُن کی شریف آوری کو باعث خیر و برکت سمجھتے ہیں.

ناظم دینیات مولانا عبداللہ انصاری کی بنیادی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ دینی اور اخلاقی امور میں طلبائے عزیز کی رہنمائی ونگرانی کریں گے اور انھیں ایسی سہولیات بہم پہنچائیں کہ وہ کالج کی زندگی میں دین کے اخلاقی تقاضوں کو بحسن وخوبی پورا کرسکیں اور عملی زندگی کے لئے اپنے آپ کو ایک متدین اور با اخلاق انسان کی حیثیت سے تیار کرسکیں. اسی لئے کالج کی مسجد کی نگرانی اور پنج وقتہ نمازوں کے اہتمام کے علاوہ ناظم دینیات سے یہ بھی مطلوب تھا کہ وقتاً فوقتاً طلبہ کو وعظ ونصیحت کرتے رہیں اور خاص طور سے ان کے سامنے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ اور صحابہ کرام و دیگر بزرگان دین کی زندگی کے واقعات اس طرح پیش کریں کہ ان میں دینداری، احکام مذہبی کی پابندی، حسن اخلاق، والدین اور استادوں کا ادب، سچائی اور سادگی اور باہمی اخوت و ہمدردی جیسی نیکیاں و اچھائیاں پروان چڑھیں (**خطوط سر سید**)

شروع میں درس قرآن علامہ شبلی نعمانی کے ذمہ تھا. مگر کالج سے شبلی کی علیحدگی کے

بعد مولانا عبداللہ انصاری نے خود یہ ذمہ داری قبول کرلی. ان کا درس قرآن کا یہ سلسلہ طلبہ میں بہت مقبول ہوا شیعہ اور سنّی طلبہ بڑے ذوق شوق سے اس میں شریک ہوتے تھے اور بانیٔ درسگاہ سرسید احمد خان اسے کالج کے لئے وجہ افتخار تصور کرتے تھے.

خود علامہ شبلی نعمانی بھی مولانا عبداللہ انصاری کی علمی لیاقت کے معترف تھے.

سرسید کو ۲۰ جنوری ۱۸۹۵ء کے ایک خط میں مولانا شبلی نعمانی فرماتے ہیں:

> مولانا عبداللہ انصاری ماشاء اللہ جلیل القدر فاضل اور نہایت بابرکت شخص ہیں. اب یہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ قرآن شریف کا ترجمہ جو خاکسار کالج کلاس کے طلبہ کو پڑھاتا ہے وہ مولانا صاحب ممدوح کے تعلق کردیا جائے. علاوہ عمدہ تعلیم پانے کے طلباء کو ان کی برکت سے روزانہ مستفیض ہونے کا بھی موقعہ ملے گا.

نواب وقار الملک کی سکریٹری شپ کے دوران ایم. اے. او. کالج کے فارغین کو دینیات کی اعلیٰ تعلیم کی سہولتیں بہم پہونچانے پر غوروخوض ہوا. نواب صاحب نے کالج انتظامیہ سے اس بات کے لئے منظوری حاصل کرلی کہ جو گریجویٹ دینیات میں اختصاص پیدا کرنا چاہیں انہیں وظیفہ دے کر کسی مدرسہ میں بھیجا جائے اس کے لئے بھی دارالعلوم دیوبند کو منتخب کیا گیا اور کالج کے ایک گریجویٹ کو ۱۹۱۱ء میں تین سال کے لئے پچاس روپیہ سالانہ وظیفہ دے کر دیوبند بھیجا گیا. (**وقار حیات ۸۰۵**)

اپریل ۱۸۹۴ء میں ندوۃ العلماء کی تاسیس کے موقع پر سرسید احمد خان کو بھی مدعو کیا گیا تھا (**تاریخ ندوۃ العلماء**) مگر وہ شریک نہ ہوسکے. اجلاس کی صدارت مولانا عبداللہ انصاری نے کی. سرسید نے مدرسہ کی کامیابی کے لئے نیک خواہشات کا پیغام بھیجا اور ۲۷ دسمبر ۱۸۹۴ء کو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسہ میں ندوہ کی تائید میں قرارداد منظور کی گئی.

غرض ایم. اے. او. کالج کے زمانے میں ہی مولانا عبداللہ انصاری ناظم دینیات کی وجہ سے دیوبند کے علاوہ ندوۃ العلماء سے بھی علی گڑھ کا ربط قائم ہوگیا اور جلد ہی وہاں کے فارغین نے علی گڑھ کالج سے استفادہ کرنا شروع کیا.

ایم. اے. او. کالج کے اولین ناظم دینیات مولانا عبداللہ انصاریؒ کا انتقال ۱۹۲۵ء

میں ہوا تو ان کی وفات پر ندوۃ العلماء میں تعزیتی جلسہ ہوا تعزیتی قرارداد میں دلی رنج وغم کا اظہار کیا گیا:

> یہ جلسہ مولانا عبداللہ انصاریؒ ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی کی رحلت پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے. مرحوم ابتداء سے ندوۃ العلماء کے ارکان اور ہمدردوں میں شامل تھے. ادارہ دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو غریق رحمت فرمائے. آمین **(تاریخ ندوۃ العلماء)**

غرضیکہ سرسید احمد خان نے ایک صدی قبل دینی اور مادی علوم کے اداروں کے درمیان باہمی ربط وتعاون کی فضا کو پیدا کرنے کا خواب دیکھا تھا. اسی خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے مولانا عبداللہ انصاری کو اولین ناظم دینیات مقرر کیا گیا تھا. وہ ان کی دور رس حکمت عملی کا نتیجہ تھا. بحمد للہ آج نہ صرف دیوبند بلکہ متعدد مذہبی اداروں کے درمیان علی گڑھ کا باہمی ربط و تعاون قائم ہے. مولانا عبداللہ انصاریؒ نے اپنی حیات مبارکہ میں چونتیس برس جس پودے کی آبیاری کی وہ اب ایک تناور درخت ہے. دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء کے طلبہ کی کثیر تعداد آج یونیورسٹی کی علمی فضا میں دینی ماحول قائم کئے ہوئے ہے. ان سب کے لئے مولانا عبداللہ انصاری کی بے پایاں خدمات اور اعلیٰ کردار کو فراموش نہیں کیا جا سکتا.

☆ سابق افسر اعلیٰ رابطۂ عامہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی.

تاریخی پس منظر

محمد طارق غازی

حضرت ابوایوب انصاریؓ سے پیر ہرات خواجہ عبداللہ انصاریؒ تک انصاریان ہند کے نسب پر کثیر روایات پائی جاتی ہیں۔اس پر اتفاق ہے کہ پیر ہرات حضرت ابو ایوبؓ کے صاحبزادے حضرت منصورمت کی اولاد میں ہیں اور حضرت منصورمت کو خلیفہ ثالث امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خراسان کا قاضی القضاہ مقرر کیا تھا۔حضرت عمرؓ ابن الخطاب کے عہد خلافت میں خراسان کی مہم پر بنی تمیم کے سربراہ حضرت احنفؓ ابن قیس کی سالاری میں ایک فوج بھیجی گئی تھی۔روایت ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اس فوج کے لئے جو کمک بھیجی تھی اس میں حضرت منصورمت شامل تھے۔

حضرت منصورمت کے نام پر بھی بحث پائی جاتی ہے۔روایت ہے کہ ان کا نام محمد اور کنیت ابوالمنصور تھی، یعنی نام منصور نہیں، محمد تھا اور وہی نام تورانی علاقہ کی زبان میں لاڈ سے پکارا گیا تو ''**مد**'' بن گیا۔ابن ابوایوب انصاری عرب سے تورانی علاقہ میں آئے تھے جہاں کی ترکانی زبان میں حرف [**د**] اور حرف [**ت**] باہم متبادل ہوتے ہیں۔چنانچہ نام **محمد** پہلے پیار محبت کا مخفف [**مد**] ہوا پھر ترکانی تحریر میں [**مت**] لکھا جانے لگا۔برصغیر میں بعض حضرات نے اسے [**مست**] پڑھا ہے اور نسب ناموں میں بھی ایسے ہی لکھنا شروع کیا مگر یہ تلفظ درست نہیں ہے۔کسی مست و مجذوب کو قاضی مقرر نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری تاریخی بات یہ ہے کہ پیر ہرات کی اولاد میں کثیر تعداد میں لوگ ہندستان میں وارد ہوئے تھے۔ایسا نہیں تھا کہ کوئی ایک شخص ہرات سے ہندستان آیا اور بعد میں اس کی نسلیں ملک کے مختلف حصوں میں آباد ہو گئیں۔نہ مختلف افراد ایک ساتھ وارد ہو گئے تھے اور پھر مختلف شہروں میں بس گئے۔نقل وطن کا یہ سلسلہ خاندانوں اور افراد کی شکل میں خاصی طویل

مدت تک جاری رہا اور نو وارد اصحاب شمالی ہند کے مختلف مقامات پر آباد ہوتے گئے.

ہرات کے ان انصار خاندانوں کے انتشار کا سبب خراسان و ماوراء النہر میں چنگیز خان منگول کی یورشیں اور مظالم تھے. چھٹی صدی ہجری/ تیرھویں صدی عیسوی میں کاشغر اور قراقرم سے کیف (اوکرانیہ/ یوکرین) تک اور بیکال سے خیوا (خوارزم) تک کوئی انسانی بستی نہ رہ گئی تھی جہاں خون کی ندیاں نہ بہہ گئی ہوں اور انسانی کھوپڑیوں کے انبار نہ لگا دئے گئے ہوں. شہر کے شہر تباہ و تاراج کر دئے تھے. فارس، خراسان، ترکانیہ اور ماوراء النہر کے اس پورے خطہ کی معیشت مکمل طور پر برباد ہوگئی تھی. جو لوگ چنگیز کی تیغ ستم سے بچ گئے تھے ان میں سے اکثر کے لئے روزگار مفقود ہو گیا تھا. بے شمار چھوٹے حکمرانوں اور والیان صوبجات کی حکومتوں کا نام و نشان مٹ گیا تھا اور سابق امراء وزراء اور خود سلاطین نان شبینہ کو محتاج اور زمین پر تتر بتر ہو رہے تھے. اس وقت ختن سے خیوا خوارزم تک کہیں امن نہ تھا تو لٹے پٹے قافلوں کو ایک ہی سرزمینِ امن دکھائی دیتی تھی جو شام و مصر کے مقابلہ میں قریب بھی تھی، جہاں عزت و آبرو کا تحفظ بھی تھا اور جہاں روزگار کے مواقع بھی کشادہ تھے. یہ سرزمین ہندستان کی تھی جہاں سلطان شمس الدین التمش، سلطان غیاث الدین بلبن، سلطان جلال الدین خلجی، سلطان علاء الدین خلجی جیسے وہ جیالے ترک دہلی کے تخت پر بیٹھے تھے تھے جن کا نام سن کر سر پھرے منگول سرداروں کا پتہ پانی ہوتا تھا.

اس پر آشوب دور میں مختلف اوقات میں خاندان یہ خاندان پیر ہرات کی اولاد ہندستان کی طرف ہجرت کرتی رہی اور اس ملک کے شاہان عصر اُن کے علم و فضل کے مطابق فیاضانہ سلوک کرتے رہے. ان بزرگوں کو معافی کے قصبات و قریات دئے جاتے تھے تاکہ وہاں بیٹھ کر وہ علم کے چراغ روشن کرتے رہیں اور سرزمین ہند کو اسلام کی علمی اور روحانی روایت سے مربوط کریں. اسلامی نظریہ تعلیم کی رو سے علم انسان کا بنیادی انسانی حق ہے اور اس کی کوئی قیمت نہیں لگائی جا سکتی. نہ یہ جنس بازار ہے کہ کیسہ میں مال ہو تو جا کر کسی دوکان سے حسب مرضی اور حسب ضرورت خرید لاؤ. چنانچہ مسلم شاہان وقت کی طرف سے علماء کو جو

معافی کی اراضی دی جاتی تھیں وہ صرف ان کے ذاتی اورخاندانی اخراجات کی مد میں اور علماء واہل اللہ کو زمیندار بنانے کے لئے نہیں ہوتی تھیں بلکہ ان اراضی کی آمدنی کا اصل مصرف تحصیل علم کے لئے آنے والوں کے زمانہ طالب علمی کے جملہ اخراجات پورے کرنا ہوتا تھا.

ہرات سے انصار خانوادوں کے ورود ہندستان کی بیانیہ تاریخ مرتب کرنا بہت دشوار ہے. تاریخی اور خاندانی زبانی یا شجروں میں تحریر روایات کی جانچ پڑتال آسان نہیں ہے. روایات بے شمار ہیں اور ان سب کی تصدیق اور ان میں باہم تطبیق بھی آسان نہیں.

مثلاً ایک طرف مولوی محمد عنایت اللہ فرنگی محلی (**تذکرہ علمائے فرنگی محل**) اور مولوی الطاف الرحمان بارہ بنکوی (**احوال علمائے فرنگی محل**) جیسے بعض علماء انساب انصاریان سہارنپور کو سلسلہ عُلمائے بَرسل و برناوہ کی اولاد قرار دیتے ہیں. تاریخی حقائق ان بیانات سے ہم آہنگ نہیں ہیں.

دوسری روایت انصار سہارنپور کے سب سے مستند تذکرہ **مراۃ جہاں نما** میں مولانا محمد بقا سہارنپوری (ابن مولانا غلام محمد ابن مولانا عبدالستار ابن مولانا عبدالکریم ابن خواجہ سالار ابن خواجہ فریدالدین انصاری ہروی ثم سہارنپوری) ایک مختلف سلسلۂ نسب بیان کرتے ہیں جس میں خواجہ فریدالدین ہروی ثم سہارنپوری کے صاحب زادے خواجہ سالار (یا شیخ سالار بندگی رامپوری) کی اولاد میں ۸۰۰ھ/۱۴۰۰ء سے ۱۱۰۰ھ/۱۷۰۰ء کے دوران ہندستان میں بڑی تعداد میں علماء، صلحا اور مشائخ طریقت پیدا ہوئے. مولانا محمد بقا سہارنپوری کے حوالے سے مولانا عبدالحی حسنی (**نزھۃ خواطر** اور **اسلامی علوم وفنون ہندستان میں**)، مولانا محمد اسحٰق بھٹی (**فقہائے ہند**)، مولانا عبدالرحمٰن ناروی (**تذکرہ علمائے ہند**)، نیز براہ راست شیخ پیارے (**لطائف قطبیہ**)، مفتی غلام سرور لاہوری (**خزینۃ الاصفیاء**)، مولانا محمد میاں (**علمائے ہند کا شاندار ماضی**)، وجیہ الدین اشرف (**بحر ذخار**) اور **مہر جہاں تاب** میں سہارنپور کے ۲۱ علماء و مشائخ کا ذکر کیا ہے جو ۸۶۶ھ سے ۱۱۰۱ھ کے دوران حیات تھے. اس سلسلہ نسب کے

جداعلی خواجہ فریدالدین ہروی ثم سہار نپوری کے صاحبزادے خواجہ سالار تھے جو ضلع سہار نپور کے قصبہ رامپور منہیاران میں شیخ سالار بندگی کے نام سے معروف ہیں اوراسی قصبہ میں ان کی قبر ہے. خواجہ سالار کے بیٹے مولانا عبدالکریم سہار نپوری جید عالم دین تھے اوران کے پوتے شیخ عبدالستار کی اولاد میں کئی نسلوں (۱۱۰۱ھ) تک علماء ومشائخ کا سلسلہ باقی رہا.

تیسری روایت بحوالہ مولانا مشتاق احمد انبہٹوی (**التحفہ الصادقیہ**) انصاریان انبہٹہ کی شاخ شیخ زادگان کے بارے میں یہ ہے کہ وہ امام ناصرالدین انصاری جالندھری (ت: ۵۵۵-۶۴۵ھ/ ۱۱۶۰-۱۲۴۷ء) کا سلسلۂ اولاد ہیں. پیر ہرات تک ان کا شجرہ مولوی محمد ضیاءالدین احمد علوی امروہی نے **مراۃ الانساب** میں درج کیا ہے جسے راقم الحروف نے اپنی سوانحی موسوعہ **تذکار الانصار** میں نقل کیا ہے.

چوتھی روایت یہ ہے کہ شیخ محب اللہ سدھوری ابن شیخ خواجگی سدھوری (و/ ت: ۸۷۵ھ/ ۱۴۷۱ء - جابرابن اسمٰعیل ابن خواجہ عبداللہ انصاری ہروی کے سلسلۂ اولاد) کے جداکبر شیخ نظام الدین ہروی سدھوری ۸۴۰ھ/ ۱۴۳۷ء میں سید خاندان کی حکومت دہلی (۱۴۱۴-۱۴۵۱ء) کے دوران ہرات سے دہلی آئے تھے اور بیان ہے کہ شیخ محب اللہ سدھوری اودھ میں ردولی کا قیام ترک کر کے گنگوہ چلے آئے تھے.

پانچویں روایت بحوالہ مولانا عبدالحی حسنی (**نزھۃ الخواطر**) ہے کہ خواجہ نور الدین انبہٹوی (۸۱۰-۸۹۲ھ/ ۱۴۰۷-۱۴۸۷ء) سلطان محمد تغلق کے زمانہ میں انبہٹہ آئے تھے. ان کے تلامذہ میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے صاحبزادہ مولانا رکن الدین کا نام شامل ہے اور بہلول لودھی کے زمانہ حکومت میں ان کا انتقال ہوا.

چھٹی خاندانی روایت یہ ہے کہ انصاریان سہار نپور سلطان فیروز شاہ تغلق کے زمانۂ حکومت میں ہندستان آئے تھے اوران کو سلطان نے انبہٹہ میں آباد کیا تھا جسے اس کے سپہ سالار سعداللہ بیگ نے ایک فوجی چھاؤنی کے طور پر بسایا تھا اور فیروزآباد نام رکھا تھا.

اتنی بہت سی روایات میں سے نکال کر کوئی حتمی بات کہنا بہت دشوار ہے. **مرلۃ**

جہاں نما اور **التحفہ الصادقیہ** دستیاب نہیں ہیں کہ ان سے مدد لی جا سکے. مگر ان پر مبنی متداول روایات اور مولوی محمد ضیاء الدین احمد علوی امروہی کی **مرلۃ الانساب** کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ دوسری، تیسری، پانچویں اور چھٹی روایات زیادہ قرین صحت ہیں.

شیخ الاسلام مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی کے شجرۂ نسب میں کوئی اہمال یا اشکال نہیں ہے. ایک خاندانی روایت ہے کہ بعض بزرگوں کا خیال تھا کہ یہ خاندان سادات ہے اور اپنا سلسلۂ نسب شاہ ابوالمعالی سے ملاتا تھا لیکن سب لوگ اس خیال سے متفق نہیں تھے. چنانچہ مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی نے اپنے سلسلۂ نسب کی تحقیق کا کام اپنے قرابت دار اور دوست مولانا مشتاق احمد انبہٹوی (۱۸۵۶-۱۹۴۱ء) کے سپرد کیا. اس تحقیق **التحفۃ الصادقیہ** کے مطابق مولانا عبداللہ انصاری حضرت ابوایوب الانصاری کی اولاد میں تھے. زیر نظر کتاب میں مستند حوالوں سے یہ شجرہ نقل کر دیا گیا ہے جو پیر ہرات شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری کے واسطہ سے میزبان رسول تک پہنچتا ہے.

اس خانوادہ میں خواجہ فریدالدین ہروی سہارنپوری کی اولاد میں دو بڑی شاخیں ہوئی ہیں. جیسا کہ بیان ہوا خواجہ فریدالدین کے ایک صاحبزادہ خواجہ سالار تھے جن کا مرقد رامپور منہیاران میں ہے. ان کی اولاد میں کثیر تعداد میں جید علماء اور بزرگان طریقت پیدا ہوئے جن کا تذکرہ اسی سلسلہ کے مولانا محمد بقا سہارنپوری نے **مرلۃ جہاں نما** میں کیا ہے. خواجہ فریدالدین کے ایک اور صاحبزادہ قاضی امین الدین عرف قاضی امن تھے. بعد میں ان کی اولاد میں سالاری شاخ کی طرح علماء حق اور مشائخ طریقت کا ایک سنہرا سلسلہ جاری ہوا. ان کی چھٹی نسل میں شاہ غلام محمد کی شادی شاہ ابوالمعالی انبہٹوی کی پڑپوتی محفوظا بی سے ہوئی اور شاہ غلام محمد کی اولاد کو سادات اور اکابر روحانیات سے نسبت ہوئی تو ان میں اہل علم اور اہل اللہ کا ایک نیا سلسلہ جاری ہوا. اس نسل میں شاہ قطب علی ابن شاہ غلام محمد اپنے عہد کے صاحب نسبت بزرگ اہل اللہ میں تھے. شاہ قطب علی کے صاحبزادہ شاہ احمد علی بھی شیخ طریقت تھے. شاہ احمد علی کو اللہ تعالی نے چھ فرزند عطا فرمائے جن میں بالخصوص شاہ مجید

علی، مولانا انصار علی، شاہ احمد حسن اور شاہ حبیب محمد کی اولاد میں مولانا عبدالرحمن انصاری، مولانا عبداللہ انصاری، مولانا مفتی صدیق احمد مالیر کوٹلوی، مولانا انوار احمد، مولانا سلطان احمد، مولانا منیر احمد انبہٹوی، مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری، مولانا نذیر احمد، مولانا پروفیسر رشید احمد سالم انصاری، مولانا محمد میاں منصور انصاری، مولانا احمد میاں انصاری، مولانا مفتی فاروق احمد، مولانا مفتی شفیق احمد، مولانا حامد الانصاری غازی، مولانا محمد ادریس انصاری، مولانا قاری سیف اللہ منصور انصاری جلال آبادی اور ڈاکٹر عابداللہ غازی جیسے ممتاز اہل علم، ارباب دانش اور شیوخ ہوئے. بعد کی نسلیں صرف مغربی طرز کی مادی تعلیم کی خوگر ہوئیں تو خاندان میں علم حقیقی کی یہ روایت کہیں کمزور پڑ گئی اور کہیں بالکل منقطع ہو گئی.

ذاتی طور پر مولانا عبداللہ انصاری ان اہل امتیاز میں نمایاں ہیں جن کے اجداد، اولاد اور احفاد میں علم حقیقی کی بہت محکم روایت نظر آتی ہے. البتہ شاہ احمد علی کے اجداد و احفاد میں اکثر افراد علمی امتیاز کے باوجود غیر معروف رہ گئے تو اس لئے کہ وہ سب انفرادی طور پر تو بڑے کام کرتے رہے لیکن نہ تو انہوں نے تحقیق و تصنیف کا سرمایہ چھوڑا اور نہ کوئی ادارہ اور نظام قائم کیا جو علمی و فکری اعتبار سے ان کی پہچان بنتا اور ان کے فکر کو دوام عطا کرتا. وہ اوروں کے لئے جیتے رہے، اپنوں اور غیروں کے لئے کام کرتے رہے، خزف ڈھونڈ ڈھونڈ کر انہیں موتیوں کی آب دیتے رہے، دیگر شخصیتوں کو دنیا میں شہرت کی بلندیوں پر پہنچاتے رہے، دوسروں کے کاموں کے لئے سند اور دلیل بنتے رہے، اپنی بات کو حدیث دیگراں کے طور پر پیش کرتے رہے، اور فنائیت اور اپنی نفی ذات میں یوں غرق ہوئے کہ ان کو جاننے والے بھی ان کے وجود کے منکر اور ان کے کاموں کی قبروں پر غفلت کی مٹی ڈالنے والے بن گئے.

بڑی شخصیات آسانی سے پیدا نہیں ہو جاتیں. مگر تاریخ میں بڑا بنے رہنے کے لئے انہیں ایک نظم، ایک ادارہ کی ضرورت ہوتی ہے یا پھر قلم کا بے مثال اور انتھک استعمال ان کی یادیں باقی رکھتا ہے. بہت سی بڑی شخصیات انہی خلاؤں میں گمنام ہو گئیں.

مولانا عبداللہ انصاری بھی فرد فرید تھے، ادارہ نہیں تھے. جس مقصد پر انہوں نے

اپنی جان لگائی اور جس کے لئے اپنی حیثیت عرفی کی قربانی دی وہ حاصل نہ ہوا. انہوں نے دو سمندروں کو یکجان کرنے کی کوشش کی، مگر سمندروں کو اپنے رنگِ آب، اپنی مقدارِ نمک، اپنی زمین کی گہرائی، اپنے آسمان کی بلندی، اپنی موجوں کے تلاطم پر اصرار رہا، یہاں تک کہ ندوۃ العلماء کے تاسیسی اجلاس میں کرسیِ صدارت سے بلند ہونے والی یہ للکار سوا سو سال سے اس دل کی تلاش میں سرگرداں ہے جس کے کانوں کی قوت سماعت معدوم نہ ہوئی ہو کہ

> تعلیم میں ہم وہ انداز اختیار کریں جن سے ماضی میں ایک محدث طبیب، ایک فقیہ کیمیا گر، اور ایک عالم دین سائنس داں بھی ہوتا تھا.

تغافل اور تجاہل کی اس فضا میں بھی اگر مولانا عبداللہ انصاری کا سلسلۂ نسب محفوظ ہے تو اس لئے کہ اس معاملہ میں انہوں نے اپنی نگرانی میں تحقیق کروائی اور اسے طبع بھی کروادیا تا کہ آئندہ نسلیں اپنی نسبی حقیقت سے باخبر رہیں. اس کے باوجود انصاریان ہرات کے نقل وطن کے قصوں پر قرار واقعی تحقیق نہ ہو سکی کیونکہ یہ عام دلچسپی کا موضوع نہیں ہے اور نہ کسی کو اس کے علمی افادہ کا یقین ہے. یہی وجوہات ہیں کہ چند بہت نمایاں مثالوں کو چھوڑ کر انصاریان ہرات کی نسلوں میں ہجرت کرنے والے افراد کا تعین کرنا آسان نہیں رہا.

چنانچہ انصاریان افغانستان و ہند کی مختلف شاخوں کے علماء اور ماہرین انساب اپنی شاخ کے نسب ناموں کو جس طرح بیان کرتے ہیں سر دست اسی کو سند مانا جائے اور بعد میں اپنے خاندانوں کے بارے میں انہی کی نئی تحقیقات کو قبول کیا جائے. البتہ اگر ہر سو پچاس سال میں ان منتشر معلومات و تحقیقات کو یکجا کیا جاتا رہے تو ممکن ہے اوپر کی نسلوں سے ہم نسبی متعین ہوتی رہے اور اس ارتباط سے آئندہ نسلوں کو فائدہ ہو.

ڈائریکٹر، اُمم سٹڈیز ہاؤس، ٹورانٹو، کینیڈا.

وہ راز ہوں جو عیاں ہو کے بھی عیاں نہ ہوا
وہ نکتہ ہوں جو بیاں ہو کے بھی بیاں نہ ہوا

خواجہ عزیز الحسن مجذوب سہارنپوری

باب : ۱

نسب وخاندان

انصار مدینہ میں بنی نجار کے سردار سیدنا ابوایوب خالد ابن زید خزرجی انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد کا خاصا وسیع سلسلہ برصغیر ہند پاکستان کے مختلف علاقوں میں پھیلا ہوا ہے. میزبان رسول کی نسلیں برصغیر میں چار بڑی شاخوں میں پائی جاتی ہیں. انصاریان سہارنپور، انصاریان غازی پور، انصاریان پانی پت اور انصاریان فرنگی محل. ان نسلوں کی ایک مشترکہ عمومی شناخت ان کا علمی مزاج ہے. ان شاخوں میں کثیر تعداد میں نامور علماء، صلحاء اور اہل اللہ پیدا ہوئے. ان چاروں شاخوں کا نسب خواجہ عبداللہ انصاری ہروی کے واسطے سے حضرت ابوایوب انصاریؓ تک پہنچتا ہے. (۱)

مولانا عبداللہ انصاری شاخ سہارنپور کے ایک بزرگ تھے. اس شاخ میں جو شہر سہارنپور کے علاوہ نواحی قصبات انبہٹہ، رامپور منہیاران اور گنگوہ میں آباد ہے بڑی تعداد میں علماء دین اور اصحاب رشد و ہدایت پیدا ہوئے. انہی بزرگوں میں مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی کے والد ماجد مولانا انصار علی انیسویں صدی کے اساطین علم میں سے تھے. وہ مولانا مملوک علی نانوتوی کے شاگرد رشید اور داماد تھے اور ساتھ ہی مولانا مملوک علی کے دیگر دو ممتاز شاگردوں مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی سے انہیں خاندانی قرابت اور علمی نسبت بھی حاصل تھی.

خاندانی سلسلۂ علماء

مولانا انصار علیؒ (ت: ۱۸۲۴-۱۸۹۴ء) کے والد ماجد شاہ احمد علی اور دادا شاہ قطب علی خاندانی روایت کے مطابق عالم دین اور صاحب نسبت بزرگ تھے. یہ خاندان ابتدا میں شہر سہارنپور میں رہتا تھا. خواجہ عبداللہ انصاری ہروی کی پندرھویں نسل میں خواجہ فرید

الدین ہروی سہارنپور میں بس گئے تھے، اسی لئے ان کو فرید الدین ہروی سہارنپوری لکھا جاتا ہے. ان کے ایک صاحبزادہ خواجہ سالار کی اولاد میں کئی نسلوں تک ممتاز علماء اور اہل اللہ پیدا ہوئے جن کا ذکر مولانا محمد بقا سہارنپوری نے **مراۃ جہاں نما** میں کیا ہے.

خواجہ فرید الدین ہروی سہارنپوری کے دوسرے صاحبزادے قاضی امین الدین عرف قاضی امن کی چھٹی نسل میں شاہ غلام محمد کی شادی انبہٹہ کے چشتی صابری سلسلہ کے بزرگ حضرت شاہ ابو المعالی (م:۱۱۱۶ھ/۱۷۰۴ء) کی پڑپوتی محفوظا بی بی سے ہوئی تو وہ سہارنپور سے انبہٹہ منتقل ہو گئے. ان کے صاحبزادے شاہ قطب علی کسی سبب سے پڑوسی قصبہ گنگوہ چلے آئے تھے. شاہ قطب علی کے ایک ہی بیٹے شاہ احمد علی (م:ت:۱۸۳۰ء) تھے جو مولانا عبداللہ انصاری کے دادا تھے. بعد میں یہ خاندان واپس انبہٹہ چلا آیا تھا.

نقل وطن کی تاریخ

ابوایوبی انصاریان ہند کی تاریخ خاصی پیچیدہ اور غیر مرتب ہے. وسطی ایشیا سے برصغیر جنوبی ایشیا میں خواجہ عبداللہ انصاری ہروی کی اولاد کی آمد و استقرار کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے. نقل وطن کا سلسلہ کسی ایک فرد یا خاندان پر موقوف نہیں تھا. یہ سلسلہ کم وبیش دو تین صدی تک جاری رہا. پھر انصار کے یہ مہاجر خانوادے ارض ہند کے مختلف شہروں میں آباد ہوئے اور نقل مکانی کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا.

تقریباً ساڑھے پانچ سو سال ہرات اور نواحی قریات میں قیام کے بعد چنگیز خان کی منگول گردی سے متاثر ہو کر آل ابوایوب انصاری میں سے کئی افراد اور خاندان تیرھویں صدی عیسوی کے مختلف برسوں میں ہندستان آتے رہے تھے. روایات کی کثرت کی وجہ سے قطعی طور پر یہ کہنا خاصا مشکل ہے کہ ان میں کونسی شاخ کے کونسے بزرگ کس متعین زمانہ میں ہرات سے ہندستان وارد ہوئے تھے اور کہاں کہاں قیام کرنے کے بعد ان کی یہ چار شاخیں معروف زمانہ ہوئیں. ان شاخوں کے افراد میں باہمی مناکحت اور مصاہرت کے سبب سے خاندان ایک دوسرے میں مدغم بھی ہوئے اور ان رشتوں سے بننے والے نئے

خاندانی سلسلوں کے بارے میں بیانات سے بھی تاریخی بیان میں الجھن پیدا ہوئی ہے.

ایک روایت ہے کہ پیر ہرات کے پڑپوتے شیخ جلال الدین ابن خواجہ سلیم ابن خواجہ اسمٰعیل ابن شیخ الاسلام عبداللہ انصاری ہروی چھٹی صدی ہجری میں ہرات افغانستان سے ترک وطن کر کے ہندستان آئے اور موجوہ ریاست ہریانہ کے منطقہ انبالہ کے ماتحت ضلع کیتھل میں ایک شاداب دیہات سِرسَل میں مقیم ہوگئے. یہ سرسبز بستی شنڈلیہ برہموں اور جاٹوں سے آباد تھی. مولوی محمد عنایت اللہ فرنگی محلی (**تذکرہ علمائے فرنگی محل / ۸**) لکھتے ہیں کہ سِرسَل میں خواجہ جلال الدین نے

خانقاہ اور مسجد بنوائی اور خدمت علم میں مصروف ہوئے. آپ کی اولاد میں برناوہ کے علماء بھی تھے.

سِرسَل اور فرنگی محل کا تعلق

سرسل میں بھی خواجہ جلال الدین کی اولاد میں کئی علماء وصلحائے کاملین ہوئے. اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد واخلاف میں بڑی برکت اور وسعت عطا فرمائی اور روایت ہے کہ اس وقت مغربی یوپی میں پرانے صحیح النسل انصاری ایوبی سلسلہ کے جو خاندان مختلف شہروں میں رہتے ہیں ان کی کئی شاخیں اسی خاندان سے وابستہ ہیں. درس نظامی کے بانی علامہ نظام الدین سہالوی اور خانوادہ علمائے فرنگی محل بھی اسی دودماں کے لعل و گہر ہیں. پانی پت کا انصاری خاندان اسی کی ایک شاخ بتایا جاتا ہے اور کیرانہ ضلع مظفر نگر، سنبھل ضلع مراد آباد اور فتحپور رہسوہ کے انصاری خاندان اسی شجرۂ پر بہار کے اثرات وثمرات کہے جاتے ہیں.

اس نوعیت کی روایات سے یہ گمان گزرتا ہے کہ شیخ جلال الدین ابن خواجہ سلیم برصغیر کے تمام ایوبی انصاریوں کے جدا کبر ہیں. لیکن یہ خیال درست نہیں ہے. پانی پت کے انصاری بھی برناوی خاندان کا سلسلہ نہیں ہیں بلکہ وہ خواجہ ملک علی ہراتی کی اولاد ہیں.

برناوی خاندان کی تاریخ، ہندستان میں آنے کی تفصیل، اس کے اکابر، علماء مشائخ اور بعد کی نسلوں کے احوال وتعارف پر کئی کتابیں موجود اور متعدد خاندانوں کے

احوال پر مرتب تالیفات میں بھی اس کا مفصل و مختصر ذکر کیا گیا ہے. شیخ الطاف الرحمٰن بارہ بنکوی کی تحقیق **احوال علمائے فرنگی محل** کے ایک اقتباس سے اس خاندان کے ہندستان کے سفر اور متعلقات کی کئی کتابوں میں بکھری ہوئی مختصر مگر جامع معلومات سامنے آتی ہیں. یہ اقتباس مولوی محمد عنایت اللہ فرنگی محلی نے بھی کم و بیش نقل کیا ہے:

> حضرت عبداللہ انصاری کے بیٹے اسماعیل نامی تھے جن کی وجہ سے کنیت ابو اسماعیل تھی اور انہیں سے آپ کا سلسلہ نسب جاری ہوا. ہندستان میں اور بھی خاندان علاوہ اس فرنگی محل کے آپ کی اولاد میں ہیں اور مشہور و معروف علماو فقراء اور بزرگانِ دین (۲) آپ کی اولاد سے گذرے ہیں.

پیر ہرات کے بڑے صاحبزادہ خواجہ اسماعیل تھے، لیکن اول تو یہی صحیح نہیں ہے کہ برصغیر کے تمام ایوبی انصاری انہی خواجہ اسمٰعیل ابن خواجہ عبداللہ کی اولاد میں ہیں. خود فرنگی محل کے نسب پر دو بیانات ہیں. ایک بیان مولوی محمد ضیاءالدین احمد علوی امروہی (**مـــرلـــة الانساب**) کا ہے کہ فرنگی محلی انصاری خواجہ اسماعیل ابن خواجہ عبداللہ انصاری ہروی کی اولاد ہیں. اس کی تصدیق مولانا عبدالحی حسنی (**نــزهة الـخـواطـر**) بھی کرتے ہیں کہ فرنگی محلی انصاری اسماعیل کی اولاد میں خواجہ علاء الدین برناوی اور پھر شیخ خواجگی سدھوری (۱۴۷۱ء) کی اولاد میں ہیں. دوسرا بیان صاحب **اغـصـان اربعه** مولوی ولی اللہ فرنگی محلی کے صاحبزادہ مولانا انعام اللہ (۱۸۸۱ء) کے حوالہ سے مفتی محمد رضا انصاری کا ہے کہ فرنگی محلی انصاری خواجہ اسماعیل کی اولاد نہیں بلکہ ایوب ابن جابر ابن مقرب باری ابن خواجہ عبداللہ انصاری ہروی کی اولاد میں سے ہیں.

مفتی محمد رضا انصاری. **باقیات** (مرتبہ محمد فائق رضا انصاری) لکھنؤ. ۲۰۰۹ء ص ۳.

مگر یہاں پھر ایک مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ مولانا انعام اللہ کے مرتبہ شجرہ میں برناوی سلسلہ کے اجداد شیخ جلال الدین (ابن خواجہ سلیم ابن خواجہ اسماعیل ابن خواجہ عبداللہ انصاری) کے نام وارد نہیں ہوئے.

مولوی محمد عنایت اللہ فرنگی محلی مزید لکھتے ہیں

ہرات سے حضرت خواجہ جلال الدین بن خواجہ سلیم بن خواجہ اسماعیل بن عبداللہ انصاری بواسطے جہاد ہندوستان میں تشریف لائے اور قریہ سرسَل میں قیام کیا۔ایک مدت تک درس و تدریس میں وہاں مشغول رہے اور خانقاہ اور مسجد بھی تعمیر کرائی۔قریب اس مسجد کے دھرم سال حوض ہے اس کے متصل دفن کیئے گئے۔مدت کے بعد وہ قریہ ختم ہوگیا سوائے آپ کے مقبرہ کے اور مکانات منہدم ہوگئے۔آپ کی اولاد میں بہت بڑے بڑے علماء وفضلاء گذرے ہیں جن میں سے خاندان برناوہ (قریب دہلی/ بڑوت، میرٹھ کے ایک قریہ) کے بھی اکابرین ان کے احوال رسالہ **چشتیہ بہشتیہ** اور **تکملہ خیر العمل** اور مقدمہ **فتاوی قیام الملتہ والدین** میں مکتوب ہیں۔من جملہ ان کے مخدوم بدرالدین ابن مخدوم شرف الدین ابن خواجہ فضیل ابن خواجہ کلان ابن خواجہ داؤد ابن خواجہ حامد ابن خواجہ جلال الدین ہیں۔ (۴)

خواجہ جلال الدین کی اولاد کا قیام سرسل میں تقریبا دوسو سال رہا۔مقامی حالات میں خرابی آئی اور بستی کی آبادی مہمانداری سے دست کش ہوئی تو خواجہ جلال الدین کی ساتویں نسل میں مخدوم بدرالدین ابن مخدوم شرف الدین ابن خواجہ فضیل ابن خواجہ کلاں ابن خواجہ داؤد ابن خواجہ حامد ابن خواجہ جلال الدین نے سرسل کی سکونت ترک کردی۔مخدوم بدرالدین نے دہلی میں توطن اختیار کیا اور علوم عقلیہ ونقلیہ حاصل کر کے عالم تبحر ہوئے اور منارہ شمسیہ (قطب کی لاٹ) کے قریب مدرسہ بنوا کر درس وتدریس میں مصروف ہوئے۔آخر میں حضرت (. . .) خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی سے بیعت کی اور اجازت وخلافت حاصل کر کے برناوہ قریب دہلی (اترپردیش کے ضلع باغپت میں میرٹھ سے ۳۷ کیلو میٹر دور سردھنہ اور بنولی کے درمیان) میں سکونت اختیار فرمائی؛ اور ضعیف العمری میں شیخ کے حکم کے مطابق نکاح کیا جن سے ایک صاحبزادہ نصیر الدین پیدا ہوئے۔مخدوم بدرالدین نے ۷۸۸ھ (۱۳۸۶ء) میں وفات پائی۔ان کے صاحبزادہ نے تحصیل علم اپنے والد ماجد سے کی، عالم فاضل ہوئے، ۱۱ ذی الحجہ ۸۴۹ھ (مارچ ۱۴۴۶ء) میں انتقال فرمایا اور ایک صاحبزادہ مخدوم علاء الدین یادگار چھوڑے جنہوں نے ۲۱ شوال ۸۷۶ھ (اپریل ۱۴۷۲ء) میں وفات پائی اور موضع شیخوپور میں اپنے والد کے مقبرہ میں دفن ہوئے۔

(شیخ الطاف الرحمٰن بارہ بنکوی کی) **احوال علمائے فرنگی محل** میں ہے کہ
علاء الدین خلجی سلطان الہند بھی آپ (مخدوم علاء الدین) کے مرید تھے.
مولوی محمد عنایت اللہ فرنگی محلی. **تذکرہ علمائے فرنگی محل** ۸
بے شک خاندان برناوہ کی ایک مستقل تاریخ ہے.[۴] ہر سَل سے نکلنے کے بعد برناوہ میں اس خاندان کی آبادی بڑھتی گئی اور اس نے اطراف میں اپنے خاندان کے قیام اور دین ومعرفت کی تبلیغ وتلقین کے لیے خانقاہیں، مسجدیں اور مدرسے آباد کیے.[۵] البتہ یہ دعویٰ تاریخی شہادت اور ثبوت کا محتاج ہے کہ کافی مدت بعد برناوی خاندان کے چند افراد تلاش معاش یا کسی اور وجہ سے برناوہ سے رخصت ہوکر ضلع سہارنپور کے قصبہ رام پور منہیاران آ گئے تھے. اول تو یہ ذکر ہی نہیں ملتا کہ برناوہ سے رامپور کا یہ سفر کرنے والے کون لوگ تھے. پھر شجروں کا متوازی مطالعہ اس کی تائید نہیں بلکہ تردید کرتا ہے.

سلسلۂ سہارنپور کا امتیاز

اس بحث سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ خواجہ عبداللہ انصاری ہروی کی اولاد میں انصاریان ہند مختلف اوقات میں مختلف خاندانوں کی صورت میں ہندستان وارد ہوئے تھے اور ضروری نہیں کہ شیخ الاسلام عبداللہ انصاری سے پہلے ان کے شجرے باہم ملتے ہوں.

درحقیقت برناوی اور سہارنپوری نسب دو مختلف عمود ہیں اور خواجہ عبداللہ انصاری ہروی سے پہلے یہ دونوں سلسلے آپس میں نہیں ملتے. لہٰذا یہ دعویٰ بھی تاریخی دلیل کا محتاج ہے کہ برناوی خاندان رامپور منہیاران میں بھی دو سو برس تک رہا پھر اس کے افراد ادھر ادھر نکلنے شروع ہوئے اور کچھ لوگ گنگوہ بھی گئے جہاں اس خاندان کے افراد میں سے ایک شخص، شیخ عبدالرشید کے والد فضیل محمد ایک خانگی لڑائی میں مارے گئے اس وجہ سے ان کی والدہ عبدالرشید کو اپنے میکہ سہارنپور لے آئیں اس وقت سے ایک عرصہ تک یہ خاندان سہارنپور مقیم رہا. اس دعوے میں برناوی اور سہارنپوری روایات خلط ملط کردی گئیں. بیان کا آخری حصہ انصاریان سہارنپور کا ہے، خانوادہ برناوہ سے اس کا کوئی تعلق ثابت نہیں ہے.

انصاریان سہارنپور میں بعد میں ایک فرد شیخ غلام محمد ابن خواجہ شرف الدین کی شادی انبہٹہ میں شاہ ابوالمعالیؒ کے خاندان میں ہوئی جو سادات حسینی میں سے تھے. اسی وقت سے یہ شاخ، جس سے مولانا عبد اللہ انصاری انبہٹوی وابستہ ہیں، انبہٹہ میں آباد ہوئی. (٦) یہ درست ہے مگر اس سے برناوی شاخ سے انصار سہارنپور کا تعلق ثابت نہیں ہوتا. چنانچہ دو انصار خانوادوں کے باہم تعلق کے بارے میں یہ بیان لاعلمی پر مبنی ہے اور دونوں خانوادوں کے مطبوعہ شجروں پر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ غلط فہمی دور ہو جاتی ہے.

برناوی شجرۂ نسب

معروف برناوی شجرہ یہ ہے:

مخدوم علاء الدین ابن مخدوم نصیر الدین ابن مخدوم بدر الدین ابن مخدوم شرف الدین ابن خواجہ فضیل ابن خواجہ کلاں ابن خواجہ داؤد ابن خواجہ حامد ابن خواجہ جلال الدین ابن خواجہ سلیم ابن خواجہ اسمٰعیل ابن شیخ الاسلام ابو اسمٰعیل خواجہ عبداللہ انصاری ہروی.

مولوی محمد ضیاء الدین احمد علوی امروہی. مراۃ الانساب. جیپور. ۱۹۱۷ء. ص ۱۲۳.

اس کے مقابل سلسلۂ سہارنپور کے شیخ فضیل محمد اور شیخ عبدالرشید کا شجرہ پیر ہرات تک مطبوعہ موجود ہے. جو مولوی علوی امروہی کے بیان ہی کے مطابق حسب ذیل ہے:

خواجہ عبدالرشید ابن خواجہ فضیل محمد ابن خواجہ نظام الدین ابن خواجہ امین الدین عرف قاضی اَمَن ابن خواجہ فرید الدین ہروی ثم سہارنپوری ابن خواجہ محمد فاضل ابن خواجہ ہاشم (ثانی) ابن خواجہ علاء الدین ابن خواجہ رکن الدین (ثانی) ابن خواجہ نجم الدین ابن خواجہ شرف الدین (ثانی) ابن خواجہ عبدالحمید ابن خواجہ کبیر الدین ابن خواجہ رکن الدین (اول) ابن خواجہ شرف الدین (اول) ابن خواجہ تاج الدین ابن خواجہ منہاج الدین ابن خواجہ ہاشم بزرگ (اول) ابن شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری ہروی.

مولوی محمد ضیاء الدین احمد علوی امروہی. مراۃ الانساب. جیپور. ۱۹۱۷ء. ص ۱۲۳-۱۲۴.

اس دوسرے شجرہ میں اوپر تک سرسل - برناوہ کے کسی بزرگ کا نام وارد نہیں ہوا. بنا

بریں انصاریان سہار نپور کا سلسلۂ برناوہ سے صہری تعلق تو شائد نکل آئے، نسبی تعلق ثابت نہیں ہے. انصار سہار نپور کا ایک سلسلہ خواجہ فرید الدین ہروی سہار نپوری کی اولاد کا ہے.

دونوں شجروں کا صاف مطلب یہ ہے کہ پیر ہرات کی اولاد میں انصاریان سہار نپور ایک مستقل اور منفرد شاخ ہیں جس سے مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی کا تعلق ہے.

مولانا عبداللہ کا اپنا بیان

خواجہ عبد اللہ انصاری ہروی کے واسطے سے حضرت ابو ایوبؓ الانصاری تک اپنا سلسلہ نسب مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی نے خود لکھ کر **التحفۂ الصادقیہ** کے مؤلف مولانا مشتاق احمد انبہٹوی کو دیا تھا. (۷)

مولوی عبداللہ ابن مولوی انصار علی ابن شاہ احمد علی ابن شاہ قطب علی ابن شاہ غلام محمد ابن (نواب) شرف الدین خاں ابن غلام محی الدین ابن عبد الرشید ابن فضیل محمد ابن نظام الدین ابن قاضی امن ابن خواجہ فرید الدین ابن خواجہ محمد فاضل ابن خواجہ ہاشم ابن خواجہ علاء الدین ابن خواجہ رکن الدین ابن خواجہ نجم الدین ابن خواجہ شرف الدین ابن خواجہ عبدالحمید ابن کبیرا ابن خواجہ رکن الدین ابن شرف الدین ابن خواجہ تاج الدین ابن خواجہ منہاج الدین ابن خواجہ ہاشم بزرگ ابن خواجہ ابی اسماعیل عبد اللہ انصاری ہروی ابن خواجہ ابی منصور محمد ابن علی ابن محمد ابن احمد ابن علی ابن جعفر ابن ابی منصور مست ابن ابی ایوب خالد الخزرجی الانصاری (صحابی رسول) ابن زید ابن عبد مناف ابن غنم ابن حبیب ابن عباس ابن ہاشم. (۸)

مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے انصار خانوادۂ سہار نپور کے ایک نامور عالم مولانا خلیل احمد محدث سہار نپوری کی سوانح **تذکرہ الخلیل** میں لکھا ہے:

بہر حال حضرت قدس سرہ سلسلہ اجداد سے ایوبی نسل ہیں اور آپ کے جد رابع شاہ غلام محمد کا عقد چوں کہ حضرت سیدہ محفوظا بی بنت شاہ نظام الدین ابن شاہ محمد باقر ابن شاہ ابوالمعالی سے ہوا جن کے بطن سے شاہ قطب علی پیدا ہوئے اور یہی تعلق آپ کے اجداد کے قیام و توطن انبہٹہ کا سبب ہوا، لہذا آپ کو سلسلہ سادات کی

طرف انتساب حاصل ہوا اور اس غیر اختیاری شرافت حسبی و نسبی نے آپ کے کمالات علمیہ و عملیہ اور اخلاق طبعیہ و روحانیہ میں بے بہا اضافہ کر دیا۔(۹)

محدث سہارنپوری کی تصدیق

مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری نے اپنے بھتیجے اور مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی کے نواسے لطیف احمد الطف کو ان کے والد پروفیسر رشید احمد سالم انصاریؒ کے انتقال پر نسبی تحقیق کے جواب میں ایک خط لکھا تھا جو بجنسہ درج ذیل ہے:

رشید احمد مرحوم ساکن انبہٹہ ضلع سہارنپور انصار کے خاندان میں سے تھے۔ اس نواح کے انصاری خواجہ ابوایوبؓ کی اولاد میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کے اجداد اصل گنگوہ کے رہنے والے ہیں جو انبہٹہ سے پانچ کوس ہے۔ ان کے اجداد میں سے شیخ عبدالرشید کے والد (فضیل محمد) ایک خانہ جنگی میں مقتول ہوئے اس لئے ان کی والدہ ان کو اپنے میکہ سہارنپور میں لے آئیں اور ایک عرصہ تک سہارنپور میں رہیں۔ اس کے بعد ان کی اولاد میں سے شیخ غلام محمد کی شادی سید شاہ ابوالمعالیؒ کے خاندان میں ہوئی۔ اس کے بعد ان کی اولاد کا قیام انبہٹہ میں رہا۔ مرحوم (پروفیسر رشید احمد سالم انصاری) کے والد (شاہ مجید علی ابن شاہ احمد علی) کے دادا شاہ قطب علی صاحب انبہٹہ ہی میں رہے۔ چونکہ شاہ ابوالمعالی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سید تھے اس لئے شیخ غلام محمد کی جو اولاد سیدہ (محفوظاً) سے ہوئی وہ اپنے آپ کو غلطی اور بے علمی سے سید سمجھتے رہے۔ مرحوم (پروفیسر رشید احمد سالم انصاری) چونکہ پڑھے لکھے تھے اس لئے انہوں نے اس غلطی کو خلاف دیانت سمجھ کر اپنے لئے پسند نہیں کیا اور ہمیشہ اپنے آپ کو اپنے اجداد انصاریین کی طرف منسوب کرتے رہے۔(۱۰)

مولانا عاشق الٰہی میرٹھی۔ تذکرۃ الخلیل۔ ص: ۴۰-۴۱۔ دارالکتاب۔ دیوبند۔ ۲۰۰۳ء

لطیف احمد الطف ابن رشید احمد سالم انصاری ابن شاہ مجید علی کے نام اس خط کے پیش نظر انصاریان انبہٹہ/سہارنپور کے نسب پر مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری کا وہ شجرہ مزید روشنی ڈالتا ہے جو ریاست بہاولپور کے جامعہ عباسیہ کے شیخ الحدیث مولانا فاروق احمد ابن مولانا مفتی صدیق احمد ابن حبیب محمد ابن شاہ احمد علی ابن شاہ قطب علی نے مولانا عاشق الٰہی

میرٹھی کے پاس بھیجا تھا اور جو اسی زمانہ میں دارالعلوم مظاہر العلوم میں استاذ مولانا خلیل احمد کے نواس داماد مولوی مسعود علی نے ماہنامہ **المظاہر** میں شائع کروایا تھا۔ وہ شجرہ خلیلیہ حسب ذیل ہے:

(۱) مولانا شاہ خلیل احمد (۲) بن شاہ مجید علی (۳) بن شاہ احمد علی (۴) بن شاہ قطب علی (۵) بن شاہ غلام محمد (۶) بن شرف الدین خاں (پورا نام نواب شرف الدین خان تھا) (۷) بن غلام محی الدین (۸) بن عبدالرشید (۹) بن محمد فضیل (۱۰) بن نظام الدین (۱۱) بن امین الدین عرف قاضی امّن (۱۲) بن خواجہ فریدالدین (ہروی سہارنپوری) (۱۳) بن خواجہ محمد فاضل (۱۴) بن خواجہ ہاشم (۱۵) بن علاء الدین (۱۶) بن خواجہ رکن الدین (۱۷) بن خواجہ نجم الدین (۱۸) بن خواجہ شرف الدین (۱۹) بن عبدالحمید (۲۰) بن خواجہ کبیر (۲۱) بن خواجہ رکن الدین (۲۲) بن خواجہ شرف الدین (۲۳) بن خواجہ تاج الدین (۲۴) بن خواجہ منہاج الدین (۲۵) بن خواجہ ہاشم بزرگ (۲۶) بن خواجہ ابی اسمٰعیل عبداللہ انصاری (۲۷) بن خواجہ ابی منصور محمد (۲۸) بن علی (۲۹) بن محمد (۳۰) بن احمد (۳۱) بن علی (۳۲) بن جعفر (۳۳) بن ابی منصور مت (۳۴) بن ابی ایوب خالد الخزرجی الانصاری صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ قسطنطنیہ کی جنگ میں شہید اور وہیں مدفون ہوئے۔

مولانا عاشق الٰہی میرٹھی۔ **تذکرۃ الخلیل** ص:۴۱۔ دارالکتاب۔ دیوبند۔ ۲۰۰۳ء۔

انصار انبہٹہ کا سلسلہ نسب

محمد طارق الانصاری غازی نے اپنی کتاب **تذکار الانصار** میں انصاریان انبہٹہ کے مختلف شجروں کے متوازی مطالعہ سے ماخوذ مولانا عبداللہ انصاری کا یہ شجرہ نسب دیا ہے جو القاب کے جزوی فرق کے باوجود یہ بعینہ وہی ہے جو مولانا مشتاق احمد انبہٹوی کو خود مولانا عبداللہ انصاری نے دیا تھا:

مولانا عبداللہ انصاری ابن مولانا خواجہ انصار علی ابن مولانا خواجہ احمد علی ابن خواجہ شاہ قطب علی ابن شاہ غلام محمد ابن خواجہ شرف الدین (ثالث) ابن خواجہ غلام محی الدین ابن خواجہ عبدالرشید ابن خواجہ فضیل محمد ابن خواجہ نظام الدین ابن خواجہ امین الدین

عرف قاضی امّن ابن خواجہ فرید الدین ہروی ثم سہار نپوری ابن خواجہ محمد فاضل ابن خواجہ ہاشم (ثانی) ابن خواجہ علاء الدین ابن خواجہ رکن الدین (ثانی) ابن خواجہ نجم الدین ابن خواجہ شرف الدین (ثانی) ابن خواجہ عبدالحمید ابن خواجہ کبیر الدین ابن خواجہ رکن الدین (اول) ابن خواجہ شرف الدین (اول) ابن خواجہ تاج الدین ابن خواجہ منہاج الدین ابن خواجہ ہاشم بزرگ (اول) ابن شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری ہروی ابن خواجہ ابوالمنصو رمحمد (ثالث) بلخی ابن ابومعاذ علی (ثانی) ابن ابو عاصم محمد (ثانی) ابن احمد ابن علی (اول) ابن جعفر ابن ابوالمنصو رمحمد (اول) عرف منصورمت ابن سیدنا حضرت ابوایوبؓ خالد الانصاری ابن زید خزرجی.

محمد طارق الانصاری غازی. **تذکار الانصار** شذرہ مولانا عبداللہ انصاری ص ۳۴۰.

مولانا گنگوہی کا نسب نامہ

انصاریان سہارنپور کے ایک ممتاز بزرگ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نجیب الطرفین انصاری تھے. البتہ یہ واضح نہیں کہ ان کا پدری نسب کس پشت میں پیر ہرات خواجہ عبداللہ انصاری کے نسب سے ملتا ہے. مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ نے **تذکرۃ الرشید** میں خود حضرت گنگوہیؒ کے بیان کے مطابق سات پشتوں تک نام نقل کئے ہیں:

مولانا رشید احمد بن مولانا ہدایت احمد بن قاضی پیر بخش بن قاضی غلام حسن بن قاضی غلام علی بن قاضی علی اکبر بن قاضی محمد اسلم الانصاری الایوبی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین.

مولانا رشید احمد گنگوہی کے دادا قاضی پیر بخش مولانا عبداللہ انصاری کے پر دادا شاہ قطب علی کے پھوپی زاد بھائی تھے اور ہم نسب بھی تھے.

البتہ مولانا گنگوہی کا مادری سلسلۂ نسب - جو مولانا گنگوہی کے ماموں شیخ محمد شفیع انصاری نے مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کو ’’خاندانی شجرہ محفوظہ سے نقل کرایا‘‘ تھا - قاضی امن الدین عرف قاضی امن کی پشت پر مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی اور مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے شجرہ سے متصل ہو جاتا ہے. مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی اور مولانا خلیل احمد سہارنپوری قاضی امن کے صاحبزادہ خواجہ نظام الدین کی اولاد میں تھے اور والدۂ حضرت

گنگوہی قاضی امن کے دیگر صاحبزادہ محمد کبیر الانصاری کی اولاد میں تھیں. **تذکرۃ الرشید** میں قاضی امن سے اوپر کا جو شجرہ نقل ہوا ہے وہ یہ ہے:

. . . محمد کبیر ابن قاضی امن الدین عرف قاضی امن ابن خواجہ فرید ابن خواجہ شاہ بن خواجہ محمد فاضل ابن خواجہ ہاشم ابن خواجہ علاء الدین ابن خواجہ رکن الدین ابن خواجہ نجم الدین ابن خواجہ شرف الدین ابن خواجہ بڑا ابن خواجہ عبدالمجید (عبدالحمید) بن خواجہ کبیر ابن خواجہ رکن الدین ابن خواجہ شرف الدین ابن خواجہ تاج الدین ابن خواجہ منہاج الدین ابن خواجہ ہاشم بزرگ ابن اسماعیل ابن خواجہ عبداللہ ہراتی ابن خواجہ ابومحمد منصور ابن خواجہ علی ابن خواجہ محمد ابن خواجہ احمد ابن خواجہ جعفر ابن ابی منصور ابن ایوب ابن الشیخ ابی ایوب الانصاری. (۱۱)

شجروں میں فرق و اختلاف

مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی اور مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے شجروں سے موازنہ کیا جائے تو ان میں اور حضرت گنگوہی کے مادری شجرہ میں کچھ فرق نظر آتا ہے جس کی نشان دہی اور وضاحت مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ نے **تذکرۃ الخلیل** میں کر دی ہے:

. . . ہر دو منقول سلسلۃ الانساب میں اوپر چل کر کچھ اختلاف ظاہر ہو رہا ہے کہ گنگوہی شجرۃ الانساب میں خواجہ فرید الدین (۱۲) اور خواجہ محمد فاضل کے درمیان خواجہ شاہ کا اور (۱۸) خواجہ شرف الدین و خواجہ عبدالحمید کے درمیان خواجہ بڈا (بڑا) کا توسط زائد ہے جو انبہٹوی نقل میں نہیں ہے. نیز اس میں (۱۹) خواجہ عبدالحمید ہے اور گنگوہی نقل میں خواجہ عبدالمجید (لکھا) ہے. اسی طرح اس میں (۲۵) خواجہ ہاشم بزرگ بن خواجہ ابی اسمٰعیل عبداللہ ہے اور گنگوہی نقل میں خواجہ ہاشم بن خواجہ اسمٰعیل بن خواجہ عبداللہ ہراتی ہے اور (۳۳) ابومنصور مت و حضرت ابو ایوب کے درمیان حضرت ایوب بن ابی ایوب کا توسط زائد ہے جو کثرت نقول میں کاتب کی زلت قلم (بھول، غفلت) سے اکثر ہو جاتا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ صواب اِس نقل میں ہے یا اُس نقل میں.

مولانا عاشق الٰہی میرٹھی. **تذکرۃ الخلیل** ص:۴۲. دار الکتاب. دیوبند ۲۰۰۳ء.

اس علاوہ بھی مولانا عبداللہ انصاری کے شجرہ میں نویں نمبر پر ''فضیل محمد ابن نظام الدین'' کا نام مولانا خلیل احمد کے شجرہ میں ''محمد فضیل (۱۰) بن نظام الدین'' درج کیا گیا ہے. مولانا عبداللہ انصاری کے پڑ پوتے.ڈاکٹر عابداللہ غازی نے اپنی اولاد کے لئے انگریزی میں جو خاندانی شجرہ مرتب کیا ہے اس میں بھی یہ نام ''محمد فضیل'' ہی لکھا ہے، ان کے چھوٹے بھائی محمد طارق غازی نے اپنی پوتیوں کے لئے انگریزی میں جو خاندانی شجرہ نسب مرتب کیا ہے اس میں ''فضیل محمد'' لکھا ہے. یہ فرق بھی اوپر کسی مرحلہ پر بظاہر سہو کتابت سے پیدا ہوا ہے. مولوی محمد ضیاء الدین احمد علوی امروہی نے **مرلۃ الانساب** (ص۱۲۴) میں ایک چھوٹے سے دائرہ میں یہ نام دو سطروں میں یوں لکھا ہے کہ اوپر سے پڑھیں تو محمد فضیل اور نچلی سطر سے پڑھیں تو فضیل محمد بنتا ہے. اردو خط شکستہ میں سطر میں گنجائش کم ہو تو سطر نیچے سے اوپر کی طرف صعود کرتی ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سہ سطری مہر پر **محمد رسول الله** میں **محمد** اس کے اوپر **رسول** اور سب سے اوپر **الله** لکھا گیا تھا. اس اصول سے شجرۂ انصاریان سہارنپور میں یہ نام فضیل محمد ہے.

مزید یہ کہ **تذکرۃ الرشید** میں مولانا رشید احمد گنگوہی کے مادری شجرہ میں ہاشم بزرگ کو اسماعیل کا بیٹا اور پیر ہرات کا پوتا لکھا ہے، جبکہ متداول تمام دیگر شجروں میں بشمول **مراۃ الانساب** کے انصاریان سہارنپور کے نسب میں اسماعیل ابن خواجہ عبداللہ ہروی کا نام نہیں آتا اور خواجہ ہاشم بزرگ کو خواجہ عبداللہ انصاری ہروی کا پوتا نہیں بیٹا لکھا جاتا ہے.

مولانا عبداللہ انصاری کا ذکر کرتے ہوئے ان کے ماموں مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ ابن مولانا مملوک علی نانوتویؒ نے لکھا ہے کہ:

> میاں پیر جیو مولوی عبد اللہ صاحب. یہ احقر کے ہمشیرہ زاد ہیں اور اولاد میں شاہ ابوالمعالی انبہٹوی کے، بیٹے ہیں مولوی انصار علی صاحب کے. (۱۲)

قطبِ وقت شاہ ابوالمعالیؒ چشتی صابری انبہٹوی سے مولانا عبد اللہ انصاری کا رشتہ یہ ہے کہ مولانا انصاری کے پردادا کے والد شاہ غلام محمد کا نکاح شاہ ابوالمعالی کی پر پوتی محفوظا بنت شاہ نظام الدین ابن شاہ محمد باقر ابن حضرت شاہ ابوالمعالی سے ہوا تھا.

بزرگان خاندان

مولانا عبداللہ انصاری کے پڑداداشاہ قطب علی ابن شاہ غلام محمد صاحبِ اجازت وارشاد بزرگ تھے ان کے ایک بیٹا اور سات لڑکیاں تولد ہوئیں، اور کچھ کمسنی ہی میں فوت ہوگئیں، بعض کی شادیاں شیوخ ساڈھورہ میں ہوئیں. بڑی تمناؤں کے بعد اللہ نے فرزند دیا تو نام احمد علی رکھا گیا. ان کو اللہ تعالیٰ نے بڑا صاحب نصیب بنایا. ان کے چھ بیٹے ہوئے:

محمد علی، محمد نواز، مجید علی، انصار علی، احمد حسن، حبیب محمد. (۱۴)

ان تمام بھائیوں میں مولانا انصار علی اور شاہ مجید علی لیاقت وکمالات نیز اپنی فاضل اور قابل فخر اولاد کی وجہ سے اپنے خاندان اور ہم عصروں میں ممتاز اور قابل قدر تھے. ان دونوں بھائیوں کے مختصر تعارف سے اس کا خاندان کا اجمالی تعارف ہوتا ہے.

شاہ مجید علی کی اولاد

شاہ مجید علی ابن شاہ احمد علی نیک طینت اور صفات وکمالات رکھتے تھے. صاحبِ علم وفضل اور متقی، پرہیز گار شخص تھے. حضرت مولانا محمد مظفر الدین کاندھلوی سے بیعت تھے. وہ بھی اپنے بھائی مولانا انصار علی کی طرح کسی ریاست میں اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے. زیادہ عمر نہیں پائی. دوشنبہ ۲۲ر ربیع الاول ۱۳۰۱ھ مطابق ۲۱ر جنوری ۱۸۸۴ء کو وفات ہوئی تھی. تاریخ ولادت اور انتقال کے وقت عمر کا علم نہیں ہوسکا.

شاہ مجید علی کے تین بیٹے ہوئے تھے حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری، مولانا نذیر احمد اور مولانا پروفیسر رشید احمد سالم انصاری. تینوں عالم فاضل اور صاحب کمالات تھے. ان میں مولانا خلیل احمد اور پروفیسر رشید احمد سالم زیادہ مشہور ہوئے.

محدث سہارنپوری

مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری اور مولانا عبداللہ انصاری چچیرے بھائی بھی تھے اور خلیرے بھائی بھی کیونکہ اوپر کی نسل میں دو بھائیوں شاہ مجید علی اور مولانا انصار علی کی

شادیاں مولانا مملوک علی کی بیٹیوں مبارک النسا اور نجیب النساء سے بالترتیب ہوئی تھیں.

شاہ مجید علی کے صاحبزادوں میں بڑے مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری تھے. ان کی ولادت باسعادت صفر ۱۲۶۹ھ/ دسمبر ۱۸۵۲ء میں ہوئی تھی. چند ماہ دارالعلوم دیوبند میں پڑھا پھر دارالعلوم مظاہر علوم سہارنپور میں داخلہ لے لیا. وہیں سے فارغ التحصیل ہوئے. مولانا رشید احمد گنگوہی سے بھی تعلیم حاصل کی اور انہی سے بیعت بھی ہوئے. مولانا گنگوہی اور حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی نے اجازت اور خلافت سے نوازا. حضرت مولانا خلیل احمد محدث اپنے عہد میں علمائے دیوبند کے پیشوا، جلیل القدر عالم، ممتاز فقیہ، عظیم المرتبت شیخ اور محدث کبیر تھے. دیوبند میں مدرس دوم رہے بعد میں مظاہر علوم کی دینی، علمی ترقی اور پذیرائی میں حضرت مولانا خلیل احمد کی توجہ اور محنت کا خاص حصہ ہے.

عربی زبان میں صحاح ستہ کی اہم کتاب **سنن ابو دائود** کی شرح **بذل المجهود فی شرح ابو دائود** مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری کی بہت بڑی دینی خدمت اور شہرۂ آفاق علمی کارنامہ ہے. اس کے علاوہ اور بھی تصانیف و مؤلفات ہیں. ان کے منتشر فتاویٰ بھی ایک جلد میں مرتب ہو کر شائع ہو چکے ہیں.

مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری شوال ۱۳۴۴ھ/ اپریل ۱۹۲۷ء میں ہجرت کی نیت سے سہارنپور سے مدینہ منورہ حاضر ہوئے. مدینہ پاک میں ڈیڑھ سال مہاجرانہ قیام کے دوران **بذل المجهود** کی تالیف مکمل کی. جس دن کتاب مکمل ہوئی اسے روضہ مبارک پر پیش کرنے کے لئے حاضر ہوئے. اگلے دن ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ/ ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۷ء کو جو مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور سے ان کی رخصت کا آخری دن تھا مدینہ منورہ میں وفات ہوئی. اپنی تمنا کے مطابق بقیع میں دفن کیے گئے. (۱۴)

مولانا نذیر احمد انبہٹوی

مولانا نذیر احمد ابن شاہ مجید علی نے اپنے خاندانی بزرگوں اور ہم عصروں کی طرح دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے کثیر علمی اور روحانی

استفادہ کیا۔حدیث شریف کی اعلیٰ کتابیں مولانا گنگوہی سے پڑھیں اوران سے بھی سنداور اجازت حدیث حاصل کی.وہ بھی حضرت حاجی امداد اللہ (۱۵) سے سلوک و معرفت میں وابستہ ہوئے تربیت واصلاح کے بعد حضرت حاجی امداداللہ نے اجازت بیعت وخلافت سے نوازا.اسی اثنامیں حرمین شریفین کی حاضری کا شوق ہوااور ہجرت کی نیت سے مکہ مکرمہ کا سفرکیا.حرم محترم میں حاضری کو بہت وقت نہیں ہوا تھا کہ آرزو کے مطابق وہیں ارض مقدس میں وفات ہوگئی. مولانا نذیر احمد کا ذکر حضرت حاجی امدادا للہ،مولانا رشید احمد گنگوہی اورمولانا خلیل احمد سہارنپوری کے مطبوعہ اورغیرمطبوعہ مکتوبات میں کئی جگہ آیاہے.انہی اجمالی ارشادات کی مدد سے یہ سطور مرتب کی گئی ہیں.ان کے سنین ولادت ووفات،عمراور باقی حالات زندگی وغیرہ کے بارے میں مزید معلومات حاصل نہیں ہوسکیں.

رشیداحمد سالم انصاری

شاہ مجید علی کے سب سے چھوٹے صاحبزادے مولانا پروفیسر رشید احمد سالم انصاری نے اپنے چچیرے بھائی مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی اوراپنے حقیقی بڑے بھائی مولانا نذیر احمد سے تعلیم حاصل کی.بہت ذی استعداد عالم خصوصاً فارسی میں یگانہ روزگار تھے.ایم.اے.او.کالج علی گڑھ میں شعبہ فارسی کے سربراہ تھے.عدم تعاون کی تحریک کے دور میں علی گڑھ کالج کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے رفیق ہوگئے تھے.بعد میں جب جامعہ ملیہ اسلامیہ کو دہلی منتقل کیا گیا تو پروفیسر رشید احمد سالم انصاری بھی دہلی آگئے. پوری زندگی اعلیٰ درجہ کی علمی خدمات اور تحقیق وتصنیف میں مشغول رہے.مخطوطات کے ذوق،ان کی تلاش ودریافت اور پرکھ میں ممتاز تھے.علامہ سید سلیمان ندوی کا قول ہے کہ ”قلمی کتابوں کی تلاش وجستجو میں انہوں نے ہندستان کا گوشہ گوشہ چھان ڈالاتھا“.

فارسی کی اعلیٰ درجہ کی کئی کتابوں کی تحقیق وتصیح کی،ان پر مقدمے لکھے اوران کو شائع کرایا،عربی کی بھی کئی کتابوں کے ترجمے کیے جوشائع ہوئے اوران کوشہرت اوراعتماد بھی حاصل ہوا.امیرخسرو کی تصانیف میں سے **بدیع العجائب** اورمثنوی **دول رانی اور**

خضر خاں مرتب کیں اوران پر فاضلانہ مقدمے لکھے. مؤخرالذکر کا مقدمہ ایک سودس صفحات پر مشتمل ہے. یہ دونوں کتابیں نواب اسحاق خاں کے منصوبۂ اشاعت تصانیف امیر خسرو کے لئے لکھی گئی تھیں، جو ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۷ء میں شائع ہوئیں. مولانا رشید احمد سالم انصاری نے **جہانگیر نامہ** کو قلمی نسخوں کی مدد سے صحیح اور مرتب کیا تھا جو فارسی زبان میں مولانا رشید احمد انصاری کا آخری بڑا علمی کام تھا. ان کے علاوہ عربی کی متعدد اہم کتابوں مثلاً حضرت شاہ ولی اللہ کی **الفوز الکبیر**، شیخ فرید وجدی کی **المدینة والاسلام**، نیز **النصرانیه والاسلام** اور **کتاب التوحید** وغیرہ کے اردو ترجمے کئے جو بہت مقبول ہوئے. چند اور کتابوں کے بھی ترجمے کئے تھے. علی گڑھ میں قائم مشہور اشاعتی مرکز مطبع احمدی کے آپ مالکان میں سے تھے.

پروفیسر رشید احمد سالم انصاری کا نکاح مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی کی بڑی صاحبزادی امت السلام سے ہوا تھا جن سے دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہوئیں. لطیف احمد الطف اور ڈاکٹر حنیف احمد بیٹے تھے. امت الاسلام کے علاوہ مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی کی باقی دو چھوٹی بیٹیاں ام کلثوم اور امت المنان تھیں.

محرم ۱۳۴۰ھ/ستمبر ۱۹۲۲ء میں دہلی میں مولانا رشید احمد سالم انصاری کی وفات ہوئی. وہیں تدفین ہوئی. مولانا سید سلیمان ندوی نے ان کی وفات کو بڑا علمی حادثہ قرار دیا تھا. (۱۶)

مولانا انصار علی

شاہ احمد علی کے چوتھے صاحبزادے مولانا انصار علی، عالم، فاضل اور ذی استعداد شخص تھے. دہلی میں مولانا مملوک علی سے تعلیم حاصل کی. مولانا مشتاق احمد انبہٹوی کی اطلاع کے مطابق مدینہ منورہ جاکر حدیث پڑھی تھی. (۱۷) مدینہ منورہ کا یہ سفر ۱۸۵۷ء (۱۲۷۴ھ) کے بعد اس وقت ہوا تھا جب حضرت شاہ عبدالغنی مجددی ہندستان سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے تھے. حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے متوسلین میں اس وقت کے اکثر علماء - مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی،

مولانا محمد احسن نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی - نے حضرت شاہ عبدالغنی مجددی سے حدیث شریف پڑھی اوراس کی اجازت لی تھی. اس وقت شاہ عبدالغنی مجددی ابھی دہلی میں تشریف رکھتے تھے. مگر جب مولانا انصار علی کے حدیث پڑھنے کا وقت آیا اس وقت حضرت شاہ عبدالغنی مجددی ہندستان سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ حاضر ہو چکے تھے. اس لئے مولانا انصار علی اپنے سلسلہ حدیث وتعلیم کو مکمل کرنے کے لئے استاد محترم کی خدمت میں مدینہ طیبہ حاضر ہوئے وہاں رہ کر حدیث پڑھی اور اجازت وسند حاصل کی.

مولانا انصار علی ریاست گوالیار میں مدار المہام یا صدر الصدور تھے. تا عمر اسی عہدے پر رہے. (۱۸) ان کی ولادت تقریباً ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء میں ہوئی تھی اور انتقال تقریباً ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۴ء میں ہوا. (۱۹) مدفن معلوم نہیں ہے.

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے وقت جنرل بخت خان نے انگریزوں کے خلاف جو فتویٰ تیار کروایا تھا اس پر مولانا انصار علی کے بھی دستخط تھے.

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک ریسرچ اسکالر ڈاکٹر عامر صمدانی نے ۲۰۰۱ء میں ادارہ اساس علی گڑھ کو مطلع کیا تھا کہ انہوں نے مولانا انصار علی کے ہاتھ کا ایک مسودہ دہلی میں کسی کباڑی کے پاس دیکھا تھا جس کے لئے بقول ان کے ایک کثیر رقم طلب کی گئی تھی. ادارہ اس مسودہ تک پہنچنے میں ناکام رہا اور وہ حاصل نہ ہوسکا.

اولاد مولانا انصار علی

کہتے ہیں مولانا انصار علی صاحب کا نکاح حضرت مولانا مملوک العلی کی صاحبزادی اکرام النساء سے ہوا. تاہم مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کا بیان مختلف ہے. انہوں نے **تذکرۃ الخلیل** میں لکھا ہے کہ مولانا مملوک علی کی دوسری صاحبزادی مسماۃ نجیب النساء حضرت (مولانا خلیل احمد) کے چچا مولوی انصار علی صاحب کے عقد نکاح میں آئیں. دراصل اکرام النساء مولانا محمد قاسم نانوتوی کی بڑی صاحب زادی تھیں جن کا نکاح مولانا انصار علی کے صاحبزادے مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی سے ہوا تھا. یعنی اکرام النساعرف اکراماً مولانا

انصار علی کی بہو تھیں.

مولانا مملوک علی کی بڑی صاحبزادی مبارک النساء کا نکاح شاہ مجید علی ابن شاہ احمد علی سے ہوا تھا اور وہ مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری کی والدہ ماجدہ تھیں. (۲۰)

شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ نجیب النساء بیوہ ہوگئی تھیں .ان کا پہلا نکاح مولانا مملوک العلی کے خانوادہ کے ایک شخص حافظ محمود خلف حکیم غلام محی الدین نانوتوی سے ہوا تھا مگر عین عالمِ جوانی میں سفر حج سے واپسی کے وقت دہلی کے قریب حافظ محمود کی وفات ہوگئی تھی. (۲۱) ان کا دوسرا نکاح مولانا انصار علی سے ہوا. حافظ محمود سے نجیب النساء کی غالباً کوئی اولاد نہیں تھی. مولانا انصار علی سے تین بیٹے ہوئے. احمد حسین، عبدالرحمٰن اور عبداللہ.

دارالعلوم دیوبند کی روداد کے ایک اندراج سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عبداللہ ان میں سب سے چھوٹے تھے، احمد حسین اور عبدالرحمٰن کے سنین ولادت و وفات، تعلیم اور اولاد کسی کا تذکرہ دریافت نہیں ہوا مولانا عبداللہ انصاری اپنے دور میں معروف ہو گئے تھے.

مولانا عبدالرحمٰن انصاری

مولانا عبدالرحمٰن ابن مولانا انصار علی اور ان کے ایک نامعلوم الاسم صاحبزادے کا ذکر مولانا عبدالرحمٰن کے رشتہ کے پر پوتے ڈاکٹر عابداللہ غازی نے ۲۰ جولائی ۲۰۰۳ء کی ایک یادداشت میں کیا ہے.

> میرے بچپن میں مولانا عبدالرحمٰن کی اولاد سہارنپور میں مقیم تھی. ان کے ایک صاحبزادے انگریزوں کی سی آئی ڈی (خفیہ پولس) میں تھے اور علماء پر، خاص طور پر والد صاحب مولانا حامد الانصاری غازی پر، متعین تھے. ان کی کوششوں سے بہت سے علماء مصائب و ابتلاء سے بچے. والد صاحب کو بھی وہ خاموشی سے صورتِ حال سے مطلع کر دیتے تھے.
>
> میری ملاقات ان سے نوشہرہ پاکستان ۱۹۸۴ء میں چچا میاں (قاری حمید میاں انصاریؒ) کی معرفت ہوئی جہاں وہ اپنی بیگم اور متبنی بچیوں کے ساتھ رہتے تھے. انہوں نے اپنے متعدد واقعات سنائے تھے کہ کس طرح انہوں نے مختلف

موقعوں پر علماء کو بچایا. میری واپسی پر والد صاحب نے ان کے بیان کی تصدیق کی اوران کے کردار کی تعریف کی. وہ والد صاحب کے ہم عمر تھے لیکن والد صاحب اور چچا میاں انھیں چچا کہتے تھے.

حواشی

۱- ہندستان میں پیر ہرات کے واسطہ سے جو انصاری خاندان ہیں ان کا نسب حضرت منصور مت (قاضی القضاۃ ماوراء النہر) کے واسطہ سے حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے ملتا ہے. جدید معلومات کی تفصیلات کے لئے دیکھیے: سائد بکداش. **الامام الفقیه المحدث محمد عابد السندی الانصاری، رئیس علماء المدینة المنورہ** ص۴۶-۸۶. دار البشائر الاسلامیہ، بیروت. ۱۴۳۲ھ.

۲- بارہ بنکوی، شیخ الطاف الرحمن. **احوال علمائے فرنگی محل**. ص۸. مطبع مجتبائی لکھنؤ: بلا سنہ.

۳- بارہ بنکوی. **احوال علمائے فرنگی محل**. علمائے پانی پت، کیرانہ، سنبھل، برناوا اور فتحپور اور اہل سہالی بھی انہی کی اولاد میں ہیں.

۴- برناوہ کے مشائخ اور اہل کمال کے حالات پر شیخ علاء الدین برناوی (وفات ۱۰۸۸ھ/ ۱۶۷۷ء) نے گیارہویں صدی ہجری کے وسط میں ایک بڑی کتاب **چشتیہ بهشتیہ** کے نام سے لکھی تھی. اس کے نسخے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں. اس کی ایک عمدہ تلخیص کے مرتب کا نام معلوم نہیں. اس کا ایک نسخہ جو ۱۹ جمادی الثانی ۱۱۹۸ھ/ مئی ۱۷۸۴ء کا لکھا ہوا ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے. برناوہ کے مشائخ کی ایک شاخ موضع راپڑی ضلع مین پوری چلی گئی تھی جس کے حالات پر ایک مستقل کتاب **خلاصہ تاریخ راپڑی، یا گنجینۂ عرفان** کے نام سے وصال محمد خان نے لکھی تھی جو ۱۳۲۷ھ/ ۱۹۰۹ء میں میرٹھ سے چھپی تھی اس کا بھی ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں ہے.

۵- اس سلسلہ کے گل سر سبد اور آفتاب عالم تاب شخصیت علامہ شیخ بدر الدین برناوی تھے جو حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے خلیفہ اور خدمت دین، مرجعیت و مقبولیت اور قوت تاثیر میں اپنے عہد کی ایک غیر معمولی شخصیت تھے. ان کی اولاد میں کئی بڑے مشائخ اور اہل کمال پیدا ہوئے. تفصیلات کے لیے دیکھئے **تذکرہ مشائخ چشتیه بهشتیه**.

۶- اپنی شاخ کی وضاحت انبہٹہ کے دوسرے انصاری خاندان سے امتیاز کے لئے کی ہے. انصاریان انبہٹہ کی دو شاخیں ہیں اور دونوں کا نسب پیر ہرات خواجہ عبداللہ انصاری تک پہنچتا ہے. ایک شاخ شاہ غلام محمد سے چلتی ہے جو شاہ ابو المعالی کے خاندان کے داماد تھے اور اس نسبت سے شاہ غلام محمد کی اولاد پیر

زادگان کہلائی. دوسری شاخ کا نسب شیخ ناصر الدین جالندھری کے واسطہ سے خواجہ عبد اللہ انصاری ہروی پہنچتا ہے اور یہ شاخ شیخ الاسلام ہروی کی نسبت سے شیخ زادگان کہلاتی ہے. تفصیلات کے لئے دیکھئے مولانا مشتاق احمد انبہٹوی. **التحفة الصادقيه.**

۷- انبہٹوی، مولانا مشتاق احمد. **التحفة الصادقيه.** نسب نامہ انصاریان انبہٹہ ص:۱۵-۱۶.

۸- ایضاً.

۹- میرٹھی، مولانا عاشق الٰہی. **تذکرہ الخلیل** ص:۳۳. سہارنپور. ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء.

۱۰- یہ عبارت حضرت مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری کے مملوکہ نسخہ پر خود ان کے قلم سے تحریر ہے. ان کا مملوکہ نسخہ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں ہے اور اس نسخے کا مکمل عکس راقم کے پاس ہے. - کاندھلوی.

۱۱- میرٹھی، مولانا عاشق الٰہی "**تذکرة الرشید** ص ۱۳-۱۴. سہارنپور. ۱۹۷۷ء.

۱۲- مجموعہ مکتوبات مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی مکتوب ص:۸۵ (طبع اول، مطبع احمدی علی گڑھ)

۱۳- میرٹھی'. **تذکرة الخلیل**. سہارنپور. ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۵ء.

۱۴- مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: **تذکرة الخلیل**. شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا اور مولانا اخلاق احمد انبہٹوی نے **تذکرة الخلیل** کی بعد کی اشاعتوں میں بعض واقعات اور سنین کی ترتیب کے سلسلے میں وضاحت کی ہے. **تذکرة الخلیل** دستاویزی اہمیت رکھتی ہے. اس موضوع پر مولانا محمد ثانی حسنی کی **حیات خلیل** کا ماخذ بھی **تذکرة الخلیل** ہے.

۱۵- حاجی امداد اللہ. **مرقومات امدادیہ**، مکتوب ۲۵ ص:۶۰. دہلی.

۱۶- ندوی، مولانا سید سلیمان. **یاد رفتگان**. ص:۴۴ کراچی. ۱۹۵۵ء.

۱۷- انبہٹوی، مولانا مشتاق احمد. **انوار العاشقین**. ص:۱۳۶. لاہور. ۱۳۹۸ھ.

۱۸- میرٹھی. **تذکرة الخلیل**. ص:۳۸.

۱۹- غازی، محمد طارق. **تذاکر الانصار**. اقرا ایجوکیشن فاؤنڈیشن ممبئی. ۲۰۱۸ء.

۲۰- میرٹھی. **تذکرة الخلیل**. ص:۴۴. دیوبند ۲۰۰۳ء

۲۱- تھانوی، شیخ محمد. **انوار محمدی**، حاشیہ ص:۴۵. مطبع ضیائی. میرٹھ ۱۲۹۲ھ.

باب : ۲

تعلیمی سفر

مولانا عبداللہ انصاری کی تاریخ ولادت تو معلوم نہیں لیکن شواہد کی روشنی میں ان کا سال ولادت ۱۸۵۲ء ہے. ان کے ماموں مولانا محمد یعقوب نانوتوی نے ایک خط میں لکھا ہے کہ:

مولوی عبداللہ کی عمر بیس اکیس برس کی ہے. (۱)

یہ خط ۱۱ جمادی الاول ۱۲۸۸ھ (۲۹ جولائی ۱۸۷۱ء) کا لکھا ہوا ہے. اس اطلاع کی روشنی میں مولانا عبداللہ انصاری کی پیدائش ۱۲۶۷ھ یا ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۰ء یا ۱۸۵۱ء) میں ہوئی تھی. دیگر خاندانی روایات کے مطابق سنہ ولادت ۱۸۵۲ء تھا اور انتقال ۱۹۲۵ء/ ۱۳۴۴ھ (محرم سے ربیع الاول کے درمیان) ۷۳ برس کی عمر میں ہوا تھا. اس حساب سے سال ولادت ۱۸۵۲ء اور عمر بحساب سنہ ہجری عمر ۷۶ سال قرار پاتی ہے.

ابتدائی تعلیم

ابتدائی تعلیم اپنے والد مولانا انصار علی اور اپنے ماموں مولانا محمد یعقوب نانوتوی سے حاصل کی مختلف روایتوں سے بھی یہ معلوم ہوا ہے کہ انھوں نے اس دور میں **شرح ملا**، **شرح جامی**، اور **قطبی** کی تعلیم حاصل کی. اس کا ثبوت یہ ہے کہ دارالعلوم میں داخلے کے وقت وہ یہی کتابیں پڑھ رہے تھے. جب مولانا خلیل احمد تقریباً ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۴ء) میں مولانا انصار علی صاحب کے پاس گوالیار پہنچے اس وقت مولانا عبداللہ انصاری بھی وہیں تھے. دونوں ہر وقت ساتھ رہے اس وقت مولانا عبداللہ کی عمر تقریباً بارہ سال ہوگی. والد صاحب سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے ماموں مولانا محمد یعقوب کی نگرانی و تربیت میں آگئے تھے. مولانا یعقوب صاحب نے مذکورہ بالا خط میں یہ بھی لکھا ہے کہ ''احقر سے ہی اکثر پڑھا ہے''. مولانا محمد یعقوب نے ایک اور جگہ مولانا عبداللہ انصاری کا

تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

یہ احقر کے ہمشیرہ زاد ہیں. احقر سے اکثر کتابیں پڑھی ہیں اور جناب مولوی (محمد قاسم) صاحب سے پڑھا ہے. (۲)

دیوبند کا تعلیمی سفر

مولانا عبداللہ کی تعلیم جاری تھی کہ دیوبند میں عربی مدرسہ دارالعلوم کی ابتداء ہوگئی اوراس کے آغاز کے ابتدائی مہینوں میں مولانا محمد یعقوب نانوتوی کو صدر مدرس کی خدمات کے لئے دیوبند آنے کی دعوت دی گئی. مولانا محمد یعقوب ان دنوں بریلی میں تھے اور ڈیڑھ سو روپے ماہانہ تنخواہ پارہے تھے. دارالعلوم کی طرف سے بلاوا آیا تو وہ ملازمت چھوڑ کر دیوبند آگئے اور نئے مدرسہ کی خدمت وترقی اور تعلیم میں مشغول ہوگئے. مولانا محمد یعقوب کے ساتھ مولانا عبداللہ انصاری بھی دیوبند آگئے تھے جو مولانا یعقوب کے بھانجے ہونے کی وجہ سے گھر کے ایک فرد تھے اور مولانا یعقوب کی نگرانی اور تربیت میں تھے.

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ

دیوبند میں ایک دینی اسلامی مدرسہ قائم کرنے کے لئے پہلا اجلاس ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ (۳۰ مئی ۱۸۶۶ء) کو منعقد ہوا تھا. اس کے چند دن بعد تعلیم کی ابتداء ہوگئی تھی. پہلے مدرس ملا محمود دیوبندی تھے اور اول اول جن طلبہ نے مدرسہ میں اندراج کرایا ان میں مولانا عبداللہ انصاری بھی شامل تھے. مدرسہ کی سال اول کی روداد میں مدرسہ کے طالب علموں کے نام چھپے ہیں. اس فہرست میں مولانا عبداللہ انصاری کا نام موجود ہے.

تعلیم کا پہلا سال ۱۲۸۳ھ

پہلے تعلیمی سال محرم الحرام تا شعبان ۱۲۸۳ھ (مئی ۱۸۶۶ - جنوری ۱۸۶۷) کا سالانہ امتحان شعبان میں ہوا، امتحان لینے والوں میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا ذوالفقار علی دیوبندیؒ اور ان کے بھائی مولانا مہتاب علیؒ شامل تھے. تینوں نے تمام طلبہ کا امتحان لیا. تعلیم کے طریقے اور طلبہ کی علمی لیاقت سے خوش ہوئے اور رپورٹ میں لکھا:

ہم نے کئی روز تک امتحان مفصل ہر دفعہ کا لیا اور حتی الوسع سوالات مشکل پوچھے اور نمبر ہر طالب علم کے ہر ایک کتاب کے بابت لگائے. حال مدرسہ بالعموم قابلِ تعریف پایا. مدرسان کی سعی اور طلبہ کی محنت اس امتحان سے بخوبی ثابت ہے. ہم کارگذاری مدرسان سے نہایت خوش ہیں. (۳)

اس سال کی روداد میں یہ ذکر تو نہیں کہ کس طالب علم نے کیا کیا اور کتاب کہاں سے کہاں تک پڑھی لیکن روداد میں ہر ایک طالب علم کا نام اور امتحان میں حاصل کئے ہوئے نمبر اور امتحان میں ممتاز کامیابی پر ملنے والی انعامی کتابوں کا نام درج کیا گیا ہے.

مولانا انصاری کا اس طرح تذکرہ ہے:

پیر جی عبداللہ - انبہٹہ - نمبر ۱۸ - کتاب **سراجی**. (۴)

یعنی مولانا عبداللہ انصاری کو امتحان میں عمدہ اٹھارہ نمبر حاصل ہوئے اور مدرسہ کی طرف سے کتاب **سراجی** انعام میں دی گئی.

اگر چہ اس کا یہاں ذکر نہیں ہے لیکن دارالعلوم سے فارغ ہونے کے بعد مولانا عبداللہ انصاری کو جو سند دی گئی تھی اس میں صراحت ہے کہ جب وہ مدرسہ میں داخل ہوئے تھے تو اس وقت **شرح ملا جامی** پڑھتے تھے. اس وقت کی ایک زیر تعلیم کتاب **قطبی** کا بھی اسی سند سے علم ہوتا ہے. ممکن ہے کہ ایک دو کتابیں اور ہوں.

تعلیم کا دوسرا سال ۱۲۸۴ھ

مدرسہ کے ذمہ داروں نے اول دن یہ طے کر لیا تھا کہ مدرسہ کی سالانہ کارگذاری، آمد و خرچ کا حساب، طلبہ اور تعلیم کا جائزہ روداد کی صورت میں چھپا کرے گی. پہلے سال کی روداد کا ذکر آ چکا ہے. دوسرے سال کی روداد میں کچھ معلومات زائد ہیں. اس سال ان سب کتابوں کے ناموں کا وضاحت سے تذکرہ ہوا جن کا طلبہ نے امتحان دیا تھا اور انعامات بھی سال اول کی نسبت بڑے اور ایک سے زائد دیئے گئے تھے.

مولانا عبداللہ انصاری نے اس سال **کنز الدقائق**، **اصول الشاشی** اور **شرح وقایہ** کا امتحان دیا تھا. تینوں کتابوں میں اچھے نمبر حاصل کئے اور تینوں کے لئے

علیحدہ علیحدہ اور بڑا انعام حاصل کیا۔

روداد کا اندراج ملاحظہ ہو۔ (۵)

جن کتابوں کا امتحان دیا		جو کتابیں انعام میں ملیں
کنز الدقائق	۲۰	ترمذی شریف
اصول الشاشی	۱۹	حسامی
شرح وقایہ	۱۸	حاشیہ عبدالحق

تعلیم کا تیسرا سال ۱۲۸۵ھ

دارالعلوم دیوبند ایک نوعمر مکتب سے آہستہ آہستہ ترقی کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔ ہر نئے تعلیمی سال کے ساتھ طلبہ کی تعداد، زیر تعلیم کتابوں کی تعداد، اساتذہ اور مدرسہ کی مجموعی صلاحیت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ مدرسہ میں تیزی سے نئے طالب علم آرہے تھے اور جو طالب علم مدرسہ کی ابتداء کے بعد پہلے سال میں آگئے تھے وہ سب بھی موجود تھے۔ ان کی تعلیم اور لیاقت وصلاحیت منزل بہ منزل آگے بڑھ رہی تھی۔ جن طلبہ نے دوسرے سال میں **کنز، الدقائق** اور **اصول الشاشی** پڑھی تھیں ان کی چند کتابوں میں اضافہ ہوا۔ اس وقت چونکہ مرتب نصاب تعلیم اور تمام درجوں کے لئے مناسب طلبہ موجود نہیں تھے اس لئے کبھی کبھی ایک دو کتابوں کے اسباق دوبارہ بھی ہوتے تھے۔

اس سال مولانا عبد اللہ انصاری کے ساتھ یہی ہوا۔ انہوں نے ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۶-۱۸۶۷ء) میں **کنز الدقائق ، اصول الشاشی** اور شرح اور **شرح وقایہ** پڑھ لی تھی، ان میں اچھے نمبر بھی حاصل کئے تھے اور خاصا بھاری انعام بھی پایا تھا مگر پھر بھی مدرسہ کی انتظامیہ نے مولانا کو اس جماعت یا طلبہ کے ساتھ شامل کر دیا جو **اصول الشاشی** پڑھ رہی تھی۔

روداد میں وضاحت نہیں مگر نتائج میں طبیعت کا میلان دکھائی نہیں دیتا۔ ممکن ہے بیماری ہو یا طبیعت پڑھی ہوئی کتابوں کے دوبارہ سبقاً سبقاً پڑھنے پر تیار نہ ہوئی ہو۔ بہر حال

اس سال ان کے نصاب میں صرف **مختصر المعانی** کا اضافہ ہوا. روداد میں اس کا ذکر ہے، مگر امتحان کے نتیجہ اور انعام کا کچھ ذکر نہیں ہے.

تعلیم کا چوتھا سال ۱۲۸۶ھ

تعلیم کے چوتھے سال ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹-۱۸۷۰ء) میں مولانا عبداللہ انصاری کی تعلیمی ترقی کی رفتار گزشتہ برسوں سے بہتر اور خاصی تیز رہی. اس سال کی کتابیں بھی اعلیٰ درجوں کی تھیں اور امتحان میں نمبر بھی اب تک کے نتائج سے زیادہ بہتر حاصل کیے. اس سال انہوں نے **نفحته الیمن** سے **سنن ترمذی** تک طویل سفر یکلخت طے کرلیا. جو کتابیں اس سال پڑھیں ان میں **نفحته الیمن**، **شرح وقایه**، **نورالانوار**، **توضیح تلویح**، **مشکوٰۃ المصابیح** مکمل اور **سنن ترمذی** شامل تھیں. امتحان میں سب کتابوں میں کامیاب رہے جس میں سے اکثر میں انعام بھی ملا. تفصیل درج ذیل ہے.(٦)

کتاب پڑھی اور اس کا امتحان دیا	حاصل نمبران	انعام میں دی گئی کتاب
ترمذی شریف	۱۹-۳/۴	مسلم شریف
مشکوٰۃ شریف تمام	۱۹	حموی
توضیح تلویح تمام	۱۵-۱/۲	×
نورالانوار	۲۰-۱/۲	میبذی
شرح وقایه	۱۷-۳/۴	×
نفحۃ الیمن	۱۹-۱/۳	کلیلہ ودمنہ

تعلیم کا پانچواں سال ۱۲۸۷ھ

مدرسہ دیو بند اور اس کے طالب علموں میں علمی تعلیمی کارواں مرحلہ بہ مرحلہ آگے بڑھ رہا تھا. ہر نئے سال کے ساتھ پرانے طلبہ کی کتابوں میں ترقی ہوئی اور نئے طالب علم آئے. مولانا عبداللہ انصاری نے اپنی لیاقت وصلاحیت کے پرانے معمول کو باقی رکھا بلکہ

آگے بڑھایا۔اس سال انہوں نے جو کتابیں پڑھیں اگر چہ ان کی تعداد پچھلے سال کی کتابوں سے کم تھی مگر کتابوں کا درجہ اور علمی مرتبہ ظاہر ہے کہ سابقہ کتابوں سے بڑھ کر تھا اور ان کے امتحانات میں مولانا عبداللہ انصاری کو جو نمبر حاصل ہوئے وہ بھی کتابوں کی مناسبت سے پچھلے سال سے بڑھ کر تھے۔انہوں نے اس سال **ترجمہ حکایات** کی مشق کی، **مقامات حریری ،جلالین شریف ،سنن ابوداؤد اور صحیح بخاری** کا امتحان دیا اور سب میں بہترین نمبر حاصل کئے۔ سالانہ روداد کے گوشوارۂ امتحان میں نمبروں اور انعامات میں حاصل کتابوں کی تفصیل اس طرح ہے۔(۷)

جلالین شریف	۲۱-۱/۱	بیضاوی نصف اول
بخاری شریف	۲۱	نسائی شریف
ابوداؤد	۱۹-۴/۵	بیضاوی نصف آخر
مقامات حریری	۱۸-۱/۲	میرزاہد رسالہ
ترجمہ حکایات	۱۶	×

چھٹے سال کی تعلیم ۱۲۸۶ھ

مولانا عبداللہ انصاری کے تعلیمی سفر کے چھٹے سال (۱۲۸۷ھ) کی سرگذشت کچھ بہت طویل نہیں ہے۔اگر چہ اس سال بھی انہوں نے کتابیں پڑھیں اور ان کا امتحان دیا اور ان میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوئے مگر کسی وجہ سے زیر تعلیم کتابیں بہت کم تھیں۔ مدرسہ کی روداد میں اس سال صرف دو کتابوں میں شریک ہونے کا علم ہوتا ہے۔ان میں بھی عمدہ نتائج ہونے کی وجہ سے بڑی کتابیں انعام میں ملیں، تفصیل یہ ہے۔(۸)

جلالین شریف	۲۱-۱/۲	بیضاوی نصف اول
بخاری شریف	۲۰-۱/۲	درمختار

ساتواں تعلیمی سال ۱۲۸۸ھ

تعلیم کا مسافر ۱۲۸۷ھ سے گزر کر مدرسہ کے ساتویں سال میں داخل ہوا، اس سال تعلیم کی رفتار تیز اور کتابوں کی تعداد زیادہ رہی مولانا عبداللہ انصاری نے اپنی لیاقت اور اچھے نمبروں کا معمول باقی رکھا اور پچھلے سالوں کے مطابق تقریباً سب ہی کتابوں میں اعلیٰ یا متوسط اعلیٰ نمبر حاصل کئے. اس سال انہوں نے **سراجی ،بیضاوی، ابن ماجه ،سنن ابو دائود ،سنن نسائی** اور **صحیح بخاری** کے اسباق یا جماعتوں اور امتحانات میں شرکت کی اور یہ نمبر اور انعامات پائے.(۹)

ابوداوٗد		نفحۃ الیمن
نسائی		x
بیضاوی	۱۹	شرح الشرح

دارالعلوم سے فراغت ۱۲۸۹ھ

مولانا عبداللہ انصاری نے ۱۲۸۸ھ میں مدرسہ دیوبند میں اعلیٰ کتابیں پڑھ لیں تھیں. امتحانات میں کامیابی کے بعد مقررہ نصاب مکمل ہو گیا تھا اور ان کو اس منتخب جماعت اور ان اولین افراد میں شامل ہونے کی سعادت حاصل ہو گئی تھی جنھوں نے دارالعلوم کے آغاز کے وقت سے مدرسہ میں علمی ترقی شروع کی اور اسی مدرسہ میں جملہ تعلیم حاصل کر کے وہ دارالعلوم سے سب پہلے فارغ ہونے والے خوش نصیب اصحاب میں شمار کئے گئے.

وہ دارالعلوم دیوبند کے ان ابتدائی طالب علموں میں سے تھے جنھوں نے مدرسہ کے افتتاح کے وقت مدرسہ میں داخلہ لیا اور نصاب تعلیم پورا ہونے تک اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ تعلیم میں مشغول رہے اور بالآخر دارالعلوم کے طالب علموں کی اس مختصر مگر بابرکت اور قابل فخر جماعت کے ممتاز شریک ثابت ہوئے جس نے سب سے پہلے دارالعلوم سے فراغت حاصل کی اور ان کو دارالعلوم سے سب سے پہلے سند کا اعزاز حاصل ہوا.

مولانا انصاری کی سند

تعلیم سے فراغت پر مولانا عبداللہ انصاری کو مدرسہ کی جانب سے جو سند عطا کی گئی اس میں مدرسہ میں پڑھی ہوئی تمام کتابوں کی تفصیل درج ہے اور ان کی لیاقت اور استعداد کی بھی تعریف کی گئی ہے. یہ سند مدرسہ کی روداد میں شامل ہے:

"بسم اللہ الرحمن الرحیم نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

مولوی محمد عبد اللہ بن مولوی انصار علی انبہٹوی و نبیرہ جناب مملوک العلی صاحب مرحوم و مغفور، ربیع الاول ۱۲۸۵ھ میں داخل مدرسہ ہوئے اور اس زمانے میں **شرح ملا جامی** پڑھتے تھے، پانچ برس اس مدرسہ میں تحصیل علوم مشغول رہے، نحو، معانی، منطق، فلسفہ، عقائد فقہ، اصول فقہ، حدیث، تفسیر، ادب فرائض میں کتب مفصلہ ذیل تحصیل کیں: **شرح ملا جامی، مختصر معانی، قطبی، میبذی، شرح عقائد، کنز، شرح وقایہ، اصول الشاشی، نور الانوار، توضیح تلویح، مشکوۃ، صحاح ستہ، جلالین شریف، بیضاوی شریف، نفحتہ الیمن، کلیلہ ودمنہ، مقامات، میبذی، مقامات حریری، دیوان متنبی، تاریخ یمینی، ھدایہ، سراجی.**

مناسبت تمام اور استعداد متوسط اور ذہن سلیم اور فہم درست رکھتے ہیں اور نہایت سعید اور حلیم الطبع ہیں اور سالانہ امتحان میں اکثر مورد انعام ہوئے اور مدرس اور مہتمم ان کی وضع اور خوبی علم سے خوش رہے اور بعہد نیابت اس مدرسہ میں پڑھاتے رہے. اب ایک صورت علاقہ کی ان کو ملی. بضرورت معاش بعد تکمیل اس مدرسہ سے جدا ہوئے.

العبد مدرسین مدرسہ

العبد مدرس اول	مولوی محمد یعقوب صاحب نانوتوی
العبد مدرس دوم	مولوی سید احمد دہلوی
العبد مدرس سوم	مولوی محمد محمود

العبد مہتممین مدرسہ

العبد مولوی ذوالفقار علی	ڈپٹی انسپکٹر، مدارس ضلع سہارن پور، ساکن دیوبند
العبد مولوی مہتاب علی	مدرس مدرسہ۔ تحصیل دیوبند
العبد محمد رفیع الدین	مہتمم مدرسہ ہذا.

مولوی عبداللہ ساکن انبہٹہ **شرح ملا** پڑھتے ہوئے داخل مدرسہ ہوئے اور آخر تک پڑھا. پانچ برس میں تکمیل دینیات کی. اب آخر کو بوجہ معاش کول میں علاقہ کیا۔(۱۰)

مگر تعجب ہے کہ اس سند میں یہ لکھا ہے کہ وہ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ (جون/ جولائی ۱۸۶۸ء) میں مدرسہ میں داخل ہوئے تھے. بہ ظاہر یہ سہو کاتب اور نقل کی فروگذاشت ہے. صحیح تاریخ داخلہ ربیع الاول ۱۲۸۳ھ ہے۔ جیسا کہ مدرسہ کی سال اول و دوم ۱۲۸۳-۱۲۸۴ھ کی رودادوں اور مدرسہ کے اس وقت کے غیر مطبوعہ ریکارڈ میں مولانا کا نام سالانہ امتحان میں شرکت اور مدرسہ سے ملنے والے انعامات کا بھی صاف صاف ذکر ہے. تاہم سند سے یہ نئی بات معلوم ہوتی ہے جس کا ابتدائی روداد میں ذکر نہیں کہ مولانا انصاری جب مدرسہ میں داخل ہوئے اس وقت **شرح جامی** پڑھ رہے تھے، اس میں **قطبی** کی تعلیم کا بھی تذکرہ ہے.

دیو بند میں ہم سبق رفقاء

دارالعلوم دیو بند کی ابتداء بہت چھوٹے پیمانہ پر ہوئی تھی جس میں بہت تیزی سے بلکہ غیر معمولی سرعت رفتار سے اضافہ ہوا. مدرسہ میں سب سے پہلے متعدد طالب علم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے پرانے شاگرد تھے. ان کی تعلیم اور استعداد وصلاحیت کا حال معلوم تھا اس لیے ان کو مدرسہ میں داخلہ کے بعد وہی کتابیں پڑھائی گئیں جو وہ پہلے سے پڑھ رہے تھے. داخلہ لینے والے بیشتر نئے طلبہ کی تعلیم اور اسباق کی ترتیب مدرسہ میں آنے سے پہلے کسی نصاب کی پابند اور مرتب نہیں تھی تو جو کتابیں اور مضامین وہ اپنے استادوں سے پڑھ رہے تھے مدرسہ میں آ کر انہیں کا ذکر اور اندراج ہوا. طلبہ مختلف جماعتوں میں مختلف کتابیں پڑھتے اس لئے کبھی کوئی طالب علم کسی کا ساتھی ہو جاتا

کبھی کسی اور کا. جماعت بندی تو تھی مگر ابھی نصاب ترتیب دیا جار ہا تھا.

مولانا عبداللہ انصاری کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ علیحدہ علیحدہ کتابوں میں الگ الگ ساتھی تھے. ان سب کے نام کتابوں کی تعلیم کے ضمن میں رودادوں میں ترتیب وار درج ہیں. ان اندراجات سے مولانا عبداللہ انصاری کی تعلیمی نوعیت اور رفقاء کی مفصل فہرست سامنے آجاتی ہے. اس کے جائزہ سے صرف مولانا انصاری ہی نہیں بلکہ دارالعلوم کے ابتدائی زمانہ کے ممتاز اور اہم طلبہ کے نام جن میں متعدد بعد میں فخر روزگار عالم شمار کئے گئے، نیز ان کی تعلیم اور ساتھیوں کی یک واضح ترتیب بھی سامنے آجاتی ہے.

رفقائے درس کی زیر نظر فہرست میں پہلے سنہ درج ہے پھر زیر تعلیم کتاب کا نام ہے، آخر میں اس کتاب کے درس میں شامل جملہ طلبہ کے نام ہیں. اس سے سمجھنا بھی آسان ہوگا اور عہد بہ عہد اور درجہ بہ درجہ تعلیمی ترقی کی کیفیت بھی پیش نظر رہے گی.

یہ خیال رہے کہ اس فہرست کی ابتداء ۱۲۸۵ھ کی فہرست سے ہو رہی ہے؛ ۱۲۸۳ھ اور ۱۲۸۴ھ کی روداد میں طلبہ کے علیحدہ نام لکھے ہوئے ہیں. اس وقت تک تعلیم کی درجہ بندی اور طلباء کی جماعتیں نہیں ہوتی تھی، ۱۲۸۳ھ میں پہلی بار جماعت بنائی گئی جس کی تفصیل یہ ہے:

۱- ۱۲۸۱ھ میں **مختصر** کی جماعت میں چھ طالب علم تھے:

مولانا فخر الحسن گنگوہی　　　مولانا عبدالحق پورقاضوی

مولانا عبدالعزیز خاں دیوبندی　　　مولانا مولوی فاضل پھلتی

مولانا محمود حسن دیوبندی　　　مولانا عبداللہ انصاری.[۱۱]

۲- ۱۲۸۱ھ/ **نور الانوار** میں پانچ طالب علم تھے:

مولانا عزیز خاں سہارنپوری، مولانا محمد فاضل پھلتی، مولانا عبدالحق پورقاضوی، مولانا عبداللہ گوالیاری،[۱۲] مولانا عبداللہ انصاری.

۳- ۱۲۸۱ھ/ **اصول الشاشی** میں سات طالب علم تھے:

مولانا جمعیت علی پورقاضوی، مولانا ابن حسن، مولانا عبداللہ ساکن جلال آباد،

مولانا محمد عمر رام پوری، مولانا جہانگیر پور قاضی، مولانا محمد حاجی پھلت، [13] مولانا عبداللہ انصاری.

۴- ۱۲۸۱ھ/ **شرح وقایہ** میں چودہ طالب علم تھے:

مولانا جہانگیر پور قاضی، مولانا عبد الحق بریلوی، مولانا عبد اللہ جلال آبادی، مولانا محمد یحییٰ سیوہاروی، مولانا جمعیت علی پور قاضی، مولانا محمد عمر رام پوری، مولانا محمد حاجی پھلت، مولانا ابن حسن امروہوی، مولانا مشتاق احمد انبہٹوی، مولانا مشیت علی بجنوری، مولانا محمد اسماعیل سہارنپوری، مولانا عبد الرحیم بنارسی، مولانا قاسم سنبھلیڑوی، [14] مولانا عبداللہ انصاری.

۵- ۱۲۸۶ھ/ **ترمذی شریف** میں چھ طالب علم تھے:

مولانا عبد الحق پور قاضی، مولانا عبد العزیز دیو بندی، مولانا عبد اللہ گوالیاری، مولانا محمود حسن دیو بندی، مولانا محمد اسحاق افضل گڈھی. [15]

۱۲۸۶ھ/ **مشکوٰۃ شریف** کی جماعت میں مولوی عبداللہ انصاری تنہا تھے. [16] کوئی رفیق نہیں تھا اسی طرح **توضیح تلویح** میں بھی تنہا تھے. [17]

۶- ۱۲۸۶ھ/ **نور الانوار** کی دوسری جماعت میں چار طالب علم تھے:

مولانا نہال احمد دیوبندی، مولانا جہانگیر علی پوری، مولانا مشیت علی بجنوری، مولانا عبداللہ انصاری. [18]

۷- ۱۲۸۶ھ **شرح وقایہ** دوبارہ پڑھی. اس جماعت میں پانچ طالب علم تھے:

مولانا مشیت علی بجنوری، مولانا نہال احمد دیو بندی، مولانا منفعت علی دیو بندی، مولانا محمد اسحاق افضل گڈھی، مولانا عبداللہ انصاری. [19]

۱۲۸۶ھ/ **نفحتہ الیمن** میں مولانا انصاری تنہا تھے. [20]

۸- ۱۲۸۷ھ/ **جلالین شریف** میں نو طالب علم تھے:

مولانا عبد الحق پور قاضی، مولانا عبد العزیز خاں دیو بندی، مولانا احمد حسن دیوبندی، مولانا عبد اللہ گوالیاری، مولانا محمد اسحاق افضل گڈھی، مولانا عبد الحق بریلوی،

مولانا محمد مراد فیروز پور پنجاب، مولانا جہانگیر علی پوری، مولانا عبداللہ انصاری۔ (۴۱)

۹- ۱۲۸۷ھ/پہلی مرتبہ **بخاری شریف** اور **مسلم شریف** پڑھی اس جماعت میں پانچ طالب علم تھے:

مولانا عبدالحق پور قاضی، مولانا عبدالعزیز دیو بندی، مولانا عبداللہ گوالیاری، مولانا اسحاق افضل گڈھی، مولانا عبداللہ انصاری۔ (۴۲)

۱۰- ۱۲۸۷ھ/**سنن ابودائود** میں چھ طالب علم تھے:

مولانا عبدالحق پور قاضی، مولانا احمد حسن دیو بندی، مولانا عبدالعزیز خاں، مولانا عبداللہ گوالیاری، مولانا اسحاق افضل گڈھی، (۴۳) مولانا عبداللہ انصاری۔

۱۱- ۱۲۸۷ھ/**مقامات حریری** میں تین طالب علم تھے:

مولانا عبدالحق بریلوی، مولانا محمد اسحاق افضل گڈھی، مولانا عبداللہ انصاری۔ (۴۴)

۱۲- ۱۲۸۷ھ/**ترجمہ حکایات** میں پانچ طالب علم تھے:

مولانا عبدالحق پور قاضی، مولانا خلیفہ احمد حسن دیو بندی، مولانا عبدالعزیز خاں دیو بندی، مولانا عبداللہ گوالیاری، مولانا عبداللہ انصاری۔ (۴۵)

۱۳- ۱۲۸۸ھ/**بخاری شریف** میں چار طالب علم تھے:

مولانا عبداللہ پور قاضی، مولانا عبداللہ گوالیاری، مولانا عبدالعزیز دیو بندی، مولانا عبداللہ انصاری۔ (۴۶)

۱۴- ۱۲۸۸ھ/**نسائی** میں چار طالب علم تھے:

عبداللہ پور قاضی، عبداللہ گوالیاری، عبدالعزیز دیو بندی، عبداللہ انصاری۔ (۴۷)

۱۵- ۱۲۸۸ھ/**تفسیر بیضاوی** میں سات طالب علم تھے:

مولانا عبداللہ پور قاضی، مولانا عبدالعزیز دیو بندی، مولانا مشیت علی بجنوری، مولانا محمد مراد فیروز پوری، مولانا نہال احمد دیو بندی، مولانا عبداللہ گوالیاری، مولانا عبداللہ انصاری۔ (۴۸)

۱۶- ۱۲۸۸ھ/ **دیوان متنبی** میں دو طالب علم تھے:

مفتی محمد مراد ساکن پاک پٹن، مولانا عبداللہ انصاری۔(۲۹)

۱۷- ۱۲۸۸ھ/ **سراجی** میں نو طالب علم تھے:

مولانا ظفر علی خاں شیر کوٹ ضلع متھرا، مولانا مشیت علی بجنوری، مولانا عبدالحق پور قاضی، مولانا خلیفہ احمد حسن دیوبندی، مولانا نہال احمد دیوبندی، مولانا عزیز خاں دیوبندی، مفتی مراد پاک پٹن، مولانا عبداللہ گوالیاری، مولانا عبداللہ انصاری۔(۳۰)

۱۸- ۱۲۸۹ھ/ **ابن ماجه** میں دو طالب علم تھے:

مولانا عبدالوارث پنجابی، مولانا عبداللہ انصاری۔(۳۱)

۱۹- ۱۲۸۹ھ/ **تاریخ یمینی** میں چار طالب علم تھے:

مولوی مراد پٹنی، مولوی خلیل احمد انبہٹوی، مولوی صدیق احمد انبہٹوی، مولوی عبداللہ انصاری انبہٹوی۔(۳۲)

۲۰- ۱۲۸۹ھ/ **ملا حسن** میں دو طالب علم تھے:

مولانا احمد حسن دیوبندی، مولانا عبداللہ انصاری۔(۳۳)

۲۱- ۱۲۸۹ھ/ **سلم العلوم** میں تین طالب علم تھے

مولوی احمد حسن دیوبندی، مولوی خلیل احمد انبہٹوی، مولوی عبداللہ انصاری۔(۳۴)

دارالعلوم کے پہلے فارغین

عام طور پر یہ لکھا اور کہا جاتا ہے کہ دارالعلوم کے فارغین کی سب سے پہلے جماعت وہ تھی جس میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی شامل تھے مگر یہ اطلاع شہرت اور کثرت نقل کے باوجود صحیح نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دارالعلوم کے فارغین کی سب سے پہلی جماعت وہ ہے جس میں مولانا عبداللہ انصاری وغیرہ شامل تھے۔ ان ہی کو دارالعلوم سے سب سے پہلے فارغ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ مولانا انصاری کے رفقاء میں جن لوگوں کے نام روداد میں درج ہیں وہ یہ ہیں:

مولوی محمد مراد صاحب پاک پٹنی مولوی عبداللہ خاں صاحب گوالیاری

مولوی عبدالحق صاحب بریلوی مولوی عبداللہ صاحب انبہٹوی

اور مولانا عبدالعزیز خاں دیوبندی (۳۵) جن کے بارے میں ایک دعویٰ ہے کہ دارالعلوم کے سب سے پہلے طالب علم وہی تھے۔ (۳۶)

ناروا تنازعات کا نشانہ

کچھ عجیب بات ہے کہ دارالعلوم دیوبند جیسے تاریخ ساز ادارہ کے سلسلہ میں طرح طرح کے تنازعات ہوا میں اچھالے جاتے رہے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے مفکر و موسس مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نہیں بلکہ حاجی سید عابد حسین دیوبندی تھے۔ زندہ قومیں اپنی تاریخی شخصیات، تاریخی اداروں، تاریخی واقعات کی تاریخی حفاظت کرتی ہیں تاکہ نہ توامت کا تاریخی تسلسل ٹوٹے، نہ واقعات کی ترتیب میں فرق پڑے، نہ غلط بیانیوں کو راہ ملے۔ یوں تو حضرت سید عابد حسین دیوبندیؒ کو مدرسہ کا بانی مان لینے سے قیامت نہیں آجائے گی، لیکن پھر دارالعلوم دیوبند بھی انہی ہزاروں مدارس میں سے ایک بن کر رہ جائے گا جن کے وجود با مسعود سے عوام الناس کے ایک بڑے طبقہ کو دین پر استقامت تو بے شک حاصل ہوئی، مگر فکری رہنمائی اور عملی قیادت میسر نہ آئی۔ حضرت حاجی عابد حسین دیوبندیؒ بلاشبہ مرتاض اہل اللہ میں اونچا مقام رکھتے تھے مگر پورے ادب واحترام کے ساتھ یہ کہنا بھی بے محل نہیں کہ وہ مفکر و مدبر اور اسلامیان ہند کے اجتماعی مستقبل پر نظر رکھنے والے بزرگ نہیں تھے۔ اب اسے تاریخی دلیل مانا جائے یا مولانا نانوتوی کی کرامت جاریہ کہ دارالعلوم دیوبند کے ہزاروں ہزار فارغین اپنے ناموں کے ساتھ قاسمی نسبت لگانے میں فخر محسوس کرتے ہیں، اور آج تک کسی نے اپنا علمی انتساب حضرت حاجی عابد حسین دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ سے نہیں کیا۔

دوسرا غیر ضروری تنازعہ یہ دعویٰ ہے کہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن عثمانی دیوبندی دارالعلوم دیوبند کے پہلے متعلم نہیں تھے۔ یہ بات پتا نہیں کیوں مولانا محمد قاسم نانوتوی کی مخطوطہ سوانح میں منشی فضل حق دیوبندی نے لکھی جو بعد میں مدرسہ کے مہتمم بھی ہوئے۔ اس

خیال کا حوالہ مولانا مناظر احسن گیلانی نے مطبوعہ **سوانح قاسمی** (۲:۲۶۲) میں دیا ہے کہ مدرسہ دیوبند کے پہلے متعلم محمود الحسن نہیں عبدالعزیز دیوبندی تھے. دراصل مولانا گیلانی کا مقصد اس غلط فہمی کی تردید کرنا تھا، اگرچہ یہ اندیشہ بھی درست ثابت ہوا کہ بعض حلقوں میں **سوانح قاسمی** کے مزید دو ایک صفحات کو پڑھے بغیر محض ابتدائی دعوے کی بنیاد پر یہ خیال قائم کر لیا گیا کہ مولانا عبدالعزیز دیوبندی پہلے متعلم تھے. واقعہ یہ ہے کہ مولانا گیلانی نے آگے (**سوانح قاسمی** ۲:۲۶۳) میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد ابن مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ایک تحریری بیان کی دلیل سے ثابت کیا ہے کہ ''مولانا محمود الحسن صاحب پہلے طالب علم تھے جنہوں نے کتاب کھولی''.

اہم بات یہ ہے کہ جس ''عظیم الشان جلسہ دستار بندی منعقدہ ۱۳۲۸ھ'' میں ''زریں ماضی و مستقبل'' کے عنوان سے مولانا حافظ احمدؒ نے یہ تحریری بیان پڑھ کر سنایا تھا اس میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صدر مدرس دارالعلوم دیوبند بہ نفس نفیس موجود تھے. اس موضوع پر حضرت مولانا حافظ احمدؒ کی مکمل عبارت یہ ہے:

> مدرسہ دیوبند کا افتتاح دیوبند جیسی گمنام بستی میں چھتہ کی مسجد کے اندر انار کے درخت کے نیچے ہوا. جناب مولانا علامہ محمود صاحب دیوبندی مدرس تھے، اور مولانا محمود الحسن صاحب پہلے طالب علم تھے جنہوں نے کتاب کھولی.

مولانا مناظر احسن گیلانی. **سوانح قاسمی** ۲:۲۶۳. دیوبند ۱۳۷۳ھ.

یہ نکات اس لئے گفتگو میں آئے کہ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ (مئی ۱۸۶۶ء) میں تاسیس مدرسہ کے بعد جب ۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲ء) میں فارغین کی جس جماعت کو سندیں عطاء کی گئیں تو ان میں مولوی محمد مراد صاحب پاک پٹنی، مولوی عبد اللہ خاں صاحب گوالیاری، مولوی عبد الحق صاحب بریلوی، مولوی عبد العزیز خاں صاحب دیوبندی اور مولوی عبداللہ انصاری انبہٹوی کا نام موجود تھا. ان لوگوں کو مدرسہ دیوبند (دارالعلوم) نے اپنا پہلا فاضل قرار دیا تھا اور ان کو سندیں بھی عطا کی گئیں تھیں مگر اس وقت تک دستار بندی کا معمول شروع نہیں ہوا تھا اور سندیں بھی بہت سادہ معمولی کاغذ پر تصدیق کے طور پر لکھ دی

جاتی تھیں. چونکہ مدرسہ دیوبند کے ان سب سے پہلے فارغین کا تعلیم کے اختتام کے ساتھ ہی مدرسہ کے ارباب انتظام نے اور مقامات پر مختلف حیثیتوں سے تقرر کر دیا تھا اس لئے ان کا زیادہ چرچا اور شہرہ بھی نہیں ہوا، ورنہ در حقیقت یہی دار العلوم کے سب سے پہلے طالب علم اور فارغین ہیں.

اس فہرست میں شیخ الہند محمود الحسن کا نام نہیں ہے اور اس لئے نہیں ہے وہ سال آئندہ ۱۲۸۹ھ میں فارغ ہوئے تھے اور انہیں سند ۱۲۹۰ھ میں عطاء کی گئی تھی.(مولانا محمد اسجد قاسمی ندوی. حضرت شیخ الهند: شخصیت، خدمات و امتیازات:۱۴).تاخیر سے سند فضیلت حاصل کرنے کا یہ مطلب کہاں ہوا کہ داخلہ اور آغاز تعلیم بھی اول فارغین کے بعد ہوا تھا.

دار العلوم دیوبند میں واپسی

مولانا عبداللہ انصاری ۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲-۱۸۷۳ء) میں دار العلوم سے اس وقت رخصت ہو گئے تھے جب انہیں کول (علی گڑھ) میں ایک ملازمت مل گئی تھی. ان کے علی گڑھ جانے کا مختصر تذکرہ دار العلوم کی روداد میں ہے. لکھا ہے کہ:

> مولوی عبداللہ ساکن انبہٹہ شرح ملا پڑھتے ہوئے داخل مدرسہ ہوئے اور آخر تک پڑھا، پانچ برس میں تکمیل دینیات کی، اب آخر کو بوجہ معاش کول (علی گڑھ) میں علاقہ کیا. (۴۷)

یہ ملازمت کہاں کس کام کے لئے تھی اس کا تذکرہ نہیں ملتا. وہ علی گڑھ سے بہت جلد شاید پورا سال گزرنے سے پہلے ہی واپس آگئے تھے. واپسی کے بعد بہ ظاہر ۱۲۸۹ھ کے آخر یا اوائل ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) میں پھر دار العلوم پہنچے وہاں دوبارہ داخلہ لیا اور پرانے معمول کی طرح طالب علم کی حیثیت سے دار العلوم میں مقیم رہے.

مدرسہ میں قیام کے اس دوسرے دور میں مولانا عبداللہ انصاری نے وہ کتابیں پڑھیں جو یا تو پہلے مرحلہ میں نصاب میں شامل نہیں تھیں یا ان کو اور کتابوں کی تکمیل اور ترتیب کی وجہ سے ان کے پڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا. انہوں نے ۱۲۹۰ھ میں شرح

عقائد، شرح میرزاهد اور **شرح چغمینی** پڑھیں اورنمبر حاصل کئے.مدرسہ کی اس سال کی روداد میں اس کا ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے:

پیر جیو عبداللہ، ساکن انبہٹہ

شرح چغمینی	۱۸-۱/۴	رسالہ میرزاہد	۲۰	شرح مواقف

شرح عقائد اورلکھا ہے: کتب دیگر ناتمام

۱۲۹۱ھ میں تعلیمی مصروفیت

مولانا عبداللہ انصاری نے ۱۲۹۱ھ بھی دارالعلوم میں گزارا اور معقولات کی اعلیٰ کتابیں پڑھیں اس میں بھی اچھے نمبر حاصل کئے.اس سال انہوں نے **حماسہ**، **تصریح**، **ملا جلال**،**شمس بازغہ** اور **صدرا** پڑھیں،ان کتابوں میں ان کے نمبر عام معمول کے تقریباً برابر ہیں:

تصریح	۲۰-۲/۳	ملا جلال	۱۸-۱/۲	شمس بازغہ	۱۶
حماسہ	۱۸-۱/۲	صدرا			

یہ مدرسہ میں مولانا کے قیام اور تعلیم کا آخری سال تھا اس کے بعد مدرس بنا کر تھانہ بھون بھیج دیئے گئے تھے.تھانہ بھون سے گلاؤٹھی اور اس کے بعد اور ملازمتوں پر رہے.

ایک اچھا معمول

سال ۱۲۹۲ھ کے آخری امتحانات میں مدرسہ کے چند وہ طلباء بھی شریک تھے جو مدرسہ کے سب سے پہلے طلبہ اور سند فضیلت حاصل کرنے والوں میں تھے لیکن شوق علمی چند اعلیٰ کتابیں پڑھنے یا ان کی تکمیل کے لئے انہیں دوبارہ مدرسہ میں لے آیا تھا.ان کی آخری اور اعلیٰ کتابوں کا منتہانہ امتحان ۱۲۹۲ھ میں ہوا.یہ طلبہ اپنی اعلیٰ استعداد اور قابلیت کی وجہ سے اس امتحان میں بھی کامیاب ہوئے اور مدرسہ کی نیک نامی کا ذریعہ بنے.

مدرسہ نے ابتداء سے ایک اچھا معمول یہ بنالیا تھا کہ اس کے سالانہ امتحانات میں شامل اعلیٰ کتابوں میں سے جس کتاب کا جواب سب سے عمدہ ہوتا تھا اس کو مدرسہ کی سالانہ روداد میں شائع کیا جاتا تھا. اس معمول کے مطابق مدرسہ کے سب سے پہلے طلبہ کے اعلیٰ کتابوں کے امتحانات کے سوالات و جوابات بھی شائع کئے گئے تھے جس میں مولانا محمد مراد پاک پٹنی کا **مسلم الثبوت** کا، مولانا عبداللہ خاں صاحب کا **امور عامہ** کا، مولانا عبدالحق بریلوی کا **شرح چغمینی** کا، نیز ایک اور سوال کا مولانا عبدالعزیز خاں دیوبندی کا جواب بھی شامل ہے جس کے عنوان میں غلطی سے **مسلم الثبوت** لکھا گیا ہے. یہ سوال کلام یا عقائد کی کسی کتاب کا ہے. بہر حال ایک جواب مولانا عبدالعزیز خاں کا اور آخری سوال و جواب تفسیر کا مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی کا لکھا ہوا ہے. یہ تمام جوابات طلبہ کی اعلیٰ استعداد متعلقہ فنون پر ان کی گہری نظر اور عمدہ گرفت کے مظہر ہیں. یہ جواب مولانا انصاری کی بھی اعلیٰ علمی لیاقت کا قدیم ترین نمونہ اور دارالعلوم دیوبند کے علمی سفر کی ایک قابل ذکر یادگار ہے اس لئے پرچہ تفسیر کا یہ سوال اور مولانا انصاری کا تحریر کیا ہوا اس کا جواب یہاں درج کیا جارہا ہے.

مولانا انصاری کا تفسیری ذوق

دارالعلوم دیوبند میں تفسیر کے علم میں دوران تعلیم ''مولوی عبداللہ ساکن انبہٹہ ضلع سہارنپور'' سے سوال کیا گیا تھا:

> جناب باری عزاسمہ ارشاد فرماتے ہیں **فتبارک اللہ احسن الخالقین**. دوسری آیت میں ارشاد ہے **ھو اللہ خالق کل شی**. ان دونوں آیتوں میں تعارض اور تناقض قوی معلوم ہوتا ہے.
>
> اور اگر یوں کہئے کہ **خالق کل شی** سے خالق بالفعل مراد ہے اور ماسواء جناب باری عزاسمہ جو اور خالق ہیں وہ خالق بالقوہ ہیں تو تیسری آیت میں **لن یخلقوا الو اجتمعوا** فرماتے ہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سوائے جناب باری اور کسی میں قدرت نہیں اور نیز **ھو اللہ الخالق الباری المصور** سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ سوائے اس کے اور خالق نہ بالقوہ ہے نہ بالفعل، اس لئے کہ یہ

مقام اظہار علو شان خداوندی ہے وہ دونوں مربیوں کے انحصار سے حاصل ہوتا ہے.
چنانچہ ظاہر ہے اور اگر مثال بے کار ہے تو سنو:
خوشنویسی کا ملکہ تعریف کے لئے کافی ہے، کوئی لکھے یا نہ لکھے؛ اور لکھنے والوں کو اس باب میں نہ لکھنے والوں پر تفوق نہیں ہوسکتا معہذا اجماع اہل حق بھی اسی پر ہے کہ سوائے خالق اکبر اور کوئی خالق نہیں اور ملائکہ وغیرہ وسائط خلق کو خالق کہنا اور بایں اعتبار تصحیح جمعیت خالقین کرنی تکلف باد ہے. اس کی کیا ضرورت تھی. اگر فتبارک اللہ الخالق الحسن فرما دیتے تو توحید کی توحید بنی رہتی اور تمحید کی تمحید حاصل ہو جاتی. اب اس تمحید کی بدولت مطلب اول اور اعظم ہاتھ سے جاتا رہا تقریر شافی تحریر فرمائیے.

مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی نے اس سوال کا مدلل مگر مختصر جواب لکھا جو اُن کے قرآنی علم اور تفسیری ذوق کا ایک عمدہ نمونہ ہے. اسی لئے دارالعلوم دیوبند کی سالانہ روداد میں اس شذرہ کو شامل اشاعت کیا گیا جو بجائے خود ایک اعزاز تھا. ان کا جواب تھا:

الجواب: بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم رب اشرح لی صدری ویسرلی امری ان کان الجواب حقافمن عند اللّٰہ و الا فمن عبد اللّٰہ.

جناب من: فتبارک اللّٰہ احسن الخالقین میں خالقین فرضی مراد ہیں، یعنی اگر فرض بھی کیا جائے کہ ماسوائے اللہ اور خالق ہیں تو اللہ جل شانہ احسن ہے ان سے پس درحقیقت اللہ ہی ہر شے کا خالق رہا اور خالقین فرضی ہوئے.

دوسری وجہ تطبیق یہ کہ خالقین باعتبار گمان کافرین کے فرمایا کہ جن کو تم اے کافرو ماسوائے الہہ پکارتے ہو اور اپنی کج فہمی سے ان کو خالق سمجھتے ہو تو دیکھو کہ تحقیق اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا خلاصہ مٹی سے پھر اس کو کیا نطفہ رحم میں بنایا نطفہ کو خون بستہ پھر بنایا خون بستہ کو گوشت کا لوتھڑا. اس لوتھڑے سے ہڈیاں بنائیں پھر پہنایا ہڈیوں کو گوشت. پھر پیدا کیا خلق آخر یعنی روح پھونک دی اور شکم سے نکال کر یہ رنگ وروپ عنایت فرمایا. پھر اس کے بعد فرمایا فتبارک اللّٰہ احسن الخالقین یعنی اے فریق طاغیہ جن کو تم

ماسواء اللہ پکارتے ہو ان میں ایسے ایسے کمالات کہاں بلکہ وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے اگرچہ سب ہی کیوں نہ جمع ہو جائیں.

اور اللہ خالق کل شی کے یہی معنی ہیں کہ اللہ ہی پیدا کرنے والا ہے ہر ایک شئے کا، یعنی فاعل حقیقی وہی ہے اور جو کہ دیگر خالقین عالم میں موجود ہیں تو وہ بسبب اس بات کے کہ ایک شے کو عدم سے وجود میں لاتے ہیں ان پر بھی اطلاق خالقیت مطلقہ کا آجاتا ہے، کہ وہ خالقین کسی شے کو عدم محض سے وجود میں نہیں لا سکتے مگر باعتبار ظاہر کے کسی شے کو ایک ایسی شئے دوسری ایسی میں لانے سے یعنی مٹی سے برتن یا لکڑی سے تخت بنا دینے سے ان صانعین پر بھی خالقیت کا اطلاق مجاز آ گیا، اگرچہ انہوں نے کوئی شے محض اپنے اختیار سے نہیں بنائی بلکہ جس اختیار سے کہ ان سے خلق واقع ہوا وہ اختیار بھی محض خدا ہی کا عطیہ ہے. پس خالق حقیقی خداوند کریم ہی رہا، کیونکہ اس کے اختیار ہونے سے ان صانعینِ اختیاری کا کام چلا.

اس تقریر سے صاف ظاہر ہو گیا کہ جو شے ہے اس کا خالق حقیقی اللہ تعالیٰ ہی ہے. اللہ خالق کل شی سے صادق آ گیا. ان توجیہات سے آیتین مذکورین میں تعارض باقی نہ رہا کیونکہ فتبارک اللہ احسن الخالقین میں خالقین مجازی مراد ہیں یا فرضی یا جو کفار کے گمان میں بسے ہوئے ہیں اور اللہ خالق کل شی میں خالق سے خالق حقیقی مراد رہا یعنی ماسوائے اللہ کوئی کسی کا خالق حقیقی نہیں اور اگر بالفرض والتقدیر اگر اوروں کو کسی وجہ سے خالق کہہ بھی دیں تو اللہ تعالیٰ احسن الخالقین ہے. غرض کہ الف لام الخالقین کا استغراقی ہے کہ کسی قسم کے خالق ہوں اللہ تعالیٰ ان سب سے احسن ہے اور ایسے خالقین کی طرف اضافت کرنے سے توحید بھی باقی رہی کیوں کہ خالق حقیقی سوائے خداوند کریم اور کوئی نہ ہو، اگر ماسوائے خداوند کریم کے کسی اور پر خالق حقیقی کا اطلاق آجاتا تو البتہ توحید میں فرق آتا. واللہ اعلم وعلمہ اتم (؟؟؟). (۳۸)

مولانا احمد علی سے تلمذ

دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارن پور کا سلسلہ حدیث و اجازت حدیث شاہ محمد اسحاقؒ کے واسطہ سے حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ سے وابستہ ہے. اگرچہ

مظاہر علوم سہارن پور دار العلوم دیو بند تاسیس میں چھ مہینے مؤخر ہے اور شہرت میں بھی نسبتہً دوسرا درجہ رکھتا ہے مگر مظاہر علوم اپنی بعض خصوصیات میں دار العلوم سے ممتاز بھی ہے جس میں سے ایک اہم بات یہ ہے کہ مظاہر علوم کے بانی اول مولانا سعادت علی فقیہ سہارنپوری حضرت سید احمد شہید کے فیض یافتہ تھے اور مظاہر علوم کے پہلے دونوں سرپرست حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری اور حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی براہ راست حضرت شاہ محمد اسحاقؒ کے شاگرد تھے۔ اسی کا ایک پہلو یہ ہے کہ دار العلوم دیو بند کے اولین ذمہ داروں اور سرپرستوں میں سے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی حدیث میں حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری کے شاگرد تھے۔ اس لئے مولانا عبداللہ انصاری کو بھی مولانا احمد علی سہارنپوری سے استفادہ کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے حدیث شریف کے سبق لئے اور اجازت حدیث حاصل کی۔

حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کے علاوہ مولانا سید عالم علی نگینوی اور مولانا قاری عبد الرحمان پانی پتی سے بھی مولانا عبداللہ انصاری نے اجازت وسند حدیث حاصل کی تھی۔ وہ دونوں بزرگ بھی حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کے شاگرد تھے۔ ان تینوں سے اجازت کا مولانا عبدالحیٔ حسنی نے درج ذیل الفاظ میں ذکر کیا ہے:

واسند الحديث عن الشيخ احمد علی بن لطف الله السهارنپوری والسيد عالم علی النگينوی والقاری عبد الرحمٰن البانی پتی۔ (۳۹)

مولانا عبدالحیٔ حسنی کی مولانا عبداللہ انصاری سے طویل واقفیت تھی اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ان کی یہ اطلاع خود مولانا انصاری کی روایت پر مبنی ہوگی۔ مولانا حسنی نے یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی کو حاجی امداد اللہ سے مثنوی مولانا روم میں تلمذ اور اس کی اجازت حاصل تھی۔

وقراء المثنوی المعنوی علی الشيخ الاجل امداد الله العمری التهانوی المهاجر۔ (۴۰)

حواشی

۱- نانوتوی، مولانا محمد یعقوب. **مکتوبات یعقوبی مع بیاض یعقوبی**، ص:۸۵. اشرف المطابع. تھانہ بھون. ۱۹۲۹ء.

۲- نانوتوی، مولانا محمد یعقوب. **حالات طیب مولانا محمد قاسم**. ص ۳۱ طبع اول بہاول پور. ۱۲۹۷ھ. کاندھلوی، نور الحسن راشد. **قاسم العلوم ،احوال و کمالات** ص ۲۲۴-۲۲۵.

۳- روداد سال اول مدرسہ دیوبند مطبوعہ ۲۵ محرم ۱۲۸۴ھ.

۴- ایضاً.

۵- روداد سنہ ۱۲۸۴ھ. مدرسہ دیوبند، ص ۷.

۶- روداد سنہ ۱۲۸۶ھ. مدرسہ دیوبند.

۷- ایضاً

۸- روداد سنہ ۱۲۸۷ھ: مدرسہ دیوبند، ص ۸.

۹- روداد سنہ ۱۲۸۸ھ. مدرسہ دیوبند، ص ۱۰.

۱۰- روداد سنہ ۱۲۸۹ھ. ص ۲۲. طبع دوم.

۱۱- روداد سنہ ۱۲۸۵ھ. مدرسہ عربیہ دار العلوم دیوبند. ص ۱۱-۲۱.

۱۲- ایضاً.

۱۳- ایضاً.

۱۴- روداد سنہ ۱۲۸۵ھ. ص ۱۲.

۱۵- روداد سنہ ۱۲۸۶ھ. ص ۱۳.

۱۶- ایضاً.

۱۷- ایضاً.

۱۸- روداد سنہ ۱۲۸۶ھ. ص ۱۴.

۱۹- روداد سنہ ۱۲۸۶ھ. ص ۱۶.

۲۰- ایضاً.

۲۱- روداد سنہ ۱۲۸۷ھ. ص ۱۲-۱۳.

۲۲- روداد سنہ ۱۲۸۷ھ. ص ۱۳.

۲۳- روداد سنہ ۱۲۸۷ھ.ص ۱۴.

۲۴- روداد سنہ ۱۲۸۷ھ.ص ۱۵.

۲۵- ایضاً.

۲۶- روداد سنہ ۱۲۸۸ھ.ص ۱۰.طبع دوم.

۲۷- ایضاً.

۲۸- ایضاً.

۲۹- روداد سنہ ۱۲۸۸ھ.ص ۱۱-۱۲.طبع دوم.

۳۰- ایضاً.

۳۱- روداد سنہ ۱۲۸۹ھ.ص ۱۴.

۳۲- ایضاً.

۳۳- روداد سنہ ۱۲۸۹ھ.ص ۱۵.طبع دوم.

۳۴- روداد سنہ ۱۲۸۹ھ.ص ۱۶.طبع دوم.

۳۵- روداد مدرسہ عربیہ دارالعلوم دیوبند.۱۲۹۲ھ،طبع اول.ص ۱۲.طبع دوم.ص ۱۵.

۳۶- گیلانی،مولانا مناظر احسن. **سوانح قاسمی**.۲:۲۶۲.دیوبند ۱۳۷۳ھ.دیکھئے منشی فضل حق کی عبارت کی نقل اور اس کی تصحیح و تردید **سوانح قاسمی**.۲:۲۶۳.

۳۷- روداد سنہ ۱۲۸۹ھ.مدرسہ دیوبند.طبع دوم.ص ۲۳.

۳۸- روداد سنہ ۱۲۹۲ھ.مدرسہ عربیہ دارالعلوم دیوبند.طبع اول.ص ۳۱-۳۳.

۳۹- حسنی،مولانا عبدالحی. **نزهة الخواطر**.۸:-۱۲۹۱.دارابن حزم.بیروت.۱۹۹۹ء.

۴۰- ایضاً.

باب : ۳

سلوک و معرفت

پرانے دینی علمی حلقوں اور دینی علمی پس منظر رکھنے والے خاندانوں اور اہل فضل و کمال میں تعلیم ولیاقت کا معمول کا نصاب پورا کرنے کے بعد کسی اللہ والے صاحب نظر اور اہل معرفت کے دامن سے وابستہ ہو کر تربیت اخلاق، تزکیہ باطن اور اصلاح اعمال کی کوشش کا عام ذوق اور معمول تھا. جب تک کسی اللہ والے کی خدمت میں پہنچ کر اس سے وابستہ نہ ہو جاتے اور جب تک ان کی جانب سے اچھے انسان کا پروانہ نہ مل جاتا اس وقت تک ایک خاص محنت اور اشغال و مجاہدہ کی زندگی گذارنی ضروری تھی. یہ روایت مولانا عبداللہ انصاری کے بزرگوں اور خاندان میں بھی تسلسل کے ساتھ موجود تھی.

مولانا عبداللہ انصاری کے پڑدادا خواجہ شاہ قطب علی ابن شاہ غلام محمد کسی شیخ کے اجازت یافتہ صاحب ارشاد و معرفت شخص تھے. ان کے دادشاہ احمد علی بھی صاحب نسبت بزرگ تھے. ان کے والد مولانا انصار علی عالم دین اور مولانا مملوک علی کے تلمیذ تھے. ان کے سلسلۂ طریقت کی کوئی روایت تو نہیں ملی لیکن غیر متوقع نہیں کہ وہ بھی سلسلہ طریقت سے جڑے ہوئے ہوں اور کسی مربی و با کمال کی خدمت میں رہ کر سفر سلوک طے کیا ہو. ممکن ہے انہیں شاہ ابوالمعالی انبہٹوی کے سلسلۂ چشتیہ صابریہ سے ارادت ہو. ویسے ایک زمانہ میں اس خانوادۂ انصار کے بزرگوں کو نقشبندی سلسلہ میں سرہند کے بزرگوں سے نسبت رہی تھی. محمد طارق غازی (**تذکار الانصار**. اقرا ایجوکیشن فاؤنڈیشن. ممبئی ۲۰۱۸) نے مولانا محمد بقا سہارنپوری کی **مراۃ جہاں نما** کے حوالوں سے بتایا ہے کہ انصاریان سہارنپور کے اجداد میں خواجہ فریدالدین ہروی سہارنپوری اور خواجہ سالار سہارنپوری کی اولاد میں عرصۂ دراز تک باکمال علماء پیدا ہوتے رہے جو سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ میں بزرگان سرہند سے بیعت ہوتے تھے.

حاجی امداد اللہ کی خلافت

انیسویں صدی عیسوی میں مولانا انصار علی کے خانوادہ کے متعدد اصحاب اس دور کے نامور عارف ومرشد حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی کے مرید ومنسلک تھے.

مولانا عبداللہ انصاری کے نانا حضرت مولانا مملوک علی نانوتوی اگر چہ عمر میں حضرت حاجی امداد اللہ سے بہت بڑے تھے اور حاجی صاحب مولانا مملوک علی کے متوسط شاگردوں کے ہم عمر تھے لیکن مولانا مملوک علی حضرت حاجی صاحب کا بہت احترام کرتے تھے اور ان سے محبت اور نیاز مندی کا معاملہ رکھتے تھے. مولانا عبداللہ انصاری جن کا بچپن سے علماء یا اہل خاندان کی صحبت میں وقت گزرا وہ تقریباً سب ہی حضرت حاجی امداد اللہ کے دلدادہ ومعتقد تھے. مولانا عبداللہ انصاری کے ماموں مولانا محمد یعقوب نانوتوی، ان کے استاذ اور خسر مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، نیز مولانا سخاوت علی انبہٹوی جو مولانا عبداللہ انصاری کے ابتدائی استاد تھے اس کے علاوہ انبہٹہ اور گنگوہ وغیرہ کے خاندانوں کے علماء اور عوام کی ایک معقول تعداد حضرت حاجی امداد اللہ کی نام لیوا تھی. اس لئے یہ بات ہر طرح سے برمحل تھی کہ مولانا عبداللہ انصاری بھی اسی شجر سایہ دار کی تلاش کرتے اور اس کی ٹھنڈی چھاؤں میں بسیرا کرتے. اور ہوا بھی یہی. مولانا عبداللہ انصاری حضرت حاجی امداد اللہ سے بیعت ہوئے اور تربیت باطن اور سلوک وتصوف کی راہ طے کرنے میں لگ گئے.

مولانا عبداللہ انصاری یوں تو بچپن ہی سے حاجی امداد اللہ سے واقف تھے لیکن یہ تحقیق نہیں کہ سن شعور کو پہنچنے کے بعد پہلی ملاقات کب ہوئی تھی. گمان ہے کہ شوال ۱۳۰۵ھ (۱۸۸۸ء) میں جب وہ پہلی بار سفر حج پر گئے تھے اس وقت حضرت حاجی امداد اللہ سے بیعت ہوئے تھے. اس وقت ان کے مکہ مکرمہ میں موجودگی کی اطلاع حضرت حاجی امداد اللہ کے ایک خط سے ملتی ہے:

> برخوردار لخت جگر مولوی عبداللہ ساکن قصبہ انبہٹہ اس سال فقیر کے پاس آئے. (۱)

حاجی امداد اللہؒ سے معرفت کی ابتدائی تعلیمات لینے کے بعد مولانا عبداللہ انصاری ہندستان واپس آگئے تھے، مگر حاجی صاحب سے برابر رابطہ اور خط و کتابت رہی.

زیارت حرمین شریفین اور حضرت حاجی امداداللہ سے ملاقات اور استفادہ کے لئے مولانا عبداللہ انصاری دوسری بار ۱۳۰۷ھ (۱۸۸۹-۱۸۹۰ء) میں سفر حج پر گئے. اس سفر سے کئی مہینہ پہلے حاجی امداداللہ کو اس سفر کے منصوبے کی اطلاع مولانا عبداللہ انصاری نے بھیج دی تھی. حاجی امداداللہ اس وقت مولانا عبداللہ کے اس سفر کے حق میں نہیں تھے اور چاہتے تھے کہ وہ اس وقت سفر کو مؤخر کردیں. اس ممانعت اور مولانا عبداللہ انصاری کے سفر کا علم مولانا صدیق احمد انبہٹوی مالیر کوٹلوی کے نام مولانا رشید احمد گنگوہی کے ایک خط سے ہوتا ہے. انہوں نے لکھا تھا:

> مولوی عبداللہ کو منع کرنا حضرت سلمہ کا جو حافظ احمد صاحب کی تحریر سے دریافت ہوا تھا اور خط بنام حافظ قمر الدین کے تھا. حافظ قمر الدین نے دکھایا مگر نہیں مانا، معہ زوجہ و فرزندان ثلاثہ اور والدہ حافظ احمد کو یعنی اپنی خوش دامن کو لے کر چلے گئے. (۲)

زیارت حرمین کا اشتیاق

حاجی صاحب کا یہ مشورہ مولانا عبداللہ انصاری کو مل گیا تھا؛ مگر وہ سفر کی تیاری کر چکے تھے. حرمین شریفین کی زیارت کا شوق اور اپنے مرشد طریقت حاجی امداد اللہ سے ملاقات کی تمنا اس قدر غالب تھی کہ وہ عازم سفر ہوگئے. اس سفر کے لئے مولانا عبداللہ انصاری شعبان ۱۳۰۷ھ (اپریل ۱۸۹۰ء) میں بمبئی پہنچے اور وہاں سے جلد ہی مکہ معظمہ کا سفر شروع ہوگیا مولانا گنگوہی کے دو خطوں میں اس کا ذکر ہے. ایک خط میں لکھا ہے:

> مولوی عبداللہ قصد حج کا کرتے ہیں. ۲۲ رجب مجھ سے آکر رخصت ہوگئے، یکم دوم شعبان تک قصد روانگی مع اہل خانہ رکھتے ہیں. (۳)

اس خط سے معلوم ہو رہا ہے کہ اس سفر حج بیت اللہ پر روانہ ہونے سے پہلے مولانا عبداللہ انصاری ۲۲ رجب ۱۳۰۷ھ (۱۴ مارچ ۱۸۹۰ء) کو مولانا رشید احمد گنگوہی سے ملاقات کے لئے آئے تھے اس کے بعد شعبان میں روانہ ہوئے اور ۱۹ شعبان ۱۳۰۷ھ (۱۰

اپریل ۱۸۹۰ء) کو بمبئی پہنچے. مولانا عبداللہ کی اہلیہ تینوں بیٹے - محمد میاں، احمد میاں اور عبدالرحمٰن - اور خوش دامن، اہلیہ محترمہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، اس سفر میں مولانا انصاری کے ساتھ تھے. حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے ایک اور خط میں اس کی صراحت ملتی ہے کہ مولانا عبداللہ انصاری

> مع زوجہ وفرزندان ثلاثہ اور والدہ حافظ احمد کو یعنی اپنی خوش دامن کو لے کر چلے گئے.
> آج بمبئی سے ان کا خط بمبئی پہنچ جانے کا آیا کہ وہ ۱۹ ر شعبان کو وہاں پہنچے. (۴)

مولانا عبداللہ انصاری کے مکہ معظمہ پہنچنے کی تاریخ نہیں ملی لیکن یہ سفر حاجی صاحب کی خدمت میں اطمینان سے رہنے اور استفادہ کے لئے ہوا تھا. مولانا عبداللہ انصاری اپنے ارادے اور منصوبے کے مطابق ایک سال سے زائد وقت تک مکہ معظمہ میں قیام پذیر رہے. ارض مقدس پر ان کا قیام کم از کم ۲۵ شوال ۱۳۰۸ھ (۳ جون ۱۸۹۱ء) تک رہا. مکہ مکرمہ کے مدرسہ صولتیہ کے دفتر معائنہ میں ان کا معائنہ درج ہے جس پر ۲۵ شوال ۱۳۰۸ھ کی تاریخ لکھی ہوئی ہے. (۵) غالبًا اسی سفر میں حضرت حاجی امداداللہ نے مولانا عبداللہ انصاری کو بیعت کی اجازت دی.

مولانا عبداللہ انصاری کے دل میں حاجی امداد اللہ کا جو مقام و مرتبہ تھا اس کا اندازہ مولانا انصاری کے ان اشعار سے کیا جاسکتا ہے جو انہوں نے اپنی منظومہ **بکٹ کہانی (دردنهانی بارہ ماسہ)** کے آخر میں حاجی صاحب کی شان میں لکھے ہیں:

صیام الدہر ہے جن کا طریقہ — قیام اللیل اون کا اک وظیفہ
نظر ہے کیمیا اون کی سر اسر — ہر اک دم ہے دم عیسٰے برابر
کیا حرص و ہوا کو ترک اکبار — بتوں سے جیسے ابراہیم بیزار
ہوئے وہ فانی فی اللہ باقی باللہ — مبارک نام ہے امداداللہ
حقیقت میں ہیں امداد الٰہی — کوئی سمجھے حقیقت گر کماہی
مریدوں کے ہیں صدہا پیر کامل — کریں ہیں خلق کو خالق سے واصل (۶)

بکٹ کہانی کا قصہ

بکٹ کہانی کے ایک اندارج یا اشعار سے ضمناً یہ تاثر بھی ملتا ہے کہ ۱۳۰۸ھ کے بعد مولانا عبداللہ انصاری کا کم از کم ایک سفر حج اور ہوا ہے. **بکٹ کہانی** کے ابتدائی حصہ نظم کرنے، اس کو حضرت حاجی امداد اللہ کی خدمت میں پیش کرنے اور حاجی صاحب کے اس کو مکمل کرنے کی ہدایت کرنے کا ذکر کرتے ہوئے مولانا عبداللہ انصاری نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابتدائی کام کے بعد **بکٹ کہانی** کی تالیف ۱۴ برس تک التوا میں پڑی رہی. اس لمبے وقفہ کے بعد ۱۳۲۳ھ (۱۹۰۵ء) میں اس کو پورا کرنے کا موقع ملا. مولانا عبداللہ انصاری کہتے ہیں:

لگا پھر لکھنے میں بھی اک کہانی — زباں رکھی وہی سادی زنانی
جو میرے دردِ دل کی تھی کہانی — تو رکھا نام بھی دردِ نہانی
لکھے جب دو مہینہ فصل برسات — پکڑ کے دستِ غیبی نے میرا ہات
مجھے پہونچا دیا مکہ میں فی الفور — ہوا نقشہ مرا کچھ اور سے اور
بٹھایا مجلسِ مرشد میں لاکر — بہت تھے عالم و عارف جہاں پر
وہ کی جب نذر میں نے ہو کے دل شاد — ہوا مرشد سے پھر پڑھنے کا ارشاد
پڑھی میں نے جو وہ دردِ نہانی — لگی دل کو وہ حضرت کے سہانی
اسے سن کر ہوئی حالت یہ طاری — کہ آنسو ہو گئے آنکھوں سے جاری
بہت سے نعرے حق حق کے لگا کے — افاقہ پا کے پھر کچھ مسکرا کے
یہ فرمایا بہت پُر درد لکھی — حقیقی عشق کی آگ اس میں رکھی
نہ ہو ایسا کہ رہ جائے ادھوری — کہ پوری اس کا کرنا ہے ضروری
کیا پھر عرض میں نے دست بستہ — نہایت ہے کٹھن مجھ پر یہ رستہ (۷)

اس کے بعد انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ کتاب برسوں نامکمل پڑی رہی.

رہی چودہ برس تک یہ ادھوری — ہوئی سن تیرہ سو تیئس میں پوری (۸)

اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ **بکٹ کہانی** کے پہلے دو عنوان لکھ لئے تھے کہ اس کے بعد مکہ مکرمہ حاضر ہونے کا موقع ملا اور وہ شعر حاجی امداد اللہ کو سنائے تو ان پر ان اشعار کا بہت اثر ہوا اور حضرت حاجی امداد اللہ نے مثنوی کو مکمل کرنے کی ہدایت کی۔(۹) مگر مولانا عبداللہ انصاری کو اس ارشاد کی تعمیل میں بہت دیر لگی جس کی اصل وجہ تو یہ کہہ کر کہ 'نہایت ہے کٹھن مجھ پر یہ رستہ' خود شاعر نے بیان کردی کہ رموز طریقت و سلوک اور واردات و کیفیات کا بیان اس سہل الممتنع اسلوب میں کچھ آسان کام نہ تھا۔ مزید یہ کہ اس مدت میں تالیف کی فرصت بھی نہیں ملی اور اس میں ۱۴ سال گزر گئے۔

اس آخری سفر حج کا ذکر **بارہ ماسہ** کے اشعار میں آیا ہے۔ یہ ذکر کب ہوا تھا اس کی صراحت نہیں ملی۔ ممکن ہے یہ سفر حج دوسرے سفر حج کے فوراً بعد ۱۳۱۰-۱۳۱۱ھ (۱۸۹۲ء) میں ہوا ہو، یا حضرت حاجی امداد اللہ کی وفات ۱۳۱۷ھ سے پہلے کسی اور سنہ میں۔

حواشی

۱- یہ خط جس میں یہ فقرہ درج ہے کیم ربیع الثانی ۱۳۰۵ھ (۱۷ دسمبر ۱۸۸۷ء) بروز شنبہ کو مکتوب الیہ مولانا فتح محمد تھانوی کو ملا تھا۔ اصل خط مولانا راشد کاندھلوی کے پاس محفوظ ہے۔ اس خط کے مکمل متن کے لئے ملاحظہ ہو ماہنامہ **الفرقان** لکھنؤ، اپریل ۱۹۷۹ء ص ۲۶-۲۷۔

۲- میرٹھی، مولانا عاشق الٰہی۔ **مکاتیب رشیدیہ**۔ مکتوب بنام مولانا صدیق احمد انبیٹھوی ص ۹۰-۹۱ طبع اول عزیز المطابع میرٹھ۔

۳- حوالہ بالا ص ۴۷۔ ۴- حوالہ بالا ص ۹۱۔

۳- حوالہ بالا ص ۴۷۔

۵- **زبان حال: مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کی پچاس سالہ سرگذشت** ص ۲، مطبوعہ دفتر مدرسہ دہلی ۱۹۴۱ء

۶- انصاری، مولانا عبداللہ۔ **بکٹ کہانی** ص ۸۲۔ مطبع احمدی علی گڑھ۔

۷- حوالہ بالا ص ۸۳-۸۴۔

۸- حوالہ بالا ص ۸۳-۸۴۔ ۹- حوالہ بالا ص ۸۲۔

باب : ۴

علی گڑھ کا قضیہ

علی گڑھ کالج میں مولانا عبداللہ انصاری کے تقرر سے کالج کو تو بے شک بہت فائدہ ہوا اور طلبہ کو بھی دینی معلومات وصلاحیت بڑھانے کی گویا ایک سبیل ہاتھ آ گئی تھی جس سے ان کے ایک طبقہ نے فائدہ بھی اٹھایا،لیکن دیانت کے خلاف ہوگا اگر یہ ذکر نہ کیا جائے کہ مولانا عبداللہ انصاری کے پیرومرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ایم.اے.او. کالج میں مولانا عبداللہ انصاری کی ملازمت اور قیام کو پسند نہیں کرتے تھے.اس معاملہ میں اپنی ناخوشی بلکہ ناگواری کا برملا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے مولانا عبداللہ انصاری کو براہ راست بھی لکھا تھا اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے نام ایک خط میں بھی اس کی صراحت کی تھی.

مکتوب بنام مولانا انصاری

علی گڑھ میں تقرر کے بعد مولانا عبداللہ انصاری نے ربیع الاول ۱۳۱۱ھ (ستمبر ۱۸۹۳ء) میں حضرت حاجی امداد اللہ کو مکہ مکرمہ ایک خط میں اپنے اس تقرر و ملازمت کی اطلاع دی.حاجی امداد اللہ نے اس ملازمت کو پسند نہیں کیا اور مولانا عبداللہ انصاری کو اس کے جواب میں اپنے خاص انداز میں توجہ دلائی تھی کہ یہ ملازمت تمہارے لائق نہیں ہے .اس پر مولانا عبداللہ انصاری نے دوسرے خط میں اپنی گذارشات پیش کیں.اسی درمیان میں مولانا رشید احمد گنگوہی نے بھی ایک خط میں حاجی امداد اللہ کو اطلاع دی تھی کہ مولانا عبداللہ انصاری کا تقرر علی گڑھ کالج میں ہوگیا ہے.اس کے جواب میں حاجی امداد اللہ نے مولانا گنگوہی کو ایک مفصل گرامی نامہ تحریر فرمایا جس میں مولانا عبداللہ انصاری کی اس ملازمت پر ناپسندیدگی کے اظہار کے علاوہ یہ بھی لکھا کہ فلاں بات جو وہ کہہ رہے تھے غلط تھی اور یہ کہ حاجی امداد اللہ ''نے اس تعلق کی نہ اجازت دی اور نہ مشورہ، بلکہ ممانعت کی ہے''.

حاجی امداد اللہ کی ہدایت

اس خط سے کالج اور سر سید کے سلسلہ میں حاجی امداد اللہ کے خیالات ظاہر ہوتے ہیں. یہ دونوں خط تاریخی دستاویزیں ہیں اس لئے مولانا عبداللہ انصاری کے نام حاجی امداد اللہ کے خط کا مکمل متن اور مولانا گنگوہی کے نام خط کی ضروری عبارت نقل کی جارہی ہے.

مولانا عبداللہ انصاری کے نام گرامی نامہ یہ ہے:

از فقیر امداد اللہ عفا اللہ عنہ

من نگویم این مکن، آں کن
مصلحت بیں وکار آساں کن

بخدمت سراپا عقیدت، عزیزم مولوی عبداللہ صاحب زید عرفان

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط ۱۱ر ربیع الاول (۲۲ ردسمبر ۱۸۹۳ء) کا بذریعہ حافظ سعید احمد صاحب فقیر کو ملا ممنون و مشکور کیا. اللہ تعالیٰ اپنی رضا و محبت عطا کرے.

قبل ازیں میں نے آپ کے خط کا جواب تحریر کر دیا. بار بار ایسی دنیوی باتوں کا فقیر سے استفسار کمال دانائی ہے. آپ بزرگوں کی اولاد اور بزرگ ہیں جو کام بزرگوں نے کئے وہ آپ بھی کریں. بزرگوں نے دنیا کو ترک کیا اور ترک کا امر فرمایا، صبر و شکر اور قناعت اختیار کی، حیات چندروزہ جیسا ہو سکا پورا کرتے رہے اور حیات جاویدانی کے سامان اور ذخیرے فراہم کئے. اگر آپ ایسی تہمت کی جگہ ملازمت نہ کریں گے تو رزاق مطلق آپ کو چھوڑ نہ دے گا. اگر آپ نوکری کریں گے تو کچھ سلطنت نہ ملے گی وہی آپ کا رزاق آپ کو رزق پہنچا وے گا.

سید احمد صاحب اور ان کے مدرسہ کے ساتھ لوگوں کا کیا حال ہے آپ نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ دو طرح کے خیال ہیں. احوط الامرین آپ اختیار کریں، اللہ تعالیٰ ہمارا آپ کا خاتمہ بالخیر کرے.

از مکہ معظمہ ۲۴ ربیع الآخر ۱۳۱۱ھ

(۴ر نومبر ۱۸۹۳ء)

جمال الدین افغانی کا مقالہ

سر سید کے مذہبی خیالات اور ان کا جامد رویہ نہ صرف ہندستان بلکہ حجاز و مصر تک میں نشانۂ تنقید بنا یہاں تک کہ علامہ جمال الدین افغانی نے ان کے عقائد کے رد میں ایک مبسوط مقالہ لکھا تھا جسے ان کے تلمیذ خاص علامہ محمد عبدہ نے اپنے مقدمہ کے ساتھ جرجی زیدان کے پندرہ روزہ مجلہ **الھلال** میں شائع کروایا تھا. ہندستان میں بھی اکثر علماء دین اور اہل اللہ کی طرح حاجی امداد اللہ کو بھی خصوصاً سر سید احمد کی مذہبی تاویلات و تحریرات سے صاف اختلاف تھا. تاہم سر سید کے عام نقادوں کے برعکس اکابر دیوبند کی روش کے مطابق حضرت حاجی امداد اللہ نے سر سید احمد خان کو نصیحت کے طور پر ایک مفصل خط لکھوایا تھا. اس خط میں نہایت محبت و دلسوزی اور متانت و توازن کے ساتھ سر سید کو ان کی دینی غلطیوں، کج فکری اور دینی معاملات و مباحث میں غیر ضروری مداخلت پر تنبیہ فرمائی تھی. مولانا اشرف علی تھانوی نے اس خط کو **اصلاح الخیال** کے عنوان سے شائع بھی کرادیا تھا.(۱)

مولانا گنگوہی کے نام خط

علی گڑھ کالج سے مولانا عبد اللہ انصاری کے تعلق پر مولانا رشید احمد گنگوہی کے نام گرامی نامہ (۲) میں حضرت حاجی امداد اللہ نے کسی قدر تفصیلی گفتگو فرمائی ہے:

از فقیر امداد اللہ عفی اللہ عنہ

بخدمت بابرکت

عزیزم مولوی رشید احمد صاحب زاد فیوضہم

بعد سلام مسنون کے واضح ہو کہ خط آپ کا یکم جمادی الاول ۱۳۱۱ھ چہارم جمادی الثانی کو پہنچا. مضمون مندرجہ سے آگہی ہوئی. آپ کے ضعف اور گھر کی علالت سے کمال رنج ہو. خداوند کریم اپنا فضل کرے. آپ چونکہ وارث انبیاء ہیں اس لیے اشد البلاء کے مورد ہیں. اللہ تعالیٰ آپ کو اجر جزیل عطا فرمائے.

مولوی عبد اللہ صاحب کے حالات سن کر تعجب ہوا اور افسوس کہ باوجود دعویٰ صوفیت اور بزرگ زادگی کے اس مدرسہ کے متعلق ہو گئے جس کا نام علمائے

آخرت کے نزدیک دارالالحاد ہے، اور جو . . . مذہب اور مشرب کے خلاف ہے اور یہ جو آپ سے کسی نے کہا ہے کہ وہ فقیر کی اجازت سے مدرسہ نیچریہ میں ملازم ہوئے ہیں **سبحانک ھذا بھتان عظیم**.

آپ کو خوب معلوم ہے کہ فقیر کا مسلک ہر امر میں سواد عظیم کا اتباع ہی ہمیشہ سے ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال رہا تو یہی تا دم مرگ رہے.

بریں زیستم ہم بریں می گذرم

بس جس صورت میں جمہور علمائے عرب وعجم شیخ مدرسہ کے بارے میں کفر کا فتویٰ دے چکے ہوں اور فقیر اپنی آنکھ سے دیکھ چکا ہو پھر مولوی عبداللہ صاحب اور ان کے مماثلین کی رائے سے برخلاف جماعت کثیر کے کیسے اتفاق کر سکتا ہے. چنانچہ فقیر نے جو خط ان کے خط کے جواب میں تحریر کیا ہے اس کی نقلیں آپ کے پاس بھیجی جاتی ہیں جس سے آپ پر اور جمیع اہل اسلام پر واضح ہو جائے گا کہ فقیر نے اس تعلق کی نہ اجازت دی اور نہ مشورہ بلکہ ممانعت کی ہے، کیونکہ فقیر نے جس صورت میں کہ مولوی فیض الحسن صاحب (سہارنپوری) مرحوم کا وہاں متعلق ہونا گوارا نہیں کیا جو کہ اپنی طرف بے لوث اور قوی الایمان اور معقول آدمی تھے پھر اور کسی کا انتساب کب مناسب سمجھے گا. وجہ اس کی یہ ہے کہ علمائے آخرت اس مدرسہ کے متعلقین کو دیندار نہیں سمجھتے بلکہ لصوص الدین جانتے ہیں خواہ وہ علماء ہوں یا بزرگ زادے، کیوں کہ آخرت میں نہ تو مجرد علم کام آوے گا نہ بزرگ زادگی. خود رسول اللہ ﷺ کے ارشادات اپنی اولاد کے بارے میں وارد ہیں جس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اولاد رسول اللہ ﷺ میں وہ بھی داخل ہے. جس کا عمل اچھا ہے پھر متعلقین مدرسہ علی گڑھ کس شمار میں ہوئے.

رہا خلافت نامہ اس کا حال یہ ہے کہ فقیر خود خلافت دینے کے قابل ہو تو کسی کو خلیفہ بنائے. رہی اجازت، اس کی کیفیت یہ ہے کہ فقیر کے یہاں اجازت کی دو صورتیں ہیں. ایک صورت یہ ہے کہ محض اشارۂ حق سے **مخلصین له الدين** کے لئے اجازت بغیر ان کی طلب اور تمنا کے دی جاتی ہے جن کے ظاہر سے ان کے باطن خود بخود واضح ہوتا ہے.

مشک آنست کہ خود بہ بوید نہ عطار بگوید

کہ عشق و مشک را نتواں نہفتن

دوسری صورت یہ ہے کہ بعضے لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ہم سے اللہ کا نام سیکھنا چاہے تو سکھا دیں؟ فقیر اس کا انکار کس طرح کر سکتا ہے. اس کے جواب میں حقیر اللہ کا نام بتانے کی اجازت دے دیتا ہے بشرطیکہ وہ شخص جامہ پارسائی میں ہو یا پھر اس کے بارے میں فقیر سوئے ظن نہیں کرتا. پھر اگر وہ درخواست کرنے والا اس مضمون کو لکھ لاتا ہے تو فقیر اپنی مہر بھی ثبت کر دیتا ہے. تکثیر اجازت شاہ احمد سعید علیہ الرحمہ کے یہاں بھی تھی اور بعض اکابر سلسلہ مثل شاہ سید احمد قدس سرہ سے بھی یہی مروی ہے. پس اس میں اور خلافت میں بون بعید ہے، ہاں مجاز میں سعی (کی) جو قابلیت (ہے) اس کو کرے اور محبت الٰہی کی علامت جو خود خدا تعالیٰ نے بتائی ہیں یعنی زہد اور تقویٰ بھی اس میں موجود ہے وہ خلیفہ کا مصداق بھی ہو سکتا ہے نہ طماع و دنیا پرست.

بہ نزدیک شب رو بہ راہ زن

بہ از فاسق پارسا مبرھن

فقیر کو حیرت ہے کہ اس مدرسہ میں وعظ کیا ہوتا ہوگا کیونکہ اصلی وعظ جو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو مرغوب اور آپ کا معمول دائمی تھا وہ بجز ترغیب زہد و ترک دنیا کیا ہے. اس مضمون سے نہ وہاں کے واعظوں کو مناسبت، نہ مستعین کو رغبت بلکہ دونوں کی مخالفت میں بظاہر حال کے مطابق بیان ہوتا ہوگا، یعنی شوق دنیا دلاتے ہوں گے. ورنہ دنیا سے نفرت دلانے والا واعظ وہاں ایک دن بھی نہیں ٹھہر سکتا نہ کوئی ترقی. وہی مضمون ہے.

یہ جو آپ نے سنا ہے کہ فقیر نے مولوی عبداللہ کو شبلیٔ وقت لکھا ہے **سبحان اللّٰہ ان ھٰذا لشیٔ عجاب**. اس کے معنی یہ ہیں کہ فقیر اپنے تئیں جنید وقت سمجھا ہے، حالانکہ فقیر کی کیفیت یہ ہے کہ

عالم ہمہ آوازۂ ما دارد و ما ہیچ

مشار الیہ کا ایک خط علی گڑھ سے مولوی ابواحمد کے نام بمبئی سے آیا ہے اس

کی ایک نقل یہاں بھی آئی ہے اس میں زیب قلم فرمایا ہے کہ مدرسۃ العلوم جو آ کر دیکھا تو فی الواقع جو افواہ عوام الناس میں ہے اس کا عشر عشیر بھی یہاں نہیں. انتہی کلامہ الشریف.

تعجب ہے کہ انہوں نے نہ تفسیر نیچریہ دیکھی، نہ **تہذیب الاخلاق** کا کوئی پرچہ، نہ کوئی لکچر، نہ کوئی مسدس، نہ کوئی اور مطالعہ، نہ ان حضرات کی علمائے دین کی تردیدات نیچریہ ملاحظہ فرمائیں. فقط عوام الناس کی افواہ سے سننا، اور کچھ نہ سننا نہ دیکھنا، ایسے ہی ضرر دیوے. کیا صرف ان کی خداوند کریم نے قرآن پاک میں خبر دی ہے جو کچھ خبر دی ہے **قبح من قبیح العرض**.

فقیر کے نزدیک عالم اس کو کہتے ہیں کہ اپنی ضرورت دنیا کے وقت جب دنیا کا دین سے مقابلہ ہو تو دین کو اختیار کرے اور دنیا کو منہ نہ لگا دے کیوں کہ امتحان کا وقت یہی معلوم ہوتا ہے کہ نامردی و مردی قدے فاصلہ دار دوار دہے.

مکرر یہ کہ مولوی عبداللہ صاحب کا خط جو اس مضمون پر شامل ہے کہ احقر نے ان کو اجازت نہیں دی، چنانچہ اس کی نقل بھی ارسال ہوتی ہے فقیر اپنی اس تحریر کی شہادت میں چند حاضرین کے دستخط کرا کے بھیجتا ہے.

و کفیٰ باللّٰہ شہیدا

اضعف العباد احقر امداد اللہ (مہر امداد اللہ فاروقی)

محب الدین بقلم خود

عزیزم مولوی تہور علی کی زبانی یہاں کے حالات معلوم ہوں گے متعلقین کو فقیر کی جانب سے سلام و دعاء کہہ دیجیے. احقر العباد امداد اللہ

دلدہی کی متواتر کوشش

خیال ہے کہ مولانا عبداللہ انصاری نے اس کی بھی معذرت اور صفائی پیش کی ہوگی جو شاید حضرت حاجی امداد اللہ کے یہاں مقبول نہیں ہوئی، لیکن مولانا عبداللہ انصاری ہمیشہ اس کی کوشش کرتے رہے کہ ان کی دینی خدمات کی تفصیل و اطلاعات حضرت حاجی امداد اللہ کی خدمت میں پہنچتی رہیں اور مولانا عبداللہ انصاری کی طرف سے حضرت حاجی

امداداللہ کا دل صاف اور بے غبار ہو جائے.

مولانا محمد سعید کیرانوی، حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی بانی مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے بھتیجے تھے اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی وفات ۱۳۰۸ھ (۱۸۹۰ء) کے بعد سے مدرسہ صولتیہ کے ناظم ہوئے. وہ حاجی امداداللہ کی خدمت میں ہمہ وقت کے حاضر باش اور معتمد تھے. ایک بار جب وہ اپنے سفر ہندستان کے دوران علی گڑھ پہنچے تو مولانا عبداللہ انصاری خود ان کے پاس آئے اور ان کو اپنے تمام کام اپنی دینی خدمات اور کالج کی مذہبی کیفیت اور شعبہ کا تفصیلی معائنہ کرایا. مولانا عبداللہ انصاری چاہتے تھے کہ مولانا محمد سعید کیرانوی ایک چشم دید گواہ کی حیثیت سے حضرت حاجی امداد اللہ سے عرض کر دیں اور یہ مشکل حل ہو جائے. مولانا محمد سعید کیرانوی نے اپنے سفر علی گڑھ کے احوال میں اس کا ذکر کیا ہے.

> دوسرے سفر میں بھوپال سے واپس آتے ہوئے راستہ میں علی گڑھ ایک دوست کے پاس ٹھہرا. یہ وہ زمانہ تھا جب مولوی عبد اللہ انصاری کالج میں ناظم دینیات تھے. مولوی صاحب نے میرا آنا سنا اور ملنے کی غرض سے کرم فرمایا. حضرت حاجی صاحب مولوی صاحب کے قیام و تعلق ملازمت کالج سے کچھ خوش نہ تھے. مولوی صاحب چاہتے تھے کہ اپنے کام اور دینی خدمات کے متعلق مجھے اپنی صفائی میں عینی شہادت کی حیثیت سے حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں پیش کر سکیں. (۳)

سلسلۂ معرفت وارشاد

اگر چہ حضرت حاجی امداداللہ، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے وابستگان کو حضرت حاجی امداداللہ کی اس ناراضگی اور علی گڑھ کی ملازمت کی ناپسندیدگی کا خاصا علم تھا مگر اس کی وجہ سے حاجی امداد اللہ سے مولانا عبداللہ انصاری کے انتساب اور سلسلہ ارشاد و معرفت کو نقصان نہیں ہوا. مولانا عبداللہ انصاری کا حلقہ اصلاح و تربیت بدستور جاری رہا جس نے حضرت حاجی امداداللہ کی وفات ۱۳ جمادی الثانی ۱۳۱۷ھ (۱۹ اکتوبر ۱۸۹۹ء) کے بعد خاصی وسعت اختیار کر لی تھی.

مولانا عبداللہ انصاری کے مریدین و متعلقین کی رہنمائی اور معاملات کے لئے ان کا سلسلہ ارشاد و بیعت جس میں شجرہ مشائخ اور متوسلین کو ابتدائی ضروری ہدایات بھی ہوتی تھیں چھپا ہوا تھا اور مولانا عبداللہ انصاری کے معاصرین خصوصاً انبہٹہ والوں میں حاجی امداد اللہ کا خلیفہ ہونے کی وجہ سے مولانا عبداللہ انصاری کا اعتراف اور احترام تھا.

مولانا عبداللہ انصاری کے زندگی کے آخری دور میں انبہٹہ کے اہل علم کے قلم سے جو تذکرے چھپے ہیں ان میں مولانا عبداللہ انصاری کو حاجی امداداللہ کی اجازت وخلافت اور مولانا کے حلقہ ارادت کا ذکر آیا ہے. مولانا مشتاق احمد انبہٹوی نے **التحفة الصادقیه** میں لکھا ہے:

یہ حضرت آج کل کالج مسلمانان علی گڑھ کے ناظم دینیات ہیں اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے خلیفہ ہیں اور مدرسہ اسلامیہ قصبہ کے بھی مہتمم ہیں. (۴)

مولانا مشتاق احمد انبہٹوی **انوار العاشقین** (مطبوعہ ۱۳۳۲ھ) میں لکھتے ہیں:

عاجز کے مکرم مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی اور مولانا کرامت اللہ خاں صاحب دہلوی بھی حضرت حاجی صاحب قبلہ کے مشہور خلفاء سے ہیں اور دونوں سے سلسلہ حاجی صاحب کا جاری ہے. (۵)

عشرت علی قریشی **علی گڑھ تحریک: ایک تعارف** میں لکھتے ہیں:

دارالعلوم دیوبند کا قیام ۱۸۶۷ء کو عمل میں آیا اور ۱۸۵۷ء کے بعد علماء نے اپنی کوششوں کو میدانِ جنگ سے ہٹا کر مدرسوں اور مکتبوں کی طرف منتقل کر دیا. دارالعلوم کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی اور سرسید احمد خاں دونوں ایک ہی استاد کے شاگرد تھے دونوں کا مشن ایک تھا. دونوں نے مسلم قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا.... عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ علماء دیوبند سرسید کے قائم کردہ کالج کے مخالف تھے. غالباً یہ بات کسی غلط فہمی پر مبنی ہے. یہ صحیح ہے کہ ہندستان کے علماء عام طور پر سرسید کے مذہبی اعتقادات سے متفق نہیں تھے. ان میں دیوبندی علماء کی تخصیص نہیں تھی. محسن الملک جیسے راسخ العقیدہ حضرات بھی سرسید کے مذہبی اعتقادات سے اتفاق نہیں کرتے تھے. اس کے باوجود انہوں نے سرسید کی تحریک کو

کامیاب بنانے میں بھر پور تعاون دیا. علماء دیوبند کی مخالفت کی بنیاد بھی سرسید کے مذہبی تصورات تھے. یہ ایک دل چسپ حقیقت ہے کہ کالج کے ناظمِ دینیات بانی دارالعلوم دیوبند اور سرسید کے مذہبی اعتقادات کے زبردست مخالف مولانا محمد قاسم نانوتوی کے داماد بھی رہے ہیں. یہ مولانا عبداللہ انصاری کی علی گڑھ آمد اور ناظمِ دینیات کے عہدے پر فائز ہونے ہی کا اثر تھا کہ دونوں ادارے ایک دوسرے کے نہ صرف قریب آ گئے بلکہ بقول خلیق احمد نظامی ''جہاں تک ملک و قوم کے وسیع تر مفادات کا تعلق ہے دونوں مکاتب کے فرزندوں میں کبھی کوئی اختلاف نہیں تھا، بلکہ ان میں ہر طرح کا اتحادِ عمل اور اتفاق رائے ملتا ہے''.

عشرت علی قریشی. **علی گڑھ تحریک**، ص۲۹-۳۰.

سرسید کے نظریات کے رد میں ایک فتویٰ تیار کیا گیا تھا جس پر بہت سے علماء کے دستخط تھے. وہ فتویٰ مولانا نانوتوی کے پاس بھی بھیجا گیا کہ وہ بھی اپنے دستخط کر دیں. انھوں نے کہا کہ وہ سرسید سے تین سوال کریں گے اس کے بعد ہی کوئی قدم اٹھائیں گے. چنانچہ مولانا نانوتوی نے سرسید سے سوال کئے اور فرمایا کہ وہ مطمئن ہیں اور اس فتوے پر دستخط نہیں کریں گے. اس کا ذکر شیخ عبداللہ کی کتاب **تجربات و تاثرات** میں بھی ہے.

حواشی

۱- یہ خط **اصلاح الخیال** کے عنوان سے بعد میں بھی کئی مرتبہ شائع ہوا.

۲- حضرت حاجی امداداللہ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے دونوں گرامی نامے ۱۳۱۱ھ میں صادر ہوئے تھے. حضرت مولانا گنگوہی کے ایک شاگرد و خادم نے اسی وقت (۱۳۱۱ھ) ان مکتوبات کی ایک نقل کی تھی یہ نقل ہمارے ذخیرے میں موجود ہے.

۳- کیرانوی، مولانا محمد سعید عثمانی. **صدائے حرم - روئداد مدرسہ صولتیہ** ۱۳۴۷-۱۳۴۸ھ.

۴- انبہٹوی، مولانا مشتاق احمد. **التحفة الصادقیه** ص ۷. لاہور. ۱۳۲۹ھ.

۵- انبہٹوی، مولانا مشتاق احمد. **انوار العاشقین**. ۸۹. حیدرآباد ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء.

باب : ۵

تدریسی خدمات

تکمیل تعلیم کے بعد ملازمت کا مسئلہ سامنے آیا. مولانا عبداللہ انصاری کا نکاح ہو چکا تھا اس لئے اب مصارف بھی درپیش تھے. چنانچہ وہ ۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲-۱۸۷۳ء) میں تعلیم سے فارغ ہوتے ہی ملازمت پر علی گڑھ چلے گئے تھے. یہ معلوم نہیں کہ یہ ملازمت خاص علی گڑھ میں تھی یا اس کے آس پاس کسی مقام پر. دارالعلوم دیوبند کی ۱۲۸۹ھ کی روداد سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ملازمت پر (کول) علی گڑھ چلے گئے تھے. مدرسہ دیوبند کی جانب سے مولانا عبداللہ انصاری کو جو سند دی گئی تھی اس کے آخر میں یہ صراحت درج ہے.(۱)

سرسید کے کالج میں آنے سے بہت پہلے سے مولانا عبداللہ انصاری کا رابطہ اور خط و کتابت علی گڑھ کے نامور عالم اور مدرس مولانا لطف اللہ علی گڑھی سے تھی. انہوں نے کالج کے شعبہ دینیات کی نظامت و ملازمت قبول کرنے کے لئے بھی مولانا لطف اللہ علی گڑھی سے مشورہ کیا تھا اور ان کے مشورہ کے بعد ہی وہ ملازمت منظور کی تھی.(۲)

جیسا کہ بیان میں آچکا ہے کہ پہلی ملازمت پر مولانا عبداللہ انصاری کچھ زیادہ مدت نہیں رہے اور دیوبند واپس آکر مزید تعلیم میں مشغول ہو گئے تھے. پھر دو سال دیوبند میں گزار کر گلاوٹھی، ضلع بلندشہر، کے مدرسہ منبع العلوم میں مدرس ہو کر پہنچے.

منبع العلوم گلاوٹھی میں تقرر

دارالعلوم دیوبند کا آغاز برصغیر میں اُمت مسلمہ کے لئے ایک نیا دینی تعلیمی تجربہ اور نئے مستقبل کی تعمیر و تشکیل کی نوید تھا. عوام و خواص میں جس طرح دارالعلوم دیوبند کی غیر معمولی پذیرائی ہوئی اس سے اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ ملت پیاسی تھی اور اس کی روح کو

اطمینان کا سامان اور دینی تعلیم کی دولت ضرورت تھی۔ وہ اس بڑے مقصد اور نیک کام کی پذیرائی کرنے اور اس کے زیادہ سے زیادہ تعاون کے لئے چشم براہ اور تیار بیٹھی تھی۔ چنانچہ دارالعلوم میں جب بہت دور دراز سے طالب علم آنے شروع ہو گئے اور تعلیم کی ابتداء ہی سے اچھے اثرات کی امید ہوگئی تو ضروری تھا کہ اس دولت اور فکر کو عام کیا جائے اور دارالعلوم کے مستقبل کو دیکھتے ہوئے اس کے معاون مدارس کی تاسیس و تعمیر اور ان پر بھرپور توجہ بھی وقت کا ایسا تقاضہ تھا جس سے صرف نظر ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دارالعلوم کے مقصد و منہاج کو آگے بڑھاتے ہوئے اسی طرز کے کئی چھوٹے بڑے مدرسہ قائم کرنے کا منصوبہ بنایا جس کے نتیجہ میں کم سے کم چھ مدرسے قائم ہوئے جو بفضلہ تعالیٰ ترقی کرتے ہوئے بام عروج پر پہونچے۔ ان میں اکثر اب بھی اعلیٰ درجہ کی علمی اور تعلیمی خدمت کر رہے ہیں۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی کے قائم کئے ہوئے مدرسوں میں سے ایک مدرسہ منبع العلوم میرٹھ کے قریب گلاوٹھی میں شروع کیا گیا تھا۔

مدرسہ منبع العلوم کا افتتاح یکم محرم الحرام ۱۲۹۳ھ (۲۹ جنوری ۱۸۷۶ء) کو ہوا اور مولانا عبداللہ انصاری اس کے مدرس اول مقرر ہوئے۔ دارالعلوم دیوبند کی روداد ۱۲۹۳ھ میں لکھا ہے:

> مولوی عبداللہ صاحب انبہٹوی ضلع سہارن پور (مدرس مدرسہ) گلاوٹھی ضلع بلند شہر مدرس اول عربی تنخواہ عہد معرفت مدرسہ ھذا۔(۳)

روداد کی اس واضح عبارت سے سید محبوب رضوی کی اس اطلاع کی تردید ہو جاتی ہے کہ منبع العلوم میں مولانا عبداللہ انصاری کا تقرر ۱۲۸۷ھ میں ہو گیا تھا۔(۴) روداد کی صراحت سے قطع نظر سید محبوب رضوی کی اطلاع اس لئے بھی غلط ہے کہ ۱۲۸۷ھ (۱۸۷۰-۱۸۷۱ء) میں مولانا انصاری کا گلاوٹھی میں مدرسی یا ملازمت قبول کرنا متوقع ہی نہیں تھا کیونکہ اس کے پانچ سال بعد تک وہ مدرسہ دیوبند میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اور ۱۲۸۷ھ میں ان کا سلسلہ تعلیم درمیان میں تھا، تکمل نہیں ہوا تھا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی سے قریبی رشتہ داری، تلمذ اور ہر وقت حاضر

باشی کے مراسم کے باوجود اپنی تعلیم چھوڑ کر مدرسہ سے رخصت ہو جاتے اور وہ مدرسہ ان کو ملازمت دے دیتا جو خود مولانا محمد قاسم نانوتوی کی نگرانی وسرپرستی میں چل رہا تھا.

گلاوٹھی میں تقرر کے وقت مولانا انصاری کی تنخواہ پندرہ روپے ماہوار مقرر ہوئی تھی. بعد میں ترقی ہو کر پچیس روپے ہوگئی تھی. بیس روپے تنخواہ کا علم مولانا محمد یعقوب کے ایک خط سے ہوتا ہے، مولانا نے لکھا ہے کہ:

> اورتم نے . . . مولانا عبداللہ کا حال پوچھا ہے وہ گلاوٹھی کے مدرسہ میں بیس روپے کے مشاہرہ پر مدرس ہیں اور وہاں خوش ہیں (۵)

مدرسہ دیوبند کی روداد میں بھی ایک موقع پر اس کی صراحت ہے. پچیس روپے تنخواہ کا ذکر سید محبوب رضوی نے بھی کیا ہے.

مدرسہ منبع العلوم اس وقت تمام تر منشی سید مہربان علی کی فیاضی سے چل رہا تھا. مدرسین کی تنخواہیں اور مدرسہ کے تمام مصارف جو پچاس روپے ماہوار تھے منشی سید مہربان علی اپنی جیب خاص سے ادا کرتے تھے. مدرسہ دیوبند کی روداد میں منشی سید مہربان علی کی اس سخاوت وفیاضی کا کئی مرتبہ ذکر آیا ہے.

مولانا عبداللہ انصاری کی تحریر سے یہ تاثر ملتا ہے کہ گلاوٹھی میں ان کا قیام طویل نہیں ہوا. غالباً ۱۲۹۹ھ یا اس سے پہلے ہی ۱۲۹۷ھ میں مدرسہ منبع العلوم کی ملازمت ترک کر کے وطن واپس آگئے تھے. کچھ دن بعد مدرسہ تھانہ بھون میں تقرر ہو گیا تھا.

تھانہ بھون کا مدرسہ

دینی مدرسے قائم ہونے کی جو روایت دارالعلوم دیوبند کے قیام سے شروع ہوئی تھی اس کا ہر جگہ زوردار استقبال ہوا اور لوگوں نے اپنے علاقوں میں اسی قسم کے مدرسے قائم کرنے کی کوشش کی. تھانہ بھون میں وہاں کے ایک دولت مند صاحب خیر اور نیک شخص حافظ عبدالرزاق صاحب نے ایک دینی مدرسہ اور انجنیر نگ کالج کی بنیاد ڈالی. مدرسہ کے لئے جو جگہ منتخب کی گئی تھی وہ خانقاہ حضرت حاجی امداد اللہ سے ملحق مسجد پیر محمد خاں کے ساتھ تھی؛ اب

احاطہ خانقاہ میں شامل ہے.

حافظ عبدالرزاق صاحب کے مدرسہ کا آغاز ۱۲۸۹ھ میں ہوا تھا اور تین چار سال کی محنت اور حافظ صاحب کے اخلاص محنت اور فیاضی کی بدولت اس کے تعارف کا دائرہ خاصا وسیع ہو گیا تھا بس میں متوسط کتابوں تک عمدہ تعلیم ہو رہی تھی. مدرسہ کی رفتار ترقی، تعلیم کا طریقہ اور طلباء کی تعداد قابل تعریف تھی. اخراجات کا بڑا حصہ خود حافظ عبدالرزاق صاحب دے رہے تھے مگر ان کے اخلاص کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے یہ سوچ کر کہ یہ مدرسہ علمائے دیوبند کی نگرانی و سرپرستی میں زیادہ بہتر رہے گا تو ۱۲۹۱ھ میں مدرسہ کا انتظام دارالعلوم دیوبند کے سپرد کر دیا اور خود اس کے ایک مدرس و خادم کی حیثیت سے رہے.

ارباب دارالعلوم نے بھی اس عنایت و کشادہ قلبی کا استقبال کیا اور مدرسہ تھانہ بھون کو دارالعلوم کی ایک ملحقہ شاخ کے طور پر قبول کر لیا(۶) اور اس کے بعد سے دارالعلوم دیوبند کی سالانہ روداد میں مدرسہ تھانہ بھون کا بھی تفصیلی تعارف و تذکرہ ہونے لگا.

مدرسہ تھانہ بھون سے وابستگی

تھانہ بھون کے مدرسہ سے مولانا عبداللہ انصاری کا پرانا رابطہ تھا. قیام مدرسہ کے بعد وہ کئی مرتبہ امتحان لینے کے لئے گئے وہاں گئے تھے اس کی اور نشستوں میں بھی شرکت کی اور طلباء کو انعامات تقسیم کئے تھے. دارالعلوم دیوبند کی روداد ۱۲۹۱ھ میں یہ اطلاع درج ہے:

> ۲۷ شعبان المعظم ۱۲۹۱ھ کو اس مدرسہ کا امتحان سالانہ مولوی محمد محمود صاحب مدرس سوم مدرسہ عربی دیوبند و مولوی عبداللہ صاحب گوالیاری و مولوی عبدالعزیز خاں صاحب دیوبندی نے امتحان تقریری طلبہ کا لیا اور حسب قاعدہ مجوزہ مدرسہ دیوبند کے نمبر قائم کئے. چنانچہ نتیجہ امتحان سے جس وقت حافظ صاحب موصوف سرپرست مدرسہ کو اطلاع دی گئی حافظ صاحب موصوف نے پندرہ روپیہ واسطے کتب انعامیہ مدرسہ کے عنایت کئے کہ ان کی کتابیں خرید کر کے ۳۱ ماہ ذی الحجہ یوم جمعہ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں بہ مجمع عام روبروے جناب مولوی شیخ محمد صاحب و مولوی عبدالحکیم صاحب و حافظ محمد امیر صاحب و داروغہ محمد حسین صاحب و منشی

عبدالحق وغیرہ صاحبان و دیگر رؤساء تھانہ بھون کے مولوی عبداللہ صاحب انبہٹوی خلف اصغر مولوی انصار علی صاحب مرحوم و مولوی عبداللہ صاحب گوالیاری نے ۱۴ طلبہ عربی و فارسی و قرآن شریف کو انعامات تقسیم کئے۔

ہمیں امید ہے کہ خیر خواہان تعلیم جب ایک شخص باہمت کی دستگیری سے قیام اس مدرسہ کا دیکھیں گے تو بے ساختہ زبان سے مرحبا فرمائیں گے اور ایسے شخص کی بہبودی دارین کے لئے دعاء کریں گے۔ (۷)

مہتمم دارالعلوم دیو بند کی جانب ۱۲۹۲ھ میں بھی مولانا عبداللہ انصاری مدرسہ تھانہ بھون کے امتحان کے لئے نامزد کئے گئے اور وہ تھانہ بھون آئے۔ اس سال عربی کی جماعت میں ۱۲، فارسی میں ۲۳، قرآن پاک کی جماعت میں ۲۲ طلبہ موجود تھے۔ حفظ کے درجات کے علاوہ ہر ایک طالب علم نے تیرہ سے تین عدد تک متعدد کتابیں پڑھیں تھیں تقریباً ہر ایک نے اپنی اپنی کتاب میں اچھے نمبر حاصل کئے اور کامیاب ہوئے۔ اس امتحان کے نتائج دارالعلوم دیو بند کی روداد ۱۲۹۲ھ میں چار صفحات پر چھپے ہیں۔

مدرسہ تھانہ بھون کا ایک اعزاز یہ ہے کہ برصغیر کے ایک ممتاز عالم حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ابتداء سے عربی کی اعلیٰ متوسط کتابوں تک اسی مدرسہ میں پڑھی تھیں۔ مدرسہ کی تمام رپورٹوں اور امتحانات کے گوشوارہ میں ''اشرف علی'' کا نام ان کی زیر تعلیم کتابوں اور امتحان میں حاصل نمبروں کا اندراج ہے۔

تھانہ بھون میں ہندو طلبہ

اس ضمن میں ایک اور بات یہ قابل ذکر ہے کہ مدرسہ تھانہ بھون میں ہندو طلبہ کا بھی بے تکلف داخلہ ہوتا تھا۔ مدرسہ کی روداد تعلیم میں بنواری لعل، دلیپ سنگھ، میاری لعل، کندن لعل، کلیان سنگھ، رام پرشاد، بہادر، درگا اور رام سرن کے نام شامل ہیں۔ ان میں سے اکثر فارسی اور حساب پڑھتے تھے نیز اپنے سبق اور کتابوں میں مسلمان طلبہ کے شریک تھے۔

مدرسہ میں نصاب تعلیم بہت اچھا تھا طلبہ پر خوب محنت کی جاتی تھی طلبہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہوتے تھے۔ اسی حسن توجہ کی بدولت مدرسہ نے تین چار سال میں ایسی

عمدہ اور تیز رفتار ترقی کی تھی کہ جس مدرسہ کی ابتدا ۱۲۹۰ھ میں حفظ قرآن اور فارسی کی ابتدائی کتابوں سے ہوئی تھی وہاں چار سال بعد ۱۲۹۴ھ (۱۸۷۷ء) میں حدیث شریف اور فنون کی اعلیٰ کتابیں صحیح مسلم، سنن ترمذی، ابن ماجہ، جلالین اور میبذی وغیرہ پڑھائی جا رہی تھیں.

مولانا عبداللہ انصاری نے تعلیمی سال ۱۲۹۷ھ کے آغاز (شوال/ستمبر ۱۸۸۰ء) میں مدرسہ تھانہ بھون کے سربراہ کی حیثیت سے کام شروع کیا تھا. مدرسہ کی ترقی میں ان کا بڑا حصہ تھا. ان کے حسن انتظام سے مدرسہ کی تعلیمی حالت میں ترقی ہوئی. ایک خدمت یہ انجام پائی کہ مولانا عبداللہ انصاری نے مدرسہ کے لئے ایک مستقل عمارت بنوادی. یہ عمارت مسجد پیر محمد شاہ (خانقاہ امدادیہ) کی شمالی دیوار سے متصل تھی اس سمت میں تعمیر شدہ کمرے، برآمدہ اور اس کے تمام ملحقات مولانا عبداللہ انصاری کے دور اہتمام کی یادگار ہیں.

مولانا عبد اللہ گنگوہی (م:۱۵ رجب ۱۳۳۹ھ/ ۲۶ مارچ ۱۹۲۱ء) مصنف **تیسیر المیبذی** اور **تیسیر المنطق** نے خانقاہ امدادیہ اور اس میں شامل عمارت کا ایک تعارف **ظِلّ صُفّہ** کے عنوان سے مرتب کیا تھا اس میں لکھا ہے:

> اگر چہ مکان مدرسہ وقتاً فوقتاً بدلتا رہا، لیکن آخر کار اسی مسجد میں مدرسہ قائم ہوا، اور اس کی آبادی کی طرف مولوی عبداللہ انصاری انبہٹوی نے توجہ کی اور انہوں نے ۱۳۰۱ھ میں یا اس کے پس وپیش میں دو بیچ درے آگے پیچھے اور اسی طرح جنوب کی جانب دو سہ دریاں تعمیر کرائیں. (۸)

دارالعلوم دیوبند کی روداد میں مدرسہ تھانہ بھون کی تعلیمی کارگذاری، زیر تعلیم طلبہ، کتابوں کی فہرست، امتحانات کے نتائج، مدرسہ کے چندہ کا حال اور متعلقہ معلومات ۱۲۹۴ھ تک چھپتی رہیں مگر مولانا عبداللہ انصاری کے آنے کے بعد (یا شاید اس سے ایک سال پہلے سے) جب مدرسہ کا کام بہت بڑھ گیا تھا تو اس کی علیحدہ روداد خود مدرسہ تھانہ بھون کے اہتمام سے چھپنے لگیں.

اس میں شک نہیں کہ مولانا عبداللہ انصاری کے آنے سے اس مدرسہ میں نہایت رونق اور بہار آگئی تھی اور اس نواح میں تھانہ بھون کا مدرسہ - جس کو آجکل مدرسہ خانقاہ

کہتے ہیں - اچھا علمی تعلیمی مرکز اور قابل قدر مدرسہ بن گیا تھا.

مولانا عبداللہ انصاری نے ۱۳۰۸ھ میں سفر حج کا ارادہ کیا تو مدرسہ سے رخصت ہو گئے تھے.

یہاں یہ بھی ذکر کر دینا چاہئے کہ مدرسہ تھانہ بھون کے بانی حافظ عبد الرزاق صاحب کی وفات کے بعد حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے والد ماجد منشی عبدالحق، جو لال کرتی میرٹھ میں ملازم تھے، مدرسہ کے مہتمم بنا دیئے گئے تھے. مدرسہ کی خاص جائیداد بھی تھی. منشی عبدالحق کی وفات کے بعد ۱۳۱۵ھ (۱۸۹۸ء) میں یہ مدرسہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی تولیت اور سر پرستی میں آ گیا تھا. اس وقت تک اس مدرسہ کا بہت اچھا انتظام تھا. مدرسہ کے معمولات اور سبق پابندی سے جاری تھے. سالانہ روداد بھی عموماً وقت پر چھپتی تھی.

مدارس سے متعلق رائے اور نظریات

جو مدرسے مولانا عبداللہ انصاری کے زیر انتظام رہے تھے یا جہاں وہ تدریس و انتظام سے متعلق رہے ان کے متعلق بہت کم معلومات دستیاب ہیں، مگر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان مدرسوں کی تعمیر و تشکیل میں دارالعلوم دیوبند کے بنیادی فکر اور مقاصد کی شمولیت کے علاوہ خود مولانا عبداللہ انصاری کے علمی ذوق کا بھی خاصا حصہ تھا، نیز مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیمی ضرورت کے ہمہ گیر احساس اور مدرسوں کے عام ہونے سے جو بعض مسائل پیدا ہو گئے تھے اور مدرسہ کے اساتذہ اور طلبہ میں جو کمزوریاں در آئی تھیں ان پر بھی مولانا عبداللہ انصاری کی خاص نظر تھی.

تعجب ہے کہ دارالعلوم کے قائم ہونے کے پچیس، چھبیس سال بعد جب کہ ان مدرسوں کی پذیرائی کا شور تھا مولانا عبداللہ انصاری نے ان کی بعض خامیوں کا اس طرح احساس کیا اور اس کے لئے اس قدر فکرمندی ظاہر کی کہ اس وقت ان کو شاید ضرورت سے زیادہ احساس یا غیر متوقع خطرات کی نشان دہی سمجھا گیا ہو گا مگر بعد میں وہ تمام اندیشے حقیقت بن کر سامنے آ گئے.

ندوۃ العلماء کی تاسیس میں حصہ

مدرسہ مفید عام کانپور نے ۱۳۱۱ھ میں علماء کا ایک کل ہند اجلاس طلب کیا تھا جو ندوۃ العلماء کی بنیاد ثابت ہو. اس میں مولانا عبداللہ انصاری بھی مدعو تھے. یہ واقعہ علی گڑھ میں مولانا عبداللہ انصاری کی ملازمت کے زمانہ کا ہے. وہ اجلاس ۱۵-۷ شوال ۱۳۱۱ھ (۲۳-۲۵ اپریل ۱۸۹۴ء) میں منعقد ہوا تھا. اس اجلاس کا تذکرہ سن کر مولانا عبداللہ انصاری کو خاص مسرت ہوئی تھی اور انہوں نے اس نادیۃ العلماء اور اس کے مقاصد کی بھر پور تحسین و معاونت فرمائی اور اس جلسہ میں پڑھنے کے لئے ایک مفصل تحریر بھی مرتب کی جس میں اس اجلاس کو وقت کی اہم ضرورت بتاتے ہوئے علمائے کرام اور اہل مدارس کو اپنے تعلیمی نظام اور نصاب درس میں بنیادی مگر دور رس تبدیلیوں کا مشورہ بھی دیا تھا.

اس تحریر میں بحث کی گئی تھی کہ مروجہ نظام تعلیم کیوں رو بہ زوال ہے، اس میں کیا کمی آ گئی ہے، قدیم طریقہ تعلیم سے اچھے مستعد علماء کیوں تیار ہو جاتے تھے، یہی نصاب اس وقت اس مقصد میں کیوں کامیاب نہیں. اس خطبہ میں انہوں نے ان حالات کے اسباب کا تجزیہ کیا تھا مختصراً یہ ذکر بھی آیا تھا اس زمانہ کی طالب علمی کی مشکلات کیا تھیں کہ طالب علم جو کتاب پڑھنا چاہتے تھے اس کے نسخے کس طرح اور کس درجہ کے دستیاب ہوتے تھے ان پر طلبہ کس قدر محنت کرتے تھے، کتابوں پر اس دور کے اساتذہ کی نظر اور فنی مباحث کے استحضار کا کیا عالم تھا. اور پھر نئے نصاب کے لئے بنیادی نوعیت کے چند مشورے پیش کئے تھے. اس کے اقتباسات آئندہ آ رہے ہیں.

اس موضوع پر مولانا عبداللہ انصاری کی ایسی گہری اور باریک نظر تھی اور انہوں نے ایسی توجہ سے مدرسوں کے نظام اور تعلیمی تربیتی معمولات کو دیکھا اور جانچا پرکھا تھا تو توقع یہ ہے کہ انہوں نے خود ان مدرسوں میں بھی اپنے خاص خیالات فکر اور مقاصد کو شامل کرنے کی کوشش ہوگی جس میں ان کے رسوخ علم نیز حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا مملوک علی نانوتوی سے محبت و قرابت کی وجہ سے زیادہ دشواری پیش نہ آئی ہوگی مگر

مولانا عبداللہ انصاری کے دور کی ان مدرسوں کی رودادیں اور تعلیمی ریکارڈ دونوں ہی تقریباً معدوم ہیں اس لئے اس پہلو پر تفصیل سے کچھ کہنا ممکن نہیں. اگر یہ ریکارڈ مل جائے تو ان کا اس وقت کے نصاب کا، اس کے اثرات کا اور طلبہ کے احوال و کیفیات کا بہتر اندازہ ہو سکے گا. البتہ تھانہ بھون کے مدرسہ کے صرف ایک طالب علم (حضرت مولانا) اشرف علی (تھانوی) کی جس طرح تعلیم و تربیت کی گئی اور منبع العلوم گلاوٹھی سے اس وقت جو اس قدر کثیر فیض ہوا کہ اس کو بعض علوم میں دارالعلوم دیوبند پر بھی ترجیح دی جاتی تھی اور خصوصاً فقہ اور ہیئت وغیرہ کی تعلیم کے لئے ممتاز طلبہ گلاوٹھی کے مدرسہ کا رخ کرتے تھے. اس سے مولانا عبداللہ انصاری کی انتھک محنت اور انقلابی خیالات کا اثر صاف محسوس کیا جا سکتا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ منبع العلوم کی یہ علمی سر بلندی اور عمومی پذیرائی ان کے علمی فکر کا نتیجہ تھا اور اسی اجتہادی فکر اور تجدید پسندی کی بدولت انہوں نے علی گڑھ کو ترجیح دی تھی. یہی نہیں بلکہ ان کی نگاہ ایم. اے. او. کالج کے قیام سے گیارہ سال قبل سرسید کی قائم کی ہوئی سائنٹیفک سوسائٹی پر بھی تھی جس کی گواہ ندوۃ العلماء کی تاسیس میں مولانا عبداللہ انصاری کی شرکت تھی.

حواشی

۱- روداد ۱۲۸۹ھ. مدرسہ دیوبند ص ۳۲ طبع دوم. مطبع قاسمی دیوبند.

۲- روداد نمبر ۱۴۳ اجلاس ٹرسٹیان منعقدہ ۱۳ جنوری ۱۹۰۴، ص ۴ مطبع احمدی علی گڑھ.

۳- روداد ۱۲۹۴ھ، طبع دوم ص ۴۱.

۴- رضوی، سید محبوب. **تاریخ دارالعلوم دیوبند** ص ۱۸۱ (ساہیوال ۱۹۸۰ء)

۵- نانوتوی، مولانا محمد یعقوب. **مکتوبات یعقوبی** مکتوب ۵۴ (شامل بیاض یعقوبی) ص ۵۹-۶۹، تھانہ بھون ۱۹۲۹ء.

۶- روداد ۱۲۹۰ھ. مدرسہ (دارالعلوم) دیوبند ص ۳۶.

۷- روداد ۱۲۹۱ھ. مدرسہ (دارالعلوم) دیوبند ص ۶۵.

۸- گنگوہی، مولانا عبداللہ. **ظلِّ صُفّہ** (حالات مدرسہ تھانہ بھون) ص ۲۲ (ساڈھورہ ۱۳۳۰ھ).

باب : ۶

کالج سے وابستگی

مسلم یونیورسٹی کے سرِ آغاز کے طور پر مدرسۃ العلوم یا ایم.اے.او. کالج کے نظام اور تعمیر و ترقی کا خاکہ ایک دن میں نہیں بن گیا تھا. وہ سر سید کے برسوں کے غور و فکر، لگاتار مشوروں، طویل المیعاد منصوبوں اور دور اندیشی کا مظہر تھا. کالج قائم کرنے سے چند سال پہلے سر سید نے ۱۸۷۱ء (۱۲۸۷-۱۲۸۸ھ) میں خزینۃ البضاعت کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی جس کا مقصد یوں تو کالج کے لئے سرمایہ فراہم کرنا تھا مگر دراصل وہی کمیٹی کالج کے تمام کاموں کی ذمہ دار تھی.

اسی کمیٹی نے کالج کے لئے عام ماحول بنایا اور، اہل علم، اہل کمال اور اصحاب خیر کو اس طرف متوجہ کیا. وہ کمیٹی کالج کی تشکیل و تعمیر کے منصوبہ پر غور کرتی تھی اسی نے کالج کے لئے مناسب جگہ (شہر) کے انتخاب میں علی گڑھ کو پسند کیا تھا اور اسی نے یہ خاکہ بنایا تھا کہ کالج قائم ہونے کے بعد وہاں کیا کرنا ہے. اس کا نظام کیسا ہوگا، تعلیم کی ترتیب کیا ہوگی، مالی وسائل کہاں سے فراہم ہوں گے اور تنخواہوں وغیرہ کی کیا صورت بنے گی. ایسے تمام منصوبوں پر غور کرنا اور ان کا حل تلاش کرنا خزینۃ البضاعت کی ذمہ داری تھی.(۱)

اس کمیٹی کے اجلاس پابندی سے ہوتے تھے جس میں اس کے اکثر ممبر اور وہ صاحبان جو کسی نشست میں شرکت کے لئے خاص طور سے بلائے گئے ہوں سر سید احمد کی تجویزوں پر رائے دیتے، بحث و مباحثہ کرتے، ضوابط و اصول مقرر کرتے اور آئندہ کے لئے راہ عمل طے کرتے تھے. کالج کے طلبہ کے لئے دینیات کی تعلیم کا نظام، نصاب، طریقۂ تعلیم اور طریقۂ امتحانات ہر ایک موضوع پر خزینۃ البضاعت کی نشستوں میں غور و فکر ہوتا تھا.

جس سال مدرسۃ العلوم شروع ہوا اسی سال ۷ جنوری ۱۸۷۵ء کو خزینۃ البضاعت

کے ممبروں نے طے کیا تھا کہ کالج میں اہل سنت والجماعت طلبہ کی مذہبی تعلیم اور اس کے شعبۂ دینیات کی کتابوں، مقدار نصاب کے تعین اور دینیات کے نظام کو درجہ بدرجہ چلانے اور آگے بڑھانے کے لئے ایک علیحدہ کمیٹی مقرر کی جائے.

نصابِ دینیات کمیٹی

خزنیۃ البضاعت کی اس نشست میں اس ذیلی کمیٹی کے لئے سات اصحاب کے نام طے کئے گئے تھے، مزید چھ نام زیر غور تھے. یہ صاحبان کمیٹی کے اجلاس میں موجود نہیں تھے. ان سے منظوری لینے کی ذمہ داری ان صاحبان نے لی تھی جن کو ممبر نامزد کیا گیا تھا اور وہ اس اجلاس میں تشریف فرما تھے. جن صاحبان کی نامزدگی کا فیصلہ ہوا تھا ان میں سے پہلے سات صاحبان کے نام معلوم نہیں، جن سے بعد میں منظوری کی امید تھی وہ یہ تھے:

نواب محمود علی خاں (نواب چھتاری). حاجی فیض احمد خاں. محمد ارشاد علی خاں. مولانا لطف اللہ علی گڑھی. مولانا عبدالقیوم محمد علی. (۲)

سرسید اور مجلس خزنیۃ البضاعت کے ارکان نے نصاب کمیٹی کے ممبران کو اس کا پورا اختیار دیدیا تھا کہ وہ:

> جس جس کو چاہیں کمیٹی مدبرانِ تعلیم مذہب اہل سنت و جماعت کا ممبر مقرر کریں، کسی کو اس میں کچھ مداخلت نہیں. (۳)

طے ہوا تھا کہ یہی صاحبان مذہبی تعلیم کے لئے استادوں کا انتخاب اور تقرر کریں گے اور یہی کتابوں کا انتخاب کریں گے. کمیٹی یہ بھی چاہتی تھی کہ مذہبی تعلیم خصوصاً فقہ کی تعلیم حنفی اصولوں پر ہونی چاہئے کیونکہ تمام اہل ہند سنی حنفی مذہب ہیں. دینیات کی ابتداء سے اعلیٰ درجوں تک تعلیم کے لئے بحیثیت مجموعی تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، عقائد، کلام نصاب میں شامل کئے جاتے تھے، مگر کمیٹی نے کتابیں متعین نہیں کی تھیں، یہ کام نومنتخب ارکان کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا کہ وہ اپنی صواب دید اور مشورہ سے نصاب کی کتابیں مقرر کرلیں.

سرسید چاہتے تھے کہ کالج میں مسلمان طلبہ کی دینی تعلیم کا ترتیب وار عمدہ انتظام ہو

جو سب سے پہلے درجے سے آخر تک چلے، جس میں صرف ونحو کی ابتدائی کتابوں سے دینی نصاب کی تکمیل تک ضروری علوم اور کتابوں کا بہترین انتخاب کیا جائے، جس کو پورا کرنے سے دینی علوم میں اچھی صلاحیت واستعداد حاصل ہو جائے.

تعلیم دینیات کے دو نظام

خود سرسید کی رائے تھی کہ کالج میں دینیات کا نصاب دو قسم کا ہو. ایک ان طلبہ کے لئے جو کالج میں مغربی زبانوں اور نئے مادی علوم کے ساتھ دینیات سے واقف ہونا چاہتے ہیں؛ دوسرا نصاب مکمل دینیات اور اسلامی علوم کا جس سے ہر اک درجہ میں پہلے درجہ کے نصاب سے زیادہ بہتر مفید اور علمی کتابیں ہوں ار طلباء ابتدائی درجوں سے منتہائے تعلیم تک درجہ بدرجہ ترقی کریں اور دینی تعلیم مکمل کرلیں.

یہ دوسرا نصاب ایسے طالب علموں کے لئے تجویز کیا گیا تھا جو مدرسۃ العلوم میں صرف دینیات پڑھنے کے لئے داخل ہونا چاہتے ہوں. اس مقصد کے لئے سرسید نے خزینۃ البضاعت کی دینی کمیٹی کے ممبروں کے نام جو خط لکھا تھا اس میں اس کا مفصل تذکرہ ہے. جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید کے ذہن میں علم کے اعلیٰ مقاصد اور ان کے حصول کے کیا منصوبے تھے اور وہ تعلیم کے نظام میں کیسی تبدیلی لانا چاہتے تھے. سرسید نے اسلامی علوم اور فارسی کی اعلیٰ تعلیم کا جو خاکہ بنایا تھا وہ ذیل کی تحریر سے واضح ہوتا ہے:

> . . . چوتھی عرض یہ ہے کہ سلسلہ کتب درسی مذہبی کا جو آپ مقرر فرماویں اس کے چار درجے حسب تفصیل ذیل ہونے چاہئیں: اول سلسلہ عام ضروری درسی کتابوں کا. یہ سلسلہ صیغہ مدرسہ سے متعلق ہوگا جس کا ذکر طریقہ تعلیم کی دفعہ ۸ میں مندرج ہے. اس درجہ میں جو لڑکے تعلیم پاویں گے ان کی مدت تعلیم جملہ علوم کے لئے پانچ برس مقرر ہے. اس درجہ میں ہر طالب علم کو مذہبی کتابوں کا پڑھنا ضرور ہوگا. اس درجہ کے طالب علموں کی استعداد اس درجہ تک پہنچے گی کہ وہ عربی اور فارسی عبارت معہ قواعد صرف ونحو بخوبی پڑھ سکتے ہوں گے اور عربی وفارسی عبارت کے معنی اور مطلب بخوبی سمجھ سکتے ہوں گے. پس اس صیغہ کے لئے ایسے درجہ کی کتابیں عربی

زبان کی تجویز کی جاویں جو رفتہ رفتہ اس قدر استعداد کے طالب علموں کے مناسب ہوں۔ اور یہ بھی تجویز کیا جائے کہ صرف اور نحو کے کس درجہ تک پہنچ جانے کے بعد عربی سلسلہ مذہبی کتابوں کا پڑھنا شروع کرایا جاوے گا۔ (۴)

کاغذی منصوبہ

خزینۃ البضاعت کی درج بالا تجویزوں اور منصوبوں پر کسی قدر عمل ہوا مگر اندازہ یہ ہے کہ اگرچہ شعبۂ دینیات کی مستقل کمیٹی موجود تھی اور ایک حد تک سرگرم بھی تھی لیکن سرسید نے کالج میں دینی تعلیم کا جو منصوبہ بنایا تھا وہ پوری طرح کبھی بھی روبہ عمل نہیں آیا۔ اسی وجہ کالج کے طلبہ میں دینی تعلیم حاصل کرنے والوں کا اوسط کم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علی گڑھ کالج نے اسلامی علوم کی تعلیم وترقی کا جو منصوبہ بنایا تھا وہ شروع ہی نہیں ہوا، نہ اس طریقہ تعلیم کا کوئی نتیجہ سامنے آیا اور یہ خیال صرف نصاب کی تدوین کی تجویز ہی تک محدود ہو کر رہ گیا جس کا تذکرہ سرسید کے منصوبے میں تھا۔ گویا کالج میں دینیات کے نصاب تعلیم اور دینی علوم کی مکمل تعلیم کا چاند ابھی طلوع بھی نہیں ہوا تھا کہ گہنا گیا اور منصوبہ بے توجہی کی نذر ہو گیا۔

دینیات کا نظام اور ذمہ دار اصحاب

کالج کے قیام کے ساتھ ہی مدرسۃ العلوم میں دینی تعلیم کا نظم جاری ہو گیا تھا تاہم دینیات کا نظام، نصاب، اور طریقۂ تعلیم ابھی واضح نہیں تھا۔ اس وقت جو بھی نظام موجود تھا وہ مفید اور مؤثر تھا۔ طلبہ پر اس کا دینی اخلاقی اثر تھا جس کا اندرون خانہ اعتراف سرسید اور کالج کے ذمہ داروں کو تھا۔

ابتداء سے کالج میں دینیات کی تعلیم اور طلباء کی دینی تربیت کے نگراں اور سربراہ شعبہ عربی کے پروفیسر مولانا (فیض الحسن) محمد اکبر کاندھلوی تھے۔ جب تک مولانا حیات رہے یہ عہدہ انہیں کے پاس رہا۔ ان کی وفات ۵ شوال ۱۳۰۳ھ (۷ جولائی ۱۸۸۶ء) کو اچانک ہو گئی تھی۔ (۵) مولانا محمد اکبر کاندھلوی کے خویش اور کالج کے پرانے ملازم مولوی سعید احمد فاروقی تھانوی ۱۳۰۰ھ (۱۸۸۳ء) میں دارالاقامہ کے نائب منیجر تھے۔ (۶) مولانا

محمد اکبر کاندھلوی کی وفات کے بعد انہیں اس شعبہ کا ذمہ دار بھی مقرر کر دیا گیا تھا. اس وقت تک شعبہ دینیات کے لئے جداگانہ تقرر اور علیحدہ ملازمین اور ذمہ داروں کا انتخاب نہیں ہوتا تھا. کالج کے پرانے استادوں یا ملازمین میں سے کسی کو اس شعبہ میں سے شامل کر لیا جاتا تھا. البتہ مولوی سعید احمد فاروقی تھانوی کی مصروفیات کا دائرہ خاصا وسیع تھا. وہ کالج میں استاد تھے اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے.(۷) انہوں نے مطبع احمدی کے نام سے علی گڑھ میں اپنا ایک پریس قائم کر رکھا تھا جو اچھا اور خاصا مشہور تھا. اس میں کام کی کثرت رہتی تھی. علاوہ ازیں ان کو غیر مسلموں میں تبلیغ اسلام سے بہت دلچسپی تھی اور اس مقصد کے لئے انہوں نے ایک انجمن قائم کر رکھی تھی. ایک ہفت روزہ اخبار **الاسلام** شائع کرتے تھے. اتنی مختلف قسم کی مصروفیات کی وجہ سے مولانا سعید احمد تھانوی شعبہ دینیات کو اتنا وقت نہیں دے سکتے تھے جس قدر ضرورت تھی.

تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ اواخر جون ۱۸۸۶ء سے پہلے ایک نیا خود مختار، فعال شعبۂ دینیات قائم کرنے اور اس کے لئے باصلاحیت پاکیزہ کردار صاحب عمل اور ایسے عالم کے تقرر کی بات سرسید نے طے کر لی تھی جو دینی و علمی لیاقت، وعظ و نصیحت اور اخلاقی حیثیت میں نیک نام ہو، اس کے وعظ و نصیحت اور صحبت و ہدایت کا عوام پر اثر ہو، کالج کی زندگی اس سے متاثر ہو، کالج کے طلباء کے سیرت و کردار پر اسلامی رنگ آئے اور ان کی دینی تربیت ہو جائے.

شعبۂ دینیات میں تقرر کا معاملہ

دینیات کے شعبہ کو علیحدہ ذمہ دار شعبہ بنائے جانے اور اس کے لئے کسی مستند عالم کے تقرر سے اس شعبہ کے خود مختار فعال اور زیادہ مفید ہونے کی توقع تھی. اس منصوبے سے امیدیں اسی وقت پوری ہو سکتی تھیں جب کالج میں کسی ایسے عالم کو بلایا جائے جو علم و صلاحیت کے علاوہ عوام میں بھی مقبولیت اور اثر رکھتے ہوں نیز ان کی خاندانی اور دینی نسبت ایسی ہو جس کی وجہ سے لوگوں کو شعبۂ دینیات اور کالج کی کارگردگی پر اعتماد قائم ہو اور اس کی

طرف سے جو بہت سی غلط فہمیاں عام تھیں وہ ختم ہوں اور وہ عالم دین مثبت فکر کو عام کرنے میں معاون ہوں۔

مناسب عالم دین کی تلاش

سر سید نے کالج میں دینیات کے مستقل شعبہ کو فعال اور بامعنی بنانے کا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبہ کو صحیح طرح سے عمل میں لانے کے لئے ضرورت تھی کہ کالج میں ایسے عالم اور استاد کا تقرر کیا جائے جو کالج کے مسلمان طلبہ کی دینی اخلاقی حالات اور ان کی ترقی یا کمی پر گہری نظر رکھے، جو طلبہ دینی معلومات نہیں رکھتے ان کو صحیح معلومات پہونچائے، جو نماز روزہ اور دینی فرائض اور عبادات کے صحیح طریقہ سے واقف نہ ہوں یا ان کو ادا کرنے میں کوتاہی برتتے ہوں ان کو محبت اور حسن تربیت سے اپنے قریب لا کر اس کو عمل پر تیار کریں اور جو طلبہ دینی معلومات میں کمزور ہوں ان کی رہنمائی اور مدد کریں، ان کے علمی سوالات کے جوابات دے کر ان کو ذہنی طور پر مطمئن کرنے اور ان سب کے بہتر سے بہتر مسلمان اور بہتر سے بہتر انسان بنانے کی کوشش کرے۔

اس مقصد کے لئے سر سید نے کافی غور و فکر کے بعد اپنے واقف تمام علماء کے بارے میں سوچا اور ان کے علاوہ بھی دور دراز تک نظریں دوڑائیں، دوست، احباب اور کالج کے معاونین سے مشورہ کیا۔ بہت تلاش و جستجو کے بعد ان کی نگاہِ انتخاب مولانا عبداللہ انصاری پر گئی۔ اس وقت مولانا عبداللہ انصاری تھانہ بھون کے اسلامی مدرسہ کے نگراں اور سربراہ تھے۔ چنانچہ ان سے رابطہ کے لئے بطور سفارشی مدرسۃ العلوم میں دینی معاملات کے ذمہ دار منشی محمد سعید فاروقی تھانوی کو منتخب کیا گیا جو تھانہ بھون ہی کے رہنے والے تھے۔ مولانا عبداللہ انصاری سے ان کے خاندانی مراسم تھے اور وہ مختلف حیثیتوں سے انہیں جانتے تھے۔

مولانا انصاری سے پہلا رابطہ

سر سید نے مولانا عبداللہ انصاری کو کالج میں بلانے کی غرض سے جو پہلا خط لکھا تھا وہ دریافت نہیں ہوا، لیکن ان کے ایک اور خط سے یہ طے ہو جاتا ہے کہ یہ واقعہ مئی ۱۸۹۴ء

(شوال ۱۳۱۰ھ) کی ابتدائی یا درمیانی تاریخوں کا ہوگا. سرسید کے اسی خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مولانا عبداللہ انصاری کو جو پہلا خط لکھا تھا وہ بھی منشی محمد سعید فاروقی تھانوی ہی کے ذریعہ سے بھیجا تھا. قرین قیاس ہے کہ منشی جی کسی چھٹی یا تقریب کی وجہ سے تھانہ بھون آرہے ہوں گے تو اس وقت سرسید نے وہ خط منشی جی کے سپرد کیا ہوگا.

مولانا عبداللہ انصاری نے اس خط کا امید افزا جواب دیا جس سے یہ توقع ہوگئی تھی کہ وہ اس پیش کش کو قبول کرلیں گے.

سرسید کے دوسرے خط کے مندرجات سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا عبداللہ انصاری نے اس خط کے جواب میں کالج کے دینی ماحول اور کارگذاری کی روداد اور کالج میں خود سے متعلق خدمات کی تفصیلات دریافت کیں اور سرسید نے مولانا کے سوالات کا مفصل جواب لکھا جس میں متوقع سب خدمات کی معلومات اور وہ تمام پہلو درج تھے جو سرسید شعبہ دینیات کے سربراہ کے سپرد کرنا چاہتے تھے اور کالج میں دینی لحاظ سے اس کو کارفرما دیکھنا چاہتے تھے. شعبۂ دینیات کے ذمہ دار کو کیا کیا کرنا ہے اور کس قسم کے نتائج کی ان سے امید کی جائے گی اس کا بھی اس خط میں مفصل تذکرہ ہے.

سرسید نے اس خط میں ہر بات صاف صاف لکھ دی تھی. معاملہ، روابط اور رشتوں کی نزاکت کے پیش نظر سرسید نے نہ تو وہ خط مولانا عبداللہ انصاری کے نام لکھا نہ ان کو براہ راست بھیجا بلکہ منشی محمد سعید فاروقی کے نام ایک خط میں سب باتیں اور معاملات تحریر کئے.

امور دینیات پر وضاحتی مکتوب

سرسید چاہتے تھے کہ مولانا انصاری کے تشریف لانے سے کالج میں ایسی فضا اور ماحول بنے جس سے طلبہ کے دلوں میں نیکی پیدا ہو اور ان کے دل سچائی، باہمی اسلامی محبت کی طرف مائل ہوں، طالب علموں کے دلوں میں نماز پنجگانہ اور باجماعت نماز ادا کرنے کا شوق پیدا ہو اور عقائد کے سلسلے میں صحیح اسلامی فکر کے ساتھ طلبہ کی ذہن سازی ہو.

مولانا عبداللہ انصاری کو اس وقت پچاس روپے مشاہرہ پر بلایا گیا تھا مگر سرسید

کے خیال میں یہ تنخواہ مولانا یا اس شعبہ کے سربراہ کے شایان شان نہیں تھی. انہوں نے مولانا عبداللہ انصاری سے متعلق جو خط ۵ جون ۱۸۹۳ء میں منشی سعید احمد فاروقی تھانوی کو تحریر کیا تھا وہ یہاں من وعن شائع کیا جارہا ہے:

مشفقی منشی حافظ سعید احمد صاحب!

مولوی عبداللہ صاحب کا خط جو آپ نے بھیجا میں نے نہایت خوشی سے پڑھا. قبل اس کے کہ میں اس کا جواب دوں اپنے خیالات کا ظاہر کرنا مناسب سمجھتا ہوں.

سب سے اول یہ بات ہے کہ جس مقصد کے لئے ہم ایک بزرگ اور مقدس شخص کو بورڈنگ ہوس میں رکھنا چاہتے ہیں وہ ایسا ہو کہ درحقیقت اس کام میں اُس کو مالی فائدے پر نظر نہ ہو اور نہ مالی فائدے کو مقدم سمجھے بلکہ اُن کا اصلی مقصد اور اُن کی سچی نیت خالصاً اللہ یہ ہو کہ مدرسۃ العلوم ایک ایسی جگہ ہے جہاں کثرت سے مسلمان نوجوان جمع ہیں، اُن میں نیکی اور اخلاق محمدی اور محبت اسلامی اور پابندی فرائض مذہبی کو پھیلانا اور اُن کے دلوں کو نرمی اور اخلاق سے نہ تشدد اور سختی اور تعصب اور تشقف سے نیکی کی طرف مائل کرنا ایک مذہبی اور ثواب کا کام ہے.

ہزاروں جاہلوں کے مجمع میں وعظ کہہ دینے سے ایسے لوگوں میں جو اِس زمانے کے علوم کی تعلیم میں مصروف ہیں اور نوجوان ہیں نیکی اور اخلاق محمدی کا پھیلانا اور فرائض مذہبی کی طرف مائل کرنا ہزار درجہ بہتر ہے اور اسلام اور قوم کے لئے زیادہ مفید ہے.

پس یہ مقصد ایسے ہی شخص سے حاصل ہوسکتا ہے جس کی نیت اور ارادہ خالصتاً بلا کسی قسم کے لالچ اور دنیوی طمع کے اس کام کے کرنے کا ہو اور یہ سمجھے کہ میں اسلام کی خدمت کرتا ہوں. پس اگر مولوی عبداللہ صاحب اسی نیت سے یہاں آنا چاہیں تو ہماری عین خواہش اور خوشی ہے. علاوہ اس کے میں دنیوی فائدے کی نظر سے دینی کاموں کو انجام دینا یا دلوانا ناجائز بھی نہیں سمجھتا.

مولوی عبداللہ صاحب فرزند ہیں مولوی انصار علی صاحب کے، نواسے ہیں مملوک علی صاحب کے، داماد ہیں مولوی محمد قاسم صاحب کے اور اُن سب

بزرگوں سے مجھے ذاتی واقفیت تھی اور امید ہے کہ ان بزرگوں کی صحبت کے فیض سے مولوی عبداللہ صاحب کی بھی ایسی ہی طبیعت ہے کہ دینی کاموں کو بہ لحاظ دین اور بہ لحاظ محبت اسلام انجام دیں اور اسی خیال سے میں ان کا مدرسہ میں تشریف لانا اور رہنا باعث خیر و برکت سمجھتا ہوں.

مدرسے میں قیام پذیر ہونے میں جن کاموں کے انجام کی اُن سے خواہش ہے وہ یہ ہیں.

اول: مسجد کا اہتمام اور نماز پنجگانہ کا انتظام اُن کے متعلق رہے اور پانچوں وقت کی نماز وہ خود پڑھادیا کریں. اُن کے سبب سے جماعت کو ترقی ہوگی اور طالب علموں کو نماز با جماعت کی زیادہ ترغیب ہوگی.

دوسرے یہ کہ کبھی کبھی جمعہ کی یا اور کسی نماز کے بعد بطور وعظ کے طالب علموں کو کسی قدر نصیحت کر دیا کریں. کالج کے طالب علم خود تعلیم یافتہ ہیں اور متعدد قسم کے علوم سے واقفیت رکھتے ہیں. اُن کے لئے زیادہ تر مفید یہ ہوگا کہ اخلاق اور عادات محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور صحابہ کرام اور دیگر بزرگان دین کی نیکیوں اور حسن اخلاق اور خدا پرستی اور خدا کی محبت اور احکام مذہبی کے خلوص سے ادا کرنے کا، والدین اور استاد کے ادب اور آپس میں مسلمانوں کی ہمدردی، عقائد مذہب اسلام کی خوبی اور سادگی، وحدانیت خدا کی عظمت و شان، قرآن مجید کی خوبی اور جناب رسالت مآب کی ہدایات کی خوبی اور برتری سے وقتاً فوقتاً اُن کو آگاہ کیا جاوے جس سے طالب علموں کے دلوں میں نیکی پیدا ہو اور اُن کے دل سچائی اور باہمی محبتِ اسلامی اور نیکی کی طرف مائل ہوں.

مدرسہ میں شیعہ اور سنی دونوں قسم کے طالب علم ہیں. اُن کو صرف سنی طالب علموں کی ہدایت سے تعلق رکھنا چاہیے اور اس بات کا ہمیشہ خیال رہے کہ کوئی ایسا امر واقع نہ ہونے پائے کہ جس سے مابین سنی اور شیعہ طالب علموں کے کوئی رنجش یا تکرار مذہبی پیدا ہو.

اُن کو اس بات پر توجہ کرنی چاہیے کہ اُن کا ادب اور اُن کی محبت طالبعلموں کے دلوں میں پیدا ہو اور یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ وہ خود طالب علموں کے

ساتھ اخلاق ومحبت سے پیش آویں اور انہیں کا اخلاق ومحبت طالب علموں کی ہدایت میں نیک دلی پیدا ہونے کا ذریعہ ہوگا.

خدا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللهِ لِنْتَ لَهُم (ج) وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (ص) پس علماء کا بھی یہی فرض ہے کہ اس رحمت سے خود فائدہ اُٹھا کر لوگوں کی ہدایت کریں. میرے نزدیک تعصب وتسلب اور تشقف اختیار کرنا خلاف حکم خدا اور خلاف طریقہ محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلاف انسانیت ہے اور اس طریقہ سے ہرگز کسی کو ہدایت نہیں ہوسکتی بلکہ نفرت پیدا ہوتی ہے.

زیادہ تر میرا مقصد یہ ہے کہ طالب علموں کے دلوں میں نماز پنج گانہ اور باجماعت نماز ادا کرنے کا شوق پیدا ہو یا عادت پڑ جاوے. اگر چہ ہمارے کالج میں ایک خاص شخص نماز کی حاضری لینے کو معین ہوتا ہے اور جو لوگ جماعت میں غیر حاضر ہوتے ہیں اُن سے مواخذہ کیا جاتا ہے اور تدارک بھی ہوتا ہے، مگر میری رائے میں اُس سے چنداں فائدہ نہیں. بہتر یہ ہوگا کہ جو شخص حاضری لیتا ہے وہ اُن لوگوں کے نام سے جو بلاوجہ اکثر جماعت سے غیر حاضر ہوتے ہیں مولوی صاحب کو اطلاع کرے گا اور مولوی صاحب کسی وقت اُن کو علیحدہ تخلیہ میں بلا کر نصیحت کریں گے اور سمجھاویں گے کہ نماز پڑھنی اور جماعت میں شریک ہونا چاہیے. اگر کچھ نہیں تو اس طریقے سے شوکت اسلام اور شوکت جماعت مسلمانان ثابت ہوتی ہے. غرض کہ اس قسم کی مشفقانہ نصیحتیں زیادہ کارآمد ہوں گی اور اُن دنیاوی سزاؤں سے جو پرنسپل صاحب نماز کی غیر حاضری کے سبب دیتے ہیں زیادہ تر کارگر ہوں گی.

اسی طرح مولوی صاحب کو معلوم ہو کہ کسی لڑکے کے عقائد مذہبی میں فرق ہے یا اور کسی مذہبی مسئلہ میں اس کو شبہ ہے تو تخلیہ میں مشفقانہ طریق پر اس کو سمجھاویں اور جہاں تک اُن سے ہو سکے اس کے شبہ کو دور کریں.

جو لڑکے قرآن مجید پڑھے ہوئے نہیں ہیں اُن کو مسجد میں صبح کے وقت یا اور کسی وقت تھوڑا تھوڑا قرآن پڑھایا جاتا ہے اور اس کے لئے جداگانہ حافظ مقرر ہے. مولوی صاحب کو مناسب ہوگا کہ اس پر بھی نگرانی رکھیں تا کہ تعلیم قرآن مجید کی

بخوبی جاری رہے. ان کاموں کے سوا کوئی کام مدرسہ کا اُن سے متعلق نہ ہوگا لیکن اگر کوئی طالب علم قرآن مجید کے معنی یا کوئی حدیث کی یا کوئی اور مذہبی کتاب پڑھنا چاہے تو اس کا پڑھانا بھی اُن کی خوشی پر منحصر ہوگا اور امید ہے کہ مولوی صاحب ایسے کام سے انکار نہیں کریں گے.

مولوی صاحب کو دن رات مدرسہ میں ایک خاص مکان میں جو مسجد کے ضلع میں ہوگا رہنا ہوگا اور جن دنوں میں کہ مدرسہ بند ہوتا ہے یعنی مدرسہ میں تعطیل ہوتی ہے اُن دنوں میں اور نیز بحالت ضرورت بحصول رخصت وہ اور جگہ جاسکیں گے اور اسی امر کی بابت نہ بہ معاوضہ انجام امور دینی ہم اُن کو بخوشی معاوضہ دیں گے کیونکہ ان قیود کے سبب وہ اور طریق پر اپنی معاش حاصل کرنے سے معذور ہو جاویں گے.

مگر ہم کو افسوس ہے کہ بالفعل بہ لحاظ حالات مدرسہ ہم اُن کو اس قدر معاوضہ نہیں دے سکتے جس قدر کہ دینا چاہیے. مگر مکان کی درستی فرش وغیرہ سے اور مکان کی روشنی وغیرہ ہم سب مہیا کریں گے. اگر وہ یہ چاہیں کہ اُن کے کھانے کا انتظام بھی ہم اپنے ذمہ لیں تو پچاس روپیہ ماہوار اور اگر کھانے کا انتظام بھی خود مولوی صاحب اپنے آپ کرنا چاہیں تو ساٹھ روپیہ ماہوار اُن کو دیں گے اور اگر ہم دیکھیں گے کہ اس انتظام سے ہمارا مقصد بخوبی حاصل ہوتا ہے تو ہم رفتہ رفتہ اُن کی تنخواہ سو روپیہ تک بڑھا دیں گے. مجھ کو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مولوی صاحب نے تصحیح اور تحشی مثنوی روم کا کام اپنے ذمہ لیا ہے اور اس کا معاوضہ بھی کچھ اُن کو ملتا ہے. اس سے ہم کو کوئی مزاحمت نہیں ہے.

مجھ کو اس بات سے بھی اطلاع دینی ضرور ہے کہ اگر کوئی باہر کا طالب علم اُن سے اُن کے مکان سکونت واقع بورڈنگ ہوس میں آکر پڑھنا چاہے تو بلا خاص اجازت سیکریٹری و پرنسپل کے کوئی باہر کا طالب علم بورڈنگ ہوس میں آمدورفت نہیں کر سکے گا.

میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اُن سب امور سے مولوی صاحب کو اطلاع دیجیے. اگر اُن کو منظور ہو تو میں فی الفور اُن کے رہنے کے لئے ایک مکان منجملہ مکانات متعلقہ مسجد کے تیار کر دوں اور مجھ کو امید ہے کہ جب مولوی صاحب یہاں آئیں گے تو ہر مذہب کے طالب علموں اور کالج کے افسروں سے اپنا

ایسا طریقہ برتاؤ رکھیں گے جو اوروں کے لئے ایک نمونہ اسلامی اور محمدی اخلاق کا ہو گا. فقط. والسلام.(۸)

خاکسار سید احمد

علی گڑھ ۵ جون ۱۸۹۳ء

مولانا عبداللہ انصاری نے سرسید کے خط کے مندرجات سے یقیناً اتفاق کیا اور جیسا کہ سرسید نے لکھا ہے انہوں نے فی الفور علی گڑھ آنے، نظامت دینیات اور اس عہدہ سے متعلق جملہ خدمات انجام دینے کا ارادہ اور وعدہ کر لیا. قرآئن بتا رہے ہیں کہ سرسید کا یہ مکتوب ملنے کے بعد مولانا عبداللہ انصاری کے علی گڑھ آنے اور نظامت دینیات کا کام سنبھالنے میں چند ہفتوں کا وقفہ تھا. سرسید کا وہ خط ۵ جون ۱۸۹۳ء (۱۹ ذی قعدہ ۱۳۱۰ھ) کا لکھا ہوا ہے اگرچہ مولانا کے تقرر اور تاریخ ملازمت کی صراحت نہیں ملی لیکن بظاہر ہجری سال کے آغاز پر شروع محرم الحرام ۱۳۱۱ھ (وسط جولائی ۱۸۹۳ء) میں وہ علی گڑھ آ گئے اور آتے ہی کارِ منصبی سے وابستہ ہو گئے.

تقرر کے بعد ٹرسٹیوں سے گزارش

سرسید نے مولانا عبداللہ انصاری سے منظوری ملنے کے بعد کالج میں ''ایک نہایت مقدس اور ذی علم'' عالم کی ضرورت اور شعبۂ دینیات کی سربراہی کے لئے اس کے تقرر کی اپنی تجویز کو اپنے اس خط کی نقل کے ساتھ جو انہوں نے بذریعہ منشی محمد سعید صاحب فاروقی کو لکھا تھا کالج کے ٹرسٹیوں کے اجلاس منعقدہ ۳۰ جولائی ۱۸۹۳ء (۱۶ محرم ۱۳۱۱ھ) میں پیش کیا.

اجلاس میں اس کی منظوری ہو گئی تو سرسید نے اپنے معمول کے مطابق اپنے دوستوں اور کالج کے ٹرسٹیوں کو لکھا کہ کالج میں ایک نیا تقرر ہوا ہے جس کا ماہانہ خرچ (تنخواہ اور دیگر متعلقہ مصارف) ڈیڑھ سو روپے مہینے کا ہو گا، اور لکھا کہ میں نے یہ طے کیا ہے کہ دو سال تک اس خرچ کو آپس کے چندے اور تعاون سے پورا کیا جائے اس لئے ٹرسٹیوں (اور جن صاحبان کو سرسید نے یہ خط لکھا) چاہئے کہ وہ اس نئے مصرف کے لئے ماہانہ یا ششماہی یا

یک مشت ہی عنایت کر دیں. مخلص ساتھیوں نے چندہ کے لئے سرسید کی آواز خوش دلی سے سنی اور اس پر کشادہ قلبی سے لبیک کہا. اس موقع پر سرسید نے نواب مزمل اللہ خاں کو جو خط لکھا تھا اس میں تقرر اور اس کے لئے چندہ کی صاف گزارش ہے:

اول یہ کہ آپ اُس روئیداد کے صفحہ ۴۴ سے صفحہ ۴۷ تک ملاحظہ فرمادیں جہاں سے کہ تدبیر حفاظت امور مذہبی بورڈنگ ہوس کا ذکر لکھا گیا ہے. یہ بات نہایت ضروری ہے کہ ایک نہایت مقدس اور ذی علم مولوی بورڈنگ ہوس میں اُن مقاصد کے لئے ہیں جس کا ذکر میرے خط موسومہ حافظ سعید احمد میں ہے اور جو صفحہ ۴۸ میں چھپا ہوا ہے مقرر کیا جاوے. اُس کے مقرر کرنے میں معہ دیگر اخراجات کے جو مسجد و نماز سے متعلق ہیں ڈیڑھ سو ماہواری کا خرچ پڑتا ہے اور یہ تجویز ہے کہ امتحاناً مولوی عبداللہ صاحب کو جن کا مفصل حال اُس خط میں مندرج ہے بالفعل اسی روپیہ تنخواہ پر مقرر کیا جاوے.

اور اخراجات کی نسبت یہ تجویز ہے کہ دو برس تک آپس کے چندہ سے اس کام کو جاری رکھا جائے اگر اس سے معلوم ہو کہ اس سے کچھ فائدہ مقصود ہے تو آئندہ مستقل طور پر اس کا انتظام کیا جاوے اور یہ اخراجات بجٹ میں مندرج ہوں.

چند ٹرسٹی صاحبوں نے جن کے نام صفحہ ۴۳، ۴۴ میں مندرج ہیں تھوڑا تھوڑا چندہ ماہواری دینا تجویز کیا ہے جس کی مقدار سینتیس روپیہ ماہواری تک پہونچی ہے اور حاجی احمد سعید خان صاحب نے سو روپیہ یکمشت دے دینے کا وعدہ کیا ہے. چونکہ آپ بھی ٹرسٹی کالج کے ہیں اس لئے آپ سے بھی درخواست کی جاتی ہے کہ اس کام کے جاری کرنے کے لئے آپ بھی بطور امداد جو کچھ دینا چاہیں ماہواری یا ششماہی صرف دو برس کے لئے خواہ یکمشت عنایت فرمادیں. پس جو مرضی آپ کی اس امر کی نسبت ہو اس سے اطلاع فرمادیجئے. (۹)

ایک تلخ حقیقت

یہاں ہمیں ایک تلخ حقیقت کا اظہار کرنا چاہیے کہ صبح شام ایم.اے.او. کالج کا نام لینے والے اور اس کی خدمات و احسانات کا ہمہ وقت ذکر کرنے والے اور اس کے

تقریباً تمام مورخوں نے کالج کی دینی حیثیت، سر سید کے یہاں علماء کی قدر و منزلت، سر سید کے دینی احساس (اختلافی موضوعات کی بحث الگ چیز ہے) اور کالج نیز کالج سے نکلنے والے طلبہ میں دین داری کے احساس اور بحیثیت مجموعی پوری ملت اسلامیہ کے لئے ان کے قابلِ تقلید ہونے اور اس کے ایسے فرزند بننے کے جو بقول سر سید انگریز کی گاڑی کے قلی نہ ہوں بلکہ اُمت کی نشاۃ ثانیہ کا نمونہ ہونے کا بالکل تذکرہ نہیں کیا. مزید یہ ہے کہ کالج میں دینی علوم کی تعلیم، دینی اخلاق و مزاج اور دینی تربیت کو سر سید کس قدر ضروری سمجھتے تھے اور اس کا جو کچھ ذکر سر سید کے مکتوبات، مضامین، خطبات اور کالج کی رپورٹوں میں پایا جاتا ہے اس کو بھی قطعاً نظر انداز کر دیا گیا ہے.

جس کا ایک بُرا اثر یہ ہے کہ کالج کی دینی خدمات سے علماء کے تعلق، وہاں علماء کے متواتر تقرر اور ان کے اثرات ان کی خدمات و تصانیف ابھر کر سامنے نہیں آسکیں. شعبہ دینیات کی کالج سے گہری وابستگی اور شعبۂ دینیات کے تمام سربراہوں، ذمہ داروں، علماء اور لائق فرزندوں کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا حالانکہ یہ تاثر و احساس زندہ رہنا چاہئے تھا کہ کالج دین و دینیات نیز علماء اور اہل دین سے دور نہیں تھا جس کا ہمارے یہاں ہر وقت تذکرہ اور چرچا رہتا ہے. کالج کی ایک باقاعدہ دینی حیثیت بھی تھی جس کا سر سید اور ان کے رفقاء اور کالج کے اس عہد کے معاونین بار بار اظہار کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ اگرچہ اس کا علمی مزاج جدید سائنسی انداز کا ہو مگر دینی فکر کے ساتھ تمام علوم کا رشتہ جڑا رہے.

مورخین کا دانستہ مقاطعہ

تاریخِ علی گڑھ کے مورخین کے اسی دانستہ مقاطعہ کا اثر ہے کہ کالج کے دینی تصور سے بہت کم اہل علم واقف ہیں. اگر اس موضوع پر جی لگا کر سنجیدگی سے کام کیا جائے تو یقیناً کئی اہم اور چونکا دینے والی معلومات وانکشافات سامنے آئیں گی اور خصوصاً سر سید اور ان کے بعد کے قریبی زمانہ میں کالج میں مذہبی رنگ اور اثرات پر تحقیقی مقالات تیار ہو سکتے ہیں. اس دانستہ غفلت کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ شعبۂ دینیات کی معلومات کے لئے خاصی تلاش

کے بعد مواد حاصل ہوسکا ہے لیکن ہم اس سے مطمئن نہیں ہیں. مولانا عبداللہ انصاری جیسے مقتدر عالم کے بتیس سالہ دور نظامت کی کڑیوں کا ڈھونڈنا اور ان کی خدمات کے ہر پہلو سامنے لانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوگیا ہے.

علی گڑھ کالج کے پہلے ڈین

مولانا عبداللہ انصاری کا ایک خصوصی امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ علی گڑھ کالج میں مقرر ہونے والے سب سے پہلے ڈین (dean) تھے. اگرچہ اُس وقت بزرگ تر انتظامی اساتذہ کے لئے کالج میں یہ لقب رائج نہیں تھا لیکن ابتدائی زمانہ کی دستاویزوں میں مولانا عبداللہ انصاری کے لئے یہ لقب استعمال کیا گیا ہے.

مولانا عبداللہ انصاری کا تقرر کالج کے عام ضابطہ سے ہٹ کر سرسید کے ذاتی فیصلے، اختیار خصوصی اور خاص انتخاب سے ہوا تھا، جس میں کالج کے ممبروں اور انتظامیہ کو مداخلت کی اجازت نہیں تھی. اس انتخاب کو خاص شاہانہ اور ایسا انتخاب قرار دیا گیا تھا جس طرح اس وقت برٹش حکومت ججوں کو منتخب کرتی تھی. اس کی تائید و تصدیق **تاریخ ایم. اے. او. کالج علی گڑھ** میں تھیوڈور موریسن کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ:

In the year 1893 Moulwi Abdullah Ansari was appointed to perform function similar to those dean in an English (Cambridge) college.

Morrison, T.S. *The History of the MAO College Aligarh*. Allahabad 1903.

سال ۱۸۹۲ء میں مولوی عبداللہ انصاری کو انگلستانی (کیمبرج) کالج میں ڈین کے جیسے معاملات کی بجا آوری کے لئے مقرر کیا گیا تھا.

ٹی. ایس. موریسن. **دی ہسٹری آف دی ایم. اے. او. کالج** (ایم. اے. او. کالج کی تاریخ) الہ آباد ۱۹۰۳ء.

علیحدہ کرنے کی ناکام کوشش

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے ۱۹۰۳-۱۹۰۴ء میں کسی دوسرے عالمِ دین کے تقرر کی بات اٹھائی تو اس مسئلہ پر ایک اجلاس میں کالج کے ٹرسٹیوں کے درمیان کھل کر

مباحثہ ہوا۔ اکثر ممبروں نے مولانا عبداللہ انصاری کے حق میں رائے دی اور صاف کہا کہ ان کی رائے کے بغیر ایسا کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا اور جب تک خود مولانا عبداللہ انصاری کی طرف سے اشارہ بلکہ اجازت نہ ہو اس وقت تک شعبہ دینیات میں ایسا کوئی تقرر مناسب نہیں جس سے ان کو تکلیف پہنچے۔ اس اجلاس میں منشی نیاز محمد خاں نے اپنی جو رائے لکھی اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مولانا عبداللہ انصاری کا تقرر کس طرح ہوا تھا اور سرسید کے رفقاء کی نظر میں ان کے عہدے کا کیا مقام اور مرتبہ تھا۔ منشی نیاز محمد خاں نے لکھا ہے:

عالم دین کا تقرر بطور ملازم نہیں ہوتا۔ اور نہ مولوی عبداللہ صاحب انصاری کا تقرر بطور ملازم ہوا ہے۔ سرسید مرحوم کی تحریرات جو اس موقعہ پر شائع ہوئیں اور متعدد پرچہ ہائے **انسٹیٹیوٹ گزٹ** میں درج ہیں اگر نکلوا کر دیکھا جائے تو ان سے بالبداہت ظاہر ہوگا کہ مولوی عبداللہ صاحب انصاری کا تقرر بعینہ اسی طریقے پر ہوا تھا جیسا کہ انگلستان میں ججوں کا تقرر ہوتا ہے۔ وہ کسی کے ماتحت نہیں ہوتے۔ اور نہ کوئی انھیں موقوف کر سکتا ہے۔ لیکن جب کسی قدر ناراضگی پاتے ہیں تو از خود مستعفی ہو جاتے ہیں۔ کالج ڈین کے تقرر سے بڑی غرض یہی ہوتی ہے کہ اس کے تقدس کا اثر طلبہ کی مذہبی زندگی پر ہو۔ ڈین ملازم نہیں ہوتا، نہ کسی سب کمیٹی کا شکار ہوتا ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ اسے لکچرار ہونا بھی شاید چنداں ضروری نہیں۔ اسے خود مقدس ہونا چاہئے تا کہ اس کے تقدس کا برقی اثر طلبہ پر ہو۔ جہاں تک مجھے اطلاع ہے مولوی صاحب موصوف کا یہ اثر اکثر طلبہ پر ہے۔ (۱۰)

مولانا عبداللہ انصاری یکسوئی سے اپنا کام کر رہے تھے اور شعبہء دینیات کے تمام ممبر اُن سے مطمئن اور خوش تھے، کہ مولانا عبدالماجد بھاگل پوری کے تقرر کو بنیاد بنا کر چند ممبروں میں اختلاف رائے ہو گیا۔ تاہم ممبروں کی اکثریت نے مولانا عبداللہ انصاری کی پرزور تائید کی اور یہ مسئلہ محسن الملک کی رائے کے بعد کلی طور پر ختم ہو گیا۔ محسن الملک نے فرمایا:

چونکہ یہ نہایت اہم مسئلہ اور ایمان کا معاملہ ہے اس لئے صاف صاف واقعات اور اپنی اصل رائے کا ظاہر کرنا ہر ٹرسٹی پر لازم ہے۔ مجھے اس معاملہ میں پوری واقفیت ہے اور میرا ذاتی تعلق اس سے رہا ہے۔ کمیٹی دینیات میں یہ مسئلہ کہ ناظم دینیات کس

لیاقت اور کس استعداد کا آدمی ہو بارہا پیش ہوا ہے اور اس پر بحث ہوئی ہے اور یہ امر ضروری خیال کیا گیا ہے کہ ایسا شخص ناظم دینیات مقرر ہو جو اپنے وعظ اور تعلیم سے تعلیم یافتہ طلبہ پر اثر ڈال سکے اور جو شکوک اور شبہات لازمی طور پر جدید تعلیم سے طلباء کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں ان کو دور کرنے کی اور عقائد و مسائل شرعیہ کو علوم وفنون جدیدہ کے مسائل کے مطابق یا عدم مخالفت ثابت کرنے کی قابلیت رکھتا ہو۔ (۱۱)

محسن الملک کی رائے کے مطابق ٹرسٹیوں کے اجلاس میں اس پر کھل کر بحث ہوئی۔ تمام ٹرسٹیوں نے اپنی رائے پیش کی۔ اسے کالج کے لئے مولانا عبداللہ انصاری کی خدمات کا اثر کہئے یا ان کی ذات سے کالج کو جو نفع ہوا اس کا تاثر یا ان کی ذاتی خوبیوں اور کمالات کا نتیجہ کہ ٹرسٹیوں کی اکثریت نے اختلافی تجویز کو مسترد کر دیا۔ مولانا لطف اللہ علی گڑھی نے کہا:

میں کمیٹی کا قدیمی ممبر ہوں اگر وہ (سیکریٹری دینیات) مجھ سے خط و کتابت کرتے تو میں یہی لکھتا کہ مولوی عبداللہ صاحب کو بہت سی خصوصیتوں کی وجہ سے ترجیح ہے اور ان وجوہات سے جو سید احمد مرحوم نے بروقت انتخاب اپنی عقل دور بین سے سوچی تھی مولوی صاحب موصوف ہی کا قیام مدرسہ کے حق میں مفید ہے۔ اور میں ان کو ہر طرح اس عہدہ کے لئے موزوں سمجھتا ہوں اور میں ہی وہ شخص ہوں جس نے مولوی صاحب کو بروقت مشورہ مدرسۃ العلوم میں آنے کی اجازت دی تھی۔ اور اب ان کو بلا قصور علیحدہ کرنا بدرجہ غایت غیر مناسب اور کالج پر ایک بدنما دھبہ ہوگا جس کو آپ ہرگز پسند نہ فرماویں گے۔ والسلام مع الاکرام۔

راقم نیاز نامہ
محمد لطف اللہ (۱۲)

نواب وقار الملک نے بھی مولانا عبداللہ انصاری پر اعتماد ظاہر کیا اور اپنی رائے اس طرح ظاہر کی:

جس طریقہ میں کہ موجودہ تحریک کمیٹی دینیات کی تحریک کے نام سے پیش کی گئی ہے وہ ٹھیک نہیں ہے۔ مولوی عبداللہ انصاری کی نسبت مجھ جیسے ایک جاہل شخص

کی تو ہستی ہی کیا ہے، کوئی شخص بھی یہ تو کسی حالت میں کہہ نہیں سکتا کہ دینیات کی تعلیم وتربیت کی ان میں کوئی بھی قابلیت نہیں ہے. ہے اور ضرور ہے اور ضرور ان میں ایسے روحانی اوصاف بھی ہیں جن کا مفید اثر طلباء پر کچھ نہ کچھ ضرور پڑنا چاہیے اور پڑتا ہوگا.

کنور غفور علی نے کہا:

مولوی عبداللہ صاحب نے کالج کی ملازمت اس وقت قبول کی جب کہ کالج میں قدم رکھنا کفر سمجھا جاتا تھا. اب ان کی وجہ سے کالج میں علماء اور مذہبی لوگوں کی آمدورفت کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے. ان کے قیام کالج سے مسلمانوں کو پورا اطمینان ہے. پس میری رائے یہ ہے کہ مولانا عبداللہ صاحب ناظم امور دینیات بدستور قائم رہیں اور میں ان کی علیحدگی کی تحریک کو نامنظور کرتا ہوں.

شیخ الٰہی بخش میرٹھی نے کنور غفور علی کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے اس کو مزید وضاحت کے ساتھ اس طرح پیش کیا کہ:

مجھے اس تحریک سے اختلاف ہے. میں جناب مولوی عبداللہ صاحب کا عہدہ ناظم دینیات پر ہونا موجب خیر وبرکت کا تصور کرتا ہوں. مجھے ان کے خاندانی حالات سے بخوبی واقفیت ہے. ضلع سہارنپور میں وہ جس خاندان کے ممبر ہیں وہ مثل آفتاب کے روشن ہے. مولوی عبداللہ صاحب کے ناظم دینیات پر ہونے سے جو بدگمانی اکثر مجمع علماء قدیم میں جاگزین تھی وہ قریب قریب معدوم کے ہوگئی. مولوی عبداللہ صاحب ایک مقدس صفت کے آدمی ہیں. ان کے تقدس و پاکیزہ نفس ہونے کا اثر طلبہ کی طبیعت پر جو ہوتا ہے وہ زیادہ تر مفید وسریع الاثر ہے.

اراکین کی مجموعی رائے

ٹرسٹیوں کی بحث اور مجموعی رائے کا خلاصہ یہی تھا کہ مولانا عبداللہ انصاری مقدس، بزرگ، باعمل، بابرکت شخصیت اور ایسے شخص تھے جن کی محبت وملاقات کا طلبہ پر اچھا اثر پڑتا تھا اور ان کو سرسید نے کسی خاص مقصد سے کالج کے خاص فائدوں کا خیال

رکھتے ہوئے کالج میں مقرر کیا تھا مولانا عبداللہ انصاری کو کالج میں امور دینی کی نگرانی کرتے ہوئے دس سال گزر گئے تھے مگر ٹرسٹیوں کی اکثریت کا فیصلہ تھا کہ اب تک ایسی کوئی بات یا شکایت نہیں آئی تھی جس سے یہ معلوم ہوتا کہ مولانا اپنے کام میں سستی یا کوتاہی کرتے تھے یا اس منصب کے لائق نہیں تھے. کمیٹی میں ایک تاثر یہ بھی تھا کہ اول تو ان جیسا دوسرا عالم کالج کو ملنا بہت مشکل تھا اور اگر بالفرض ان سے زیادہ بہتر اور زیادہ قابلیت ولیاقت والے کوئی اور عالم کالج والوں کو مل بھی جائیں تو مولانا عبداللہ انصاری کے تقرر کے وقت یہ شرط نہیں رکھی گئی تھی کہ

اگر کوئی دوسرا مولوی ان سے بہتر لیاقت میں مل جائے گا تو وہ برخواست ہوں گے ان کی جگہ دوسرا مولوی مقرر کیا جائے گا.

مفصل بحث میں شامل جملہ ٹرسٹیوں کی رائے مجموعی طور پر ایک ہی تھی کہ مولانا عبداللہ انصاری کی ترقی یا عہدے سے تنزلی بے ضابطہ، نامناسب اور کالج کو بہت نقصان دینے والی تھی اس لئے نامنظور ہے.

تفصیلی بحث کے بعد ووٹنگ ہوئی اور ۲۸ میں سے ۲۳ ووٹ مولانا عبداللہ انصاری کے حق میں آئے، صرف پانچ صاحبان نے ان کی برخواستگی اور نئے تقرر کے حق میں رائے دی تھی. اس طرح وہ تجویز بھاری اکثریت سے رد کردی گئی. اس سے مولانا عبداللہ انصاری کی عزت ووقعت میں اضافہ ہوا اور وہ اس وقت ہی کے لئے نہیں بلکہ پوری زندگی اسی عہدہ پر قائم اور برقرار رہے کسی کو بھی ان کو برطرف بلکہ معطل تک کرنے تک کی جرأت نہ ہوئی جو بذات خود مولانا عبداللہ انصاری کے عزت ومرتبہ اور کمال کا ایک بین ثبوت ہے.

سرسید کی ایک تحریر سے بھی یہی جھلکتا ہے کہ ان کی نظر میں مولانا عبداللہ انصاری کی شخصیت اور ان کا علم نہ صرف یہ کہ قابلِ احترام تھا بلکہ وہ ان کی بزرگی اور للّٰہیت کے معترف تھے. اور جو باتیں تقرر سے پہلے طے کی گئی تھیں ان کے علاوہ کوئی اور کام مولانا عبداللہ انصاری کے سپرد کرنا اچھا نہیں سمجھتے تھے. جب کچھ معلوم کرنا ہوتا تو اس میں ان کے مقام اور مرتبے کا بہت خیال رکھتے تھے. مولانا عبداللہ انصاری کے علی گڑھ میں تقرر اور قیام کے بعد علامہ شبلی

نعمانی نے چاہا تھا کہ قرآن شریف کا جو درس وہ خود دیتے تھے اسے مولانا عبداللہ انصاری کے سپرد کیا جائے. اس وقت سرسید نے شبلی نعمانی کو جو جواب لکھا تھا اس کا ایک فقرہ توجہ طلب ہے:

میں کسی طرح ان کے خلاف مرضی کوئی کام ان کے متعلق کرنا پسند نہیں کرتا مگر میں منشی سعید احمد صاحب کی معرفت مولوی صاحب کی مرضی مبارک دریافت کروں گا.(۱۳)

کالج میں ابتدائی اثرات

کالج میں طلبہ کے دل میں نماز کی اہمیت، اس کے لئے خود امامت اور درس و وعظ کی جن خدمات کا سرسید کے خط میں تذکرہ آیا ہے کہ وہ ابتداء ہی سے نظر آنے لگا تھا مختلف ذرائع سے جو اشارے ملتے ہیں اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ کالج کے نظام الاوقات میں طلبہ کی پنج وقتہ نماز ان کی ذہنی تربیت کے لئے مولانا عبداللہ انصاری مواعظ کا سلسلہ رکھتے تھے. ظاہر ہے کہ جو دینی شعور پیدا ہوا وہ اس بات کا مظہر ہے کہ یہ درس پابندئ وقت کے ساتھ ہوتا ہوگا. مجموعی طور سے یہ علم ہوتا ہے کہ علی گڑھ میں ان کا قیام اور کالج کے طلبہ اور وہاں کے ماحول میں دینی رنگ پیدا کرنے اور طلبہ کو دین سے وابستہ کرنے میں بہت مفید و مددگار ثابت ہوا.

مولانا عبداللہ انصاری نے سب سے پہلے نماز باجماعت کے اہتمام اور نمازوں میں طلبہ کی زیادہ تعداد میں پابندی سے حاضری پر توجہ کی. قرآئن ہیں کہ یہ محنت بارآور ہوئی. ان کے فیض صحبت سے طلبہ میں مذہبی جذبات کی لہر دوڑ گئی. اسلامی عقائد و مسائل سے واقفیت اور دینی معلومات کا شوق بڑھا. تلاوت قرآن کے معمول اور نمازوں کی حاضری میں نمایاں اضافہ ہوا. مولانا عبداللہ انصاری کے طریقۂ اصلاح اور تکلم اور شفقت اور محبت نیطلبہ کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا. طلبہ مولانا کی کلاس سے بہت کم غیر حاضر رہتے اور وہ طلبہ بھی جو مولانا کے شاگرد اور سنی نظام دینیات سے وابستہ نہیں تھے اور اپنی مذہبی کلاسوں سے اکثر غیر حاضر رہتے تھے، مولانا عبداللہ انصاری کے حلقہ درس میں بہت اہتمام اور پابندی سے شریک ہوتے تھے. سر رضا علی لکھتے ہیں:

سنی شیعہ سب ان کے درس میں شریک ہوتے تھے.(۱۴)

اور یہ سب مولانا عبداللہ انصاری کی محنت، صلاحیت اور کمال تربیت کا اثر تھا ورنہ اُس زمانے میں نصاب دینیات نظر ثانی کا متقاضی تھا۔ نواب وقار الملک کا قول ہے: ”میں مقر ہوں کہ نصاب تعلیم دینیات کالج کافی نہیں، اور بہت کچھ نا کافی ہے“۔(۱۵)

مولانا عبداللہ انصاری کی کوشش سے طلبہ میں ایسا رنگ پیدا ہو گیا تھا کہ طلبہ خود ہی مسجد آنے کے پابند ہو گئے تھے اور نمازوں میں اس قدر اہتمام سے آتے کہ مسجد بھر جاتی اور ہر طرف طلبہ کا جمگھٹا نظر آتا۔ علامہ شبلی نعمانی نے کالج کی مسجد میں نماز میں طلبہ کی بھرپور حاضری کا ذکر کرتے ہوئے ایک خط میں لکھا ہے:

> مغرب کی نماز سبحان اللہ کیا شان و شوکت ہوتی ہے کہ بس دل پھٹا پڑتا ہے۔ خود سید صاحب بھی شریک نماز ہوتے ہیں۔ اور چونکہ وہ عامل بالحدیث (غیر مقلد) ہیں آمین زور سے کہتے ہیں ان کی آمین کی گونج مذہبی جوش کی رگ میں خون بڑھا دیتی ہے۔ مجھ کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اس نئی زندگی کے پیدا ہونے میں میرا بھی حصہ ہے۔(۱۶)

یہ خط ۲ مارچ ۱۸۸۶ء (۲۵ جمادی الاول ۱۳۰۳ھ) کا لکھا ہوا ہے۔ مولانا شبلی نے یہ تاثر دیا ہے کہ طلبہ میں تبدیلی اور دین کی طرف توجہ ان کی تربیت کا ثمرہ ہے۔ ممکن ہے کہ اس میں شبلی کی تربیت اور محنت کا بھی کچھ حصہ رہا ہو۔ لیکن مولانا شبلی کا شعبۂ دینیات سے بہت زیادہ رابطہ نہیں تھا۔ وہ صرف قرآن شریف کا درس دیتے تھے جس میں طلبہ ذوق شوق سے شریک ہوتے تھے۔ لیکن نماز میں طلبہ کی بڑی تعداد میں آنے اور دین و مذہب سے ان کی گہری وابستگی میں مولانا عبداللہ انصاری کی محنت کارفرما نظر آتی ہے۔

جمعہ کی مجلس وعظ

مولانا عبداللہ انصاری کو شعبۂ دینیات کی سربراہی کے لئے علی گڑھ بلاتے وقت سرسید نے ان سے جو خط و کتابت کی تھی اس میں ایک اہم خدمت جمعہ کے دن وعظ کے اہتمام کی بھی تھی۔ سرسید نے مولانا عبداللہ انصاری کے لئے منشی سعید احمد فاروقی تھانوی کے نام خط میں جن ذمہ داریوں کی صراحت کی تھی وہ یہ ہے:

اول: مسجد کا اہتمام پنجگانہ کا انتظام ان سے متعلق رہے اور پانچوں وقت کی نماز وہ خود پڑھا دیا کریں. ان کے سبب سے جماعت کو ترقی ہوگی اور طالب علموں کو نماز باجماعت کی زیادہ ترغیب ہوگی.

دوسرے یہ کہ کبھی کبھی جمعہ کی یا اور کسی نماز کے بعد بطور وعظ کے طالب علموں کو کسی قدر نصیحت کر دیا کریں. کالج کے طالب علم خود تعلیم یافتہ ہیں اور متعدد قسم کے علوم سے واقفیت رکھتے ہیں. ان کے لئے زیادہ تو یہ ہوگا کہ اخلاق اور عادات محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور صحابہ کرام اور دیگر بزرگان دین حق کی نیکیوں اور حسن اخلاق اور خدا پرستی اور خدا کی محبت اور احکام مذہبی کے خلوص سے ادا کرنے کا، والدین اور استاد کے ادب اور آپس میں مسلمانوں کی ہمدردی، عقائد اور مذہب اسلام کی خوبی اور سادگی، وحدانیت خدا کی عظمت و شان، قرآن مجید کی خوبی اور جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کی خوبی اور برتری سے وقتاً فوقتاً آگاہ کیا جاوے جس سے طالب علموں کے دلوں میں نیکی پیدا ہو اور ان کے دل سچائی اور باہمی محبت اسلامی اور نیکی کی طرف مائل ہوں.(۱۷)

مولانا عبداللہ انصاری نے علی گڑھ پہنچنے کے بعد پہلے جمعہ ہی سے وعظ کا اہتمام شروع کر دیا تھا. ہر جمعہ کو ان کا وعظ اپنی سادگی اور معنویت و تاثر کے علاوہ حسن بیان کی وجہ سے بھی پسند کیا جاتا تھا. اس وعظ کے اصل مخاطب کالج کے طلبہ تھے اور انہی کی تربیت اور ان کو دین سے وابستہ کرنے کے لئے اس کا اہتمام کیا گیا تھا، مگر اس کی قوتِ بیان کہیے یا تاثر اور فیض عام کا نتیجہ کہ یہ وعظ جلد ہی عوام و خواص سب حلقوں میں پسند کیا جانے لگا اور ایسا مقبول و مشہور ہوا کہ اس کو سننے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے کالج کے طلبہ کے علاوہ اساتذہ اور شہر و دیہات کے اشخاص بھی آنے لگے. یہی نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ اس کی تراوش اور افادیت کی کرنیں سنیوں سے تجاوز کر کے شیعہ صاحبان کے دلوں تک اپنی نورانیت ظاہر فرمانے لگیں. مولانا عبداللہ انصاری کے وعظ کی مقبولیت اور اس کے مفید مضامین کا چرچا یہاں تک عام ہوا کہ اس میں کالج کے طلبہ کی ایک بڑی تعداد شرکت کرتی اور مولانا کے ارشادات اور نصائح و تعلیمات سے محظوظ و مستفیض ہوتی. مولانا عبداللہ

انصاری کے دور میں کالج کے طالب علم سر سید رضا علی کہتے ہیں:

مولوی عبداللہ سنی دینیات کے تھے مگر سنی شیعہ سب ان کے درس میں شریک ہوتے تھے۔ (۱۸)

درس قرآن کا سلسلہ

مولانا عبداللہ انصاری کے تقرر میں پنجگانہ نمازوں کی امامت کے علاوہ وعظ و تلقین اور درس و نصیحت طلبہ کی ذہنی و عملی تربیت کا ذکر تھا۔ مولانا عبداللہ انصاری اس خدمت کو پوری ذمہ داری سے انجام دے رہے تھے جس میں کسی کو حرف شکایت کی گنجائش نہیں تھی۔ اس زمانہ میں علامہ شبلی نعمانی، جو کالج کے عربی شعبہ میں نائب پروفیسر تھے، قرآن شریف کا درس دیتے تھے۔ یہ درس طلبہ پسند بھی کرتے تھے۔ جب مولانا عبداللہ انصاری شعبۂ دینیات کے ذمہ دار بنائے گئے تو علامہ شبلی کو خیال ہوا کہ وہ درس قرآن کی خدمت سے سبکدوش ہو کر لکھنے پڑھنے میں وقت صرف کریں اور درس قرآن کی خدمت مولانا عبداللہ انصاری کے سپرد کر دی جائے۔ مگر سر سید نے علامہ شبلی کی اس رائے سے اختلاف کیا۔ مولانا شبلی کی خواہش کے باوجود کسی طور اس کے لئے تیار نہ ہوئے کہ مولانا عبداللہ انصاری کو طے شدہ خدمات کے علاوہ اور کام بھی دیا جائے۔

شبلی کے ساتھ مشترکہ مساعی

یہاں یہ بھی ذکر کرنا چاہیے کہ ہر زمانے کی طرح اس زمانے میں بھی اہل علم حضرات میں معاصرانہ چشمک موجود تھی۔ علامہ شبلی اور مولانا عبداللہ انصاری کے مابین بھی کہیں کہیں اختلاف نظر آتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود دونوں علمی کاموں میں منہمک رہتے تھے اور علی گڑھ سے لے کر لکھنؤ میں قیامِ ندوہ تک دونوں کی مساعی مشترکہ نظر آتی ہیں۔ مولانا عبداللہ انصاری دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے اور جید فضلاء میں سے ایک تھے۔ وہ تقریباً دس سال تک کئی دینی مدرسوں میں تعلیم و تدریس کی اعلیٰ خدمت انجام دے چکے تھے۔ ان کمالات کے ساتھ سونے پر سہاگہ یہ کہ وہ اس زمانہ کے سب سے بڑے اور مرجع اور

مرشد حضرت حاجی امداداللہ تھانوی مہاجر مکی کے خلیفہ تھے. یہ صفات ایسی تھیں جن کا بجائے خود بڑا اثر تھا. سرسید ان کی انہی نسبتوں سے فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے. دوسری طرف ان کے لئے علامہ شبلی کے علمی اوصاف بھی اہم تھے اور وہ دونوں کے ذریعہ سے کالج کے وقار کو بلند رکھنا چاہتے تھے. چنانچہ مولانا عبداللہ انصاری شعبہء دینیات میں کام کرتے رہے اور علامہ شبلی نعمانی کا درسِ قرآن حسب سابق جاری رہا.

ممکن ہے سرسید نے مولانا عبداللہ انصاری کی مرضی دریافت کی ہو مگر اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا. البتہ سرسید کی وفات کے بعد جب علامہ شبلی نعمانی علی گڑھ سے رخصت ہو گئے تو مولانا عبداللہ انصاری نے کالج میں قرآن شریف کا درس شروع کیا جس کا معمول ان کی پوری زندگی برقرار رہا.

حواشی

۱- حالی، خواجہ الطاف حسین. **حیات جاوید**. ص ۱۵۵-۱۵۴. دہلی. ۱۹۳۹ء. زبیری، مولوی امین. **تذکرہ سرسید**. لاہور. سنہ ندارد.

۲- سرسید. مجموعہ **مضامین تہذیب الاخلاق**. مرتبہ فضل الدین ککے زئی ۲: ۵۶۶. لاہور. ۱۹۱۰ء.

۳- ایضاً.

۴- حوالہ بالا ۲: ۵۶۷.

۵- کاندھلوی، مولانا احتشام الحسن. **حالات مشائخ کاندھلہ**. ص ۲۹۱ طبع اول. دہلی. سنہ ندارد. عباس، اصغر. **سرسید کی تعزیتی تحریریں**. ص ۳۲ علی گڑھ. ۱۹۸۹ء.

۶- حسین، میر ولایت. **آپ بیتی**. ص ۶۵ علی گڑھ. ۱۹۷۰ء.

۷- مولانا سعید احمد فاروقی تھانوی نے کئی کتابوں کے ترجمے کئے تھے اور احادیث شریفہ سے اخلاق، معاملات اور معاشرت وغیرہ کے عنوانات پر احادیث کا ایک عمدہ انتخاب مرتب کیا تھا جس میں احادیث شریفہ کا ترجمہ اور ان کا حل شامل تھا. یہ کتاب **الاخلاق الجدید** کے نام سے مولانا سعید احمد تھانوی کے ذاتی پریس مطبع احمدی علی گڑھ سے ۱۳۲۴ھ (۱۹۰۶ء) میں شائع ہوئی تھی.

۸- پانی پتی، شیخ اسماعیل. **مکتوبات سرسید**. ۱: ۲۶۶-۲۶۹. لاہور ۱۹۷۶ء.

۹- حسین، مشتاق. **مکتوبات سرسید**. ص ۱۶۱-۱۶۳ علی گڑھ. ۱۹۷۶ء. خط سرسید مکتوبہ ۲۴ اگست ۱۸۹۳ء.

۱۰- روداد نمبر ۴۳. سالانہ اجلاس ٹرسٹیان مدرسۃ العلوم علی گڑھ. ص ۲۸-۲۹. مطبع احمدی علی گڑھ.

۱۱- روداد نمبر ۴۴، سالانہ اجلاس مدرسۃ العلوم علی گڑھ منعقدہ ۱۳ جنوری ۱۹۰۴ء. ص ۲۳-۲۴.

۱۲- یہ اقتباس اور مولانا عبداللہ انصاری کی معزولی کی مہم کے سلسلہ کے تمام اقتباسات جو مزید صفحات میں آئے ہیں روداد اجلاس ٹرسٹیان مدرسۃ العلوم علی گڑھ منعقدہ ۱۳ جنوری ۱۹۰۴ء سے ماخوذ ہیں.

۱۳- پانی پتی. **مکتوبات سرسید** .۱: ۳۰۲.

۱۴- علی، سر رضا. **اعمال نامہ** (خودنوشت) ص ۱۳۵. خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری. پٹنہ. ۱۹۹۲ء.

۱۵- ندوی، اکرام خاں. **وقار حیات** (سوانح نواب وقار الملک) ص ۵۴۳. کراچی. ۱۹۸۴ء.

۱۶- ندوی، مولانا سید سلیمان. **مکاتیب شبلی**. ۱: ۴۷. مطبع معارف. اعظم گڑھ. ۱۹۲۸ء.

۱۷- پانی پتی. **مکتوبات سرسید**، ۱: ۲۶۷-۲۶۸.

۱۸- علی، سر رضا. **اعمال نامہ**. ۱۳۹.

باب : ۷

ادھورا خواب

مولانا عبداللہ انصاری کے ذریعے سرسید نے جس طرح مادی علوم کے ساتھ دینی علوم کی آمیزش کا خیال باندھا تھا افسوس وہ اپنی حقیقی روح کے ساتھ جاری نہ رہ سکا. مدرسۃ العلوم مسلمانان صرف ایک کالج اور مغربی طرز پر مغربی مادی علوم وفنون کی تعلیم دینے اور اس تعلیم سے برطانوی حکومت کے دفتر دار ملازم اور افسران فراہم کرنے کا مرکز نہیں تھا. یہ ایک پہلودار اور وسیع تحریک تھی اور اگر صحیح خطوط پر برپا ہوجاتی تو اس میں وہ توانائی پیدا ہوسکتی تھی جو مسلمانوں کی علمی، دینی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، تمدنی اور سیاسی ترقی کے ایک طویل المیعاد اور پُر از مقاصد منصوبہ کے عملی نفاذ کے لئے درکار تھی. مگر سرسید کے سامنے ہی اس تحریک نے ایسی کروٹ بدلی کہ اس کے اور مقاصد پر سے توجہ کم ہوتی چلی گئی اور بالآخر وہ مقاصد نگاہوں ہی سے یوں اوجھل ہوگئے کہ اب ان کی نشاندہی تو بڑی بات ہے ایک جھلک بھی دکھا دی جائے تو علی گڑھ سے وابستہ باخبر اصحاب کو بھی حیرت ہوتی ہے کہ اچھا یہ بھی تھا.

مدرسۃ العلوم کی ابتداء اسی پس منظر میں تعلیم کے متنوع پہلوؤں کے احاطہ کے ساتھ ہوئی تھی. اس کا ایک شعبہ مادی تعلیم کا تھا جو انگریزی زبان میں اسلامی عقائد ونظریات کو محفوظ رکھتے ہوئے دینی تربیت کے ساتھ دی جاتی جو سرسید کے اس نظریہ کی مثال ہوتے کہ:

> اسلام جس پر تم کو جینا ہے اور جس پر تم کو مرنا ہے اس کو قائم رکھنے سے ہماری قوم کے عزیز بچے اگر کوئی آسمان کا تارا ہوجائے مگر مسلمان نہ رہے تو ہم کو کیا، وہ تو ہماری قوم ہی نہ رہا. پس اسلام قائم رکھ کر ترقی کرنا قومی بہبودی ہے. امید ہے کہ تم ہمیشہ اس کو قائم رکھوگے اور اس کے ساتھ تمام باتوں میں ترقی کرتے جاؤ گے کہ قومی ترقی ہوگی جو تم کو بھی فائدہ دے گی اور قوم کو بھی عزت ہوگی اور آئندہ آنے والی نسلیں بھی اس سے فائدہ اٹھاویں گی. (۱)

کالج کا دوسرا مشرقی علوم کا شعبہ تھا .اس شعبہ میں دینی اسلامی علوم، مذہب، ادب، تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، سائنس اور علوم عقلیہ کی اردو میں تعلیم کا منصوبہ تھا.اس کے نصاب میں عربی اور فارسی کی چند اہم بنیادی کتابیں اور بطور لازمی مضمون انگریزی شامل تھی.سنی دینیات اور شیعہ دینیات دونوں کے لئے علیحدہ نظام، کتابوں اور استادوں کی ترتیب تھی.سرسید کے عہد میں اس شعبہ میں پانچ درجے اور کلاسیں ہوتی تھیں جن میں ابتداء سے اختتام تک اسلامی درسیات کا مکمل نصاب پڑھانے کا منصوبہ تھا.اس نصاب میں شامل دونوں شعبوں کی کتابوں کے حسب ذیل نام نقل کئے جاتے ہیں:

میزان الصرف ومنشعب	نحو میر
صرف میر	شرح مائۃ عامل
ہدایۃ النحو	شافیہ
کافیہ	قطبی
شرح تہذیب	شرح جامی
نفحۃ الیمن	عجب العجائب
مقامات بدیعی	مقامات بدیعی
مقامات حریری	مختصر المعانی
مسلم الثبوت	حماسہ
شرح عقائد	مشکوٰۃ
سبعہ معلقات	سنن ترمذی
تفسیر بیضاوی	سنن ابوداؤد.(۲)
سنن ابن ماجہ	
سنن نسائی	
صحیح بخاری	

فقہ، عقائد اور اصول میں شیعہ سنی دونوں شعبوں کے لئے علیحدہ کتابیں تھیں. سنی دینیات کے نصاب میں حسبِ ذیل کتابیں تھیں:

مالا بدمنہ	قدوری
شرح وقایہ	ہدایہ
نورالانوار	توضیح تلویح
شرح عقائد نسفی	سراجی

مشرقی شعبہ کا دوسرا مختصر نصاب کالج کے ان طلبہ کے لئے تجویز ہوا تھا جو انگریزی حصہ میں پڑھتے تھے، دینیات کی مفصل کتابیں پڑھنے کا ان کے پاس وقت اور گنجائش نہیں تھی. اس شعبہ کے نصاب میں چند مختصر کتابیں شامل تھیں.

نصاب تعلیم کا تصور

اس نصاب میں یہ خیال رکھا گیا تھا کہ دینیات کا با قاعدہ نظام درس اور طریقۂ تعلیم ایسا ہو جس سے طلبہ کو دین کی ضروری تعلیم حاصل ہو جائے، ان کو دین پر عمل کرنا آجائے اور اس تعلیم کے ذریعہ سے وہ آگے چل کر اپنی دینی صلاحیت ولیاقت اور دینیات کے باب میں تعلیم و مطالعہ جس طرح چاہیں آگے بڑھائیں ورنہ ہر ایک کو دین کا اتنا علم آجائے کہ سیدھا سچا مسلمان بن سکے اور مستقبل میں اس کا یہ علم نئی نسل کی تربیت میں معاون ہو. واقعہ یہ ہے کہ کالج میں داخلہ لینے والے طلبہ کی اکثریت کی دینی تعلیم تو کجا مبادی معلومات تک ناقص و ناتمام ہوتی تھیں اور کالج میں مغربی تعلیم کا جو مرتب نظام تھا اس میں اس نوع کی تعلیم کی زیادہ گنجائش نہیں تھی کہ طلبہ دینیات میں بہت زیادہ وقت لگا سکیں. یہ تو آج بھی نیورسٹی کا عام تجربہ ہے کہ جن برسوں میں وہاں دینی تعلیم ''لازمی'' مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی ہے اس کا گھنٹہ ساری ''اہم'' کلاسوں کے بعد دوپہر کے کھانے اور ظہر کی نماز کے بعد بالکل آخر میں رکھا جاتا ہے جب دن بھر کے تھکے ماندہ طلبہ کو ایک ''خشک موضوع'' میں دلچسپی لینے کی ہمت نہیں رہتی. اس لئے ابتدائے کار ہی میں دینیات کے نصاب، نظام

تعلیم اور اوقات کی ترتیب ہر اک میں طلبہ کی سہولت کا خیال رکھا گیا تھا اور دینیات کا نصاب بھی بہت بھاری بھرکم نہیں بلکہ متوازن اور ہلکا پھلکا سا رہتا تھا.

تدوین نصاب میں مساہمت

نصابِ تعلیم سے متعلق مولانا عبداللہ انصاری کی تحریروں کو دیکھتے ہوئے گمان غالب یہی ہے کہ کالج میں دینیات کا سب سے پہلا باقاعدہ نصاب انہوں نے ہی نے مرتب کیا ہوگا، اور اس سے قبل وہی نصاب جاری رہا جو پہلے سے پڑھایا جارہا تھا لیکن نصاب کسی بھی شعبہ علم کا ہو اور کیسے ہی بڑے ماہرین کا بنایا ہوا ہو متغیر اور تبدیل ہوتا رہتا ہے. کسی بھی نصاب تعلیم کو ہمیشہ کے لئے ضروری اور نا قابل ترمیم سمجھ لینا ان علوم اور ان کے طلبہ دونوں پر ظلم ہے. علی گڑھ کالج کے ارباب انتظام ہندستان کے ممتاز اور بیدار مغز اصحاب تھے. وہ بھلا کہاں ایک جامد نصاب اور غیر متغیر نظام تعلیم سے متفق اور اس کے ہم نوا رہے ہوں گے. اس لئے یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ جس طرح کالج اور دینیات کا نصاب بعد کے حالات میں بار بار متاثر ہوا اور ترمیم واضافہ کی آزمائشوں سے گزرا، اسی طرح کالج کے افتتاح کے دن سے محرم ۱۳۱۱ھ/ جولائی ۱۸۹۳ء ۱۳۱۱ھ/ جولائی ۱۸۹۳ء میں مولانا عبداللہ انصاری کے تقرر تک اور اس تقرر سے ۱۹۲۵ء میں مولانا عبداللہ انصاری کی وفات تک ایک تہائی صدی کے لمبے عرصہ میں نصاب تعلیم کئی مرتبہ حذف واضافہ کی زد میں آیا ہوگا، مضامین بدلے گئے ہوں گے، کتابیں تبدیل ہوئی ہوں گی، طریقہ تعلیم میں تغیر ہوا ہوگا، کئی استاد اور معلم بھی نئے آئے ہوں گے، پرانے اساتذہ کے درجوں اور کتابوں میں ترمیم کی گئی ہوگی. یہ باریک تفصیلات مرتب شکل میں موجود نہیں ہیں. جو چند رپورٹیں یا اطلاعات سامنے ہیں ان کا مجموعی تاثر اور اطلاع یہی ہے کہ مولانا عبداللہ انصاری کا نظام دینیات کا دور دینی لحاظ سے قابل قدر دور تھا. جس کا سرسید سے نواب وقار الملک تک ہر ایک کے یہاں اعتراف ملتا ہے.

اچھے امتحان اسی وقت متوقع ہوتے ہیں جب استاد اور نصاب تعلیم میں مناسبت ہو، یہ خوبی مولانا عبداللہ انصاری کو حاصل تھی. وہ اپنی نگرانی میں امتحانات کراتے جس کے

نتائج بہت عمدہ ہوتے تھے. شروع میں نصاب اور طریقۂ تعلیم اصلاح طلب تھا، کتابیں کمیاب تھیں جس کی وجہ سے امتحانات معیاری اور طلبہ کے ذہنوں کے مطابق نہیں تھے، مگر اس نقص کے دور ہوتے ہی شعبۂ دینیات کی کارکردگی میں بہتری آئی، امتحان کے نتائج اونچے ہو گئے، اور طلبہ کا شوق بڑھنے لگا. اس طرح اس دور کی تعلیمی سرگزشت کی عمدہ تصویر سامنے آجاتی ہے جو نا تمام ہونے کے باوجود مکمل معلومات کی نشاندہی کرتی ہے. یہ معلومات ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۷ء (۱۳۲۰-۱۳۲۵ھ) کے امتحانات سے ماخوذ ہیں اور مولانا عبداللہ انصاری کی مدت ملازمت ۱۸۹۳-۱۹۲۵ء (۱۳۱۱-۱۳۴۳ھ) کو دیکھئے تو **خیر الامور اوسطھا** کی رو سے اس کے درمیانی دور کے چند سالہ جائزہ سے مولانا عبداللہ انصاری کے پورے دور نظامت کے متعلق رائے قائم کی جاسکتی ہے.

بے توجہی کی خزاں

مولانا عبداللہ انصاری نے کالج میں آکر دینی تعلیم اور اسلامی ذہن سازی کے لئے جو کوشش کی اس کے ثمرات بھی سامنے آئے اگرچہ بعد کے زمانوں میں بے توجہی کی خزاں میں وہ پھل گل گئے اور پھول مرجھا گئے. یہ سوال غور طلب بھی ہے اور توجہ طلب بھی کہ سرسید کے ارادوں اور مولانا عبداللہ انصاری کی کوششوں کے باوجود کالج میں مسلمانوں کی دینی اساس کی طرف سے اس بے توجہی اور اس سے ارادی یا غیر ارادی غفلت کا سبب کیا تھا اور کالج کی تاسیس کے ابتدائی دور کے فکر وعمل کے برخلاف ایک بحر بے ساحل میں سفینہ کا رخ کیوں بدل گیا. یہ ایک مستقل موضوع تحقیق ہے. تاہم کالج کی دینی تعلیمی کمیٹی نے کالج کے طلبہ کے لئے ابتدا میں جو نصاب بنایا تھا، اگرچہ وہ مختصر اور محدود تھا، مگر اس کے ماتحت اسباق باقاعدگی سے مرتب نصاب کے مطابق ہوتے رہے جس کا طلبہ کو فائدہ ہوا.

شعبۂ دینیات کا نصاب مولانا عبداللہ انصاری کے آنے سے قبل پوری طرح ترتیب نہیں دیا گیا تھا، لیکن وہ نصاب بھی اس دور کی لیاقت کے لحاظ سے خاصا معیاری تھا اور سالانہ امتحانات میں طلبہ کامیاب ہوتے تو ان کی قابلیت میں کمی نہ ہوتی. یہ کامیابی

دراصل مولانا عبداللہ انصاری کی لگن اور محنت وصلاحیت کی کامیابی تھی. ان کے ناظم دینیات بننے کے بعد کے چند امتحانات کی اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شعبہ کے اکثر امتحانات اچھے ہوتے تھے اور طلبہ کے معیار اور تعلیم کے اوسط کا اندازہ امتحانی جوابات کی عمدگی اور بہتر نتائج سے ہوتا تھا. یہاں چند امتحانات اور ان کے نتائج کا ذکر کیا جاتا ہے.

۱۹۰۲ء کی رپورٹ

سالانہ امتحان ۱۹۰۲ء (۱۳۲۰-۱۳۱۹ھ) کی رپورٹ کے مطابق نتائج عمدہ تھے.
امتحان بہت اچھا تھا. اس سے تعلیم اور طلبہ دونوں کا نتیجہ اور لیاقت مراد ہے. امتحان کے نمبر اور طلبہ کی محنت وصلاحیت کی تحسین کی جانی چاہیئے.

کالج کے سالانہ امتحانات ادارہ کے ضابطہ کی روشنی میں مقررہ معمول اور ترتیب (schedule) کے مطابق ہوتے تھے. امتحان کے لئے جن علماء کو بلایا جاتا تھا ان کی دیانت اور علم وفضل پر عموماً اعتماد کیا جاتا تھا. اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کسی خاص امتحان کے موقع پر کسی وقتی ضرورت یا مصلحت کی وجہ سے آسان امتحان لیا گیا ہو. مثلاً علامہ شبلی نعمانی کی رائے میں ۱۹۰۲ء کے سالانہ امتحان میں ''سہل پسندی'' سے کام لیا گیا تھا. لیکن ۱۹۰۵ء کے امتحان کے شاندار نتیجوں سے واضح ہوتا ہے کہ ۱۹۰۲ء میں ناظم دینیات کی نگرانی میں ہونے والا امتحان بھی اسی طرح عمدہ نتائج لایا تھا. اس وقت کے ممتحن حضرات نے امتحان کے بعد اپنی مفصل اور وقیع رائے لکھی اور امتحان، اس کے نتائج، طلبہ کی لیاقت اور سب سے بڑھ کر ناظم دینیات کی بھرپور تعریف کی. ان کی رائے تجربہ اور لیاقت اور دیانت دارانہ مشاہدہ پر مبنی تھی جس کا ظہور ان کی تحریروں میں ہوا تھا.

۱۹۰۵ء میں نصاب اور طلبہ کی تعداد

ہماری دسترس میں ۱۹۰۲ء اور ۱۹۰۵ء کے امتحانات کی روداد یں ہیں. اس میں پہلے امتحان کے نتیجہ اور تفصیلات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کالج میں مولانا عبداللہ انصاری کی نظامت اور ان کی سرپرستی میں دینیات کی تعلیم کا انتظام عمدہ برگ وبار لا رہا تھا. ان کے طرز

تعلیم سے طلبہ دینی علمی استعداد اور دین سے وابستگی میں قابل قدر اضافہ ہوا تھا اور اس کے خوش گوار اثرات ظاہر ہوئے تھے۔

اس سال کے امتحان کی رپورٹ اور متعلقہ تفصیلات اس لئے بھی بہت اہم اور قابل قدر ہیں کہ ان سے کالج کے نصاب تعلیم کی تفصیل، متعلقہ کتابوں اور ان کے پڑھانے والے استادوں کے نام، دینیات کے چاروں درجوں کے جملہ طلبہ تعداد، امتحانات کے مجموعی نتائج، کامیاب ہونے والوں کا اوسط وضاحت سے سامنے آجاتا ہے۔

اس رپورٹ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سے کالج میں دینیات کے ماتحت قرآن شریف کی تعلیم اور حفظ و ناظرہ کے درجوں کا باقاعدہ انتظام تھا۔ حفظ اور ناظرہ دونوں طرح کے پڑھنے والوں کے لئے حافظ اور استاد مقرر تھے جن کی ایک مولوی صاحب نگرانی اور سرپرستی فرماتے تھے۔ چھوٹے بچوں کے دو ہوسٹل تھے ظہور وارڈ اور انگلش ہاؤس۔ دونوں میں قرآن شریف کی تعلیم ہوتی تھی۔ ظہور وارڈ میں مولوی عبدالصمد اور حافظ الٰہی بخش حفظ کے استاد تھے۔ مولوی سلیم ان کی نگرانی کرتے تھے۔ انگلش ہاؤس میں "ایک نیک طینت شخص" مولوی حافظ محمود احمد قرآن پاک کے استاد تھے۔ (۳)

امتحان کے موقع پر جو گوشوارہ مرتب کیا گیا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال دینیات پڑھنے والے اسکول کے طلبہ کے چار درجے تھے۔ پہلے درجہ میں ۵۴ طلبہ تھے، دوسرے میں ۵۹، تیسرے میں ۴۱ اور چوتھے میں ۳۱، یعنی کل ایک سو پچاس طلبہ نے اس سال دینیات کے سالانہ امتحان میں شرکت کی تھی۔ (۴)

نصاب تعلیم میں آٹھ کتابوں کے نام درج ہیں، علامہ سیوطی کی احادیث شریفہ پر مشہور کتاب **جامع صغیر** کا انتخاب، **طبقات ابن سعد** کا ایک باب (اس زمانہ میں **طبقات الکبریٰ** مفقود بلکہ معدوم تھی۔ سرسید کو اس کے ایک باب کا کچھ حصہ کہیں سے ملا تھا۔ انہوں نے مولانا حمید الدین فراہی سے اس کا فارسی میں ترجمہ کرایا تھا۔ یہی باب یا چند اجزاء کالج کے دینیات کے نصاب میں شامل ہوں گے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کی تالیف **حسن العقیدہ** نیز فقہ حنفی کی بنیادی کتاب **ھدایہ مرغینانی** کے چند باب، کتاب

الحقوق اور سیرت پاک پر مولانا عبداللہ انصاری کی تالیف **آغاز اسلام** نصاب میں داخل تھیں. اس نصاب میں دو کتابیں اور تھیں. **لمعات النجات** اور **کتاب الصدق**. شیعہ دینیات پر یہ دونوں کتابیں شیعہ طلبہ کے لئے تھیں. اس سال آٹھ کتابیں پڑھائی گئی تھیں اور انہی کا امتحان ہوا تھا.

دینیات کا نظام تعلیم

اسکول اور کالج دونوں کے طلبہ کے لئے علیحدہ نصاب اور انتظام تھا. کالج کی پہلی اور دوسری (فرسٹ اور سکنڈ ایر) جماعت کو صبح آدھا گھنٹہ مولانا عبداللہ انصاری پڑھاتے تھے. تیسری اور چوتھی (تھرڈ اور فورتھ ایر) جماعت کو مولانا خلیل احمد اسرائیلی درس دیتے تھے. اسکول کی جماعتوں کو پانچ اساتذہ پڑھاتے تھے. (۵)

ساتویں آٹھویں جماعت کے لئے مولانا عبداللہ انصاری مقرر تھے. نویں دسویں کلاس مولانا خلیل احمد اسرائیلی برسوں تک پڑھاتے رہے. اس سال ۱۹۰۵ء میں یہ کلاسیں مولانا عبداللہ انصاری کے چچیرے بھائی، شاگرد اور داماد مولانا رشید احمد سالم انصاری انبہٹوی کے سپرد کر دی گئیں. پانچویں اور چھٹی جماعت کے استاد کالج کے سابق طالب علم قاضی محمد فاروق انصاری اس سال اپنی ملازمت پر نہیں تھے، ان کی جماعتوں کو قاضی محمد فاروق انصاری کے فرزند ناظر حسن انصاری انبہٹوی تعلیم دیتے تھے. (۶)

امتحان لینے والے علماء

سالانہ امتحان ۱۹۰۵ء فروری کے آخر (ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ) میں منعقد ہوا تھا. اس مقصد کے لئے چار جید علماء کو بلایا گیا تھا: فاضل دیوبند مولانا منفعت علی پور قاضوی جو اس وقت مدرسہ فتحپوری دہلی میں مدرس تھے، فاضل دیوبند ملا محمد مراد فاروقی پٹنی جو مدرسہ اسلامیہ مظفر نگر کے بانی و مدرس تھے، مولوی مشتاق احمد جو گورنمنٹ اسکول دہلی میں ہیڈ مولوی تھے اور مولانا عبداللہ خاں جو مدرسہ اسلامیہ: دارالعلوم جامع مسجد علی گڑھ میں مدرس تھے. چاروں صاحبان نے بقول خود "نہایت احتیاط سے امتحان لیا". دو دن تک امتحان کا سلسلہ چلا. پہلے دن

کالج کے پرنسپل تھیوڈور ماریسن بذات خود نگرانی کے لئے آئے تھے. ماریسن نے سوالات کے پرچے تقسیم کئے اور امتحان کا وقت ختم ہونے تک ڈھائی گھنٹہ وہیں بیٹھے رہے. دوسرے دن امتحان کی نگرانی کے لئے کالج کا اور یورپین اسٹاف آیا. چاروں ممتحنوں نے بعد میں پرچے جانچے نمبر لگائے اور اپنی رپورٹ میں لکھا کہ:

امّا بعد. ہم خاکسار خدام الطلبہ کو مولانا محمد عبداللہ صاحب انصاری ناظم محکمۂ دینیات نے حسب ایمائے مسٹر ماریسن صاحب بہادر پرنسپل کالج بنا بر امتحان سالانہ دینیات کالج میں طلب فرمایا. چنانچہ ہم نے بتاریخ ۲۰-۲۱ فروری کو ا-فورتھ ایر ۲-تھرڈ ایر ۳-سکنڈ ایر ۴-فرسٹ ایر کلاسوں کا امتحان تحریری مفصلۂ ذیل کتابوں میں لیا.

(۱) جامع صغیر (۲) طبقات ابن سعد (۳) حسن العقیدہ (۴) کتاب الصدق (۵) لمعات النجات (۶) ابواب الهدایہ (۷) کتاب الحقوق (۸) آغاز اسلام. نتیجہ امتحان لائق شکر اور تسلی بخش برآمد ہوا جو نقشۂ ذیل سے ظاہر ہے.

نام کلاس	تعداد طلبائے امتحان دہندہ	تعداد طلبائے پاس شدہ	فیصدی
فورتھ ایر	۳۱	۱۶	۵۱
تھرڈ ایر	۴۱	۱۹	۴۵
سکنڈ ایر	۵۹	۳۶	۶۱
فرسٹ ایر	۵۴	۴۹	۹۰

الحق. ناظم دینیات و دیگر مدرسین دینیات کی حسن سعی لائق مبارکباد ہے. فی الواقع مولانا صاحب ناظم دینیات کالج کی برکت سے طلبہ نے دین اسلام کے سیکھنے اور مسائل فقہ کے یاد کرنے میں ایک حد تک کامیابی حاصل کی ہے. باوجودیکہ جس قدر مضامین علوم انگریزی کے ان کے ذمہ ہیں اور جن کے سیکھنے کے لئے ہزار ہا روپیہ خرچ کرتے ہیں اور دور دراز علاقوں سے اپنے گھربار چھوڑ کر اس اسلامی

کالج میں آتے ہیں وہ مضامین اُن کو بہت کم فرصت کسی اور چیز کے سیکھنے کی دیتے ہیں لیکن مولانا صاحب ناظمِ دینیات کی توجہ باطنی اور کوششِ ظاہری دونوں نے اُن کے دلوں پر خوب اثر ڈالا کہ اپنے سچے دین کے عقائد درست کرنے اور مسائل سیکھنے میں اکثر طلبہ نے کوتاہی نہیں کی. (۷)

اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ:

یہ امتحان تحریری نہایت احتیاط سے لیا گیا مسٹر ماریسن صاحب بہادر پرنسپل کالج نے بذات خاص دونوں روز پرچے امتحان کے تقسیم فرمائے اور پہلے روز علاوہ ہمارے اور ناظم صاحب اور مولوی خلیل احمد صاحب پروفیسر کے صاحب موصوف نے اڑھائی گھنٹہ یعنی تمام وقت بہ نفسِ نفیس نگرانی فرمائی اور دوسرے روز مسٹر کارنا صاحب بہادر و مسٹر ٹول صاحب بہادر، مسٹر برون صاحب بہادر و مسٹر عبدالقادر صاحب پروفیسران نے وقتاً فوقتاً نگرانی فرمائی.

دینیات کا کورس کہ جس میں اب امتحان ہوا ہے اور کسی حد تک کامیابی ہوئی ہے فی الواقع وہ اسلامی عقائد اور دینی مسائل کے لئے کافی نہیں ہے، لیکن ناظم دینیات سے یہ خبر سن کر کمیٹی دینیات نے اس ضرورت کو محسوس کر کے کالج کلاسوں میں اضافہ وترمیم کی طرف توجہ فرمائی ہے، کمال مسرت ہوئی. خدا کرے کہ جیسا اسکول کلاسوں میں دینیات کے کورسوں کا اضافہ ہو چکا ہے ویسا ہی جلد کالج کلاسوں میں بھی اضافہ ہو جائے. (۸)

اطمینان بخش امتحانات

اس امتحان کے اختتام پر انٹر سے پانچویں کلاس تک کے طلبہ کا اسلامیات کا امتحان ہوا. یہ امتحان تقریری تھا جو جمعہ کے دن صبح ۷ بجے سے ۱۱ بجے تک لیا گیا تھا اس کا نتیجہ بھی بہت اچھا تھا. ممتحن حضرات کی اطلاع ہے کہ:

خدا کے فضل سے ہر ایک کلاس کے اکثر طلبہ نے سوالات صحیح جوابات دیئے.

دینیات کے تمام امتحانات مکمل ہونے پر ممتحن حضرات نے حفظ کے درجات کو دیکھا، نماز کے لئے متعین کمروں کا معائنہ کیا اور ناظم دینیات سے نصاب اور تعلیم کو مزید بہتر

بنانے کے لئے گفتگو بھی کی اور ان سب کی روشنی میں اپنی مفصل رپورٹ مرتب کر کے پیش کی. یہاں وہ تمام رپورٹ جوں کی توں درج کی جارہی ہے کہ جس سے مولانا عبداللہ انصاری کے کام اور شعبہ دینیات کی فعالیت آئینہ ہوجاتی ہے:

اس امتحان تحریری سے فارغ ہوکر ۲۲ فروری کی صبح کو ناظم صاحب دینیات ظہور حسین وارڈ میں ہم کو لے گئے اور وہاں کے چھوٹے بچوں کا ہم نے امتحان قرآن شریف میں لیا. یہ طلبہ ہر روز سات بجے بعد نماز صبح قرآن شریف پڑھتے ہیں اور دو حافظ قرآن ان کے پڑھانے پر متعین ہیں.

مولوی محمد سلیم صاحب ماسٹر جو ایک نہایت مقدس بزرگ ہیں یہاں کے طلبہ کی نگرانی فرماتے ہیں. اس کے بعد ناظم صاحب دینیات ہم کو انگلش ہاؤس میں لے گئے. یہاں بھی کم سن طلبہ ایک میم صاحبہ وسید نورالحسن صاحب ماسٹر کی نگرانی میں رہتے ہیں. ماسٹر نورالحسن صاحب نہایت پاک صورت اور نیک سیرت معلوم ہوتے ہیں اور واقعی یہاں ایسے ہی نیک شخص کی ضرورت بھی تھی. یہاں پر ایک حافظ صاحب علی الصباح لڑکوں کو قرآن شریف پڑھاتے ہیں. یہاں کے طلبہ نے بھی قابل اطمینان قرآن شریف سنایا لیکن اس قدر ہماری رائے میں نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ صغیر سن طلبہ کے لئے ایک حافظ تجوید داں بھی مقرر کیا جائے تا کہ بچپن سے یہ طلبہ مخارج اور صفات حروف سے واقف ہوجائیں اور صحتِ الفاظ سے پڑھنے کی ان کو مہارت ہوجائے.

اس کے بعد ڈ بنچر کو ہم نے دیکھا. تینوں جگہ نماز کے لئے ایک ایک کمرہ مخصوص پایا جس میں جانمازوں کا انتظام بہت اچھا تھا. ۲۴ فروری کو اسکول کلاسوں کا امتحان اسکول میں جا کر لیا. چونکہ جمعہ کے روز بوجہ تیاری نماز جمعہ گیارہ بجے تک خواندگی ہوتی ہے اس لئے ۷ بجے سے ۱۱ بجے برابر تین گھنٹے انٹرنس کلاس سے پنجم کلاس تک طلبہ کا امتحان تقریری لیا گیا. خدا کے فضل سے کلاس کے اکثر طلبہ نے سوالات کے صحیح جوابات دیئے.

آخر میں ہم دل سے دعا کرتے ہیں کہ یہ کالج اہل اسلام کے لئے پورا پورا

ذریعہ معاش و معاد کا ہو کر بہ ترقی روز افزوں جاری رہے. آمین ثم آمین. وصلی اللّٰہ علی خیر خلقه سید نا محمد و اله واصحابه اجمعین. المرقومہ ۲۴ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ مطابق یکم مارچ ۱۹۰۵ء.

العبد: مولوی مشتاق احمد، ہیڈ مولوی گورنمنٹ اسکول دہلی. مولوی محمد منفعت علی، صدر مدرس عربیہ فتحپوری دہلی. مولوی محمد مراد صاحب، مدرس اوّل مدرسہ اسلامیہ مظفر نگر. مولوی عبد اللہ خاں صاحب، مدرسۂ اسلامیہ شہر میرٹھ. (۹)

مولانا انصاری کا معروضہ

ممتحن حضرات نے یہ رپورٹ نواب محسن الملک کی موجودگی میں کمیٹی دینیات کے اجلاس میں پیش کی تھی. مذکورہ رپورٹ پیش ہونے کے بعد کالج کے شعبۂ دینیات کی کیفیت ترقی اور شعبوں پر مولانا عبد اللہ انصاری نے بھی ایک مختصر تقریر کی تھی:

جناب صدر انجمن و دیگر معزز حاضرین!

میں اس وقت انتظام دینیات مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی شہادت ادا کرنے کھڑا ہوا ہوں، لیکن میں سب سے پہلے اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ میں یہ شہادت اس وجہ سے نہیں ادا کرتا کہ میرا تعلق کالج میں دینیات سے ہے، اور نہ مجھ کو جناب نواب محسن الملک نے ارشاد فرمایا، اور نہ مجھ کو خوامخواہ زبان زوری سے کسی کی تردید منظور ہے، بلکہ میں محض اُس سچے ایمانی جوش سے کھڑا ہوا ہوں جو ایک سچے مسلمان کے دل میں من جانب اللہ ایسے وقت پر پیدا ہوتا ہے. پس میں نہایت راست بازی سے یہ شہادت آپ کے سامنے ادا کروں گا جو خاص ایک مذہبی مسلمان کا فرض ہے.

کالج میں ماشاء اللہ دینیات کی تعلیم اور مذہبی پابندی کا بوجہ احسن انتظام ہے. کالج کلاسوں کی تعلیم دینیات کا یہ انتظام ہے کہ فرسٹ ایر، سیکنڈ ایر، کلاس کو علی الصباح روزانہ فصف گھنٹے میں پڑھاتا ہوں اور تھرڈ ایر اور فورتھ ایر کو مولوی خلیل احمد صاحب پروفیسر پڑھاتے ہیں؛ اور اسکول کی جماعتوں کی تعلیم دینیات کا یہ انتظام ہے کہ ساتویں اور آٹھویں جماعت کو روزانہ آدھ گھنٹہ میں پڑھاتا ہوں اور نویں اور دسویں جماعت کو روزانہ مولوی خلیل احمد صاحب ممدوح سالہا سال تک پڑھاتے

رہے، اب مولوی رشید احمد (سالم انصاری انبہٹوی) صاحب پڑھاتے ہیں جو کہ ایک اعلیٰ لیاقت اور قابلِ قدر شخص ہیں. اور پانچویں اور چھٹی جماعت کو قاضی محمد فاروق صاحب انصاری نے سالہا سال تک پڑھایا جو نہایت نیک دل اور مسلمانوں کے سچے ہمدرد ہیں. اب ناظر حسن طالب علم فرسٹ ایر قاضی صاحب موصوف کا صاحبزادہ پڑھاتا ہے. اس کے علاوہ اسکول کی پانچویں جماعت سے اوپر تک کی جماعتوں کے ایام مقرر کر دیئے گئے ہیں جن کو مولوی رشید احمد صاحب موصوف پڑھاتے ہیں. اور چوتھی جماعت سے نیچے تک کی جماعتوں کو مولوی محمد سلیم صاحب پڑھاتے ہیں جو ایک مقدس بزرگ ماسٹر ہیں.

قرآن شریف کی تعلیم کا یہ انتظام ہے کہ ظہور حسن وارڈ میں مولوی عبدالصمد صاحب اور حافظ الٰہی بخش صاحب پڑھاتے ہیں اور انگلش ہاؤس میں مولوی حافظ محمود احمد صاحب پڑھاتے ہیں.

جماعت پنجگانہ کا یہ انتظام ہے کہ مسجد میں یہ خاکسار نماز پڑھاتا ہے اور طلبہ کی حاضری لینے کے لئے محضر مقرر ہیں. علاوہ مسجد کے ڈنچر و ظہور وارڈ و پرشین ہوس و میکڈ لنلڈ ہوس اور انگلش ہوس و سوسائٹی ہر جگہ امامت و حاضری لینے کا کافی انتظام ہے. یہ جو کچھ میں نے انتظام تعلیم قرآن شریف اور تعلیم کتب دینیہ اور پابندئ جماعت و حاضری لینے کا اوپر بیان کیا ہے اس سے آپ حضرات سمجھ سکتے ہیں کہ مدرسۃ العلوم میں کس قدر دینیات کا انتظام ہے مگر میں اس کے ساتھ یہ بھی ضرور کہوں گا کہ کالج اور اسکول کی تعلیم دینیات کا جو آدھا آدھا گھنٹہ وہ نہایت غیر کافی وقت ہے کم از کم ایک ایک گھنٹہ ہونا چاہیے کیونکہ دس منٹ سے زائد حاضری لینے میں گزر جاتے ہیں. (۱۰)

مولانا عبداللہ انصاری کی تقریر کے اس مختصر اقتباس سے کالج میں ان کی تعلیمی و تدریسی سرگرمیوں اور ان کے نتائج کی واضح جھلک نظر آرہی ہے اور اس سے یہ اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کالج میں دینیات کی کلاسیں بھی لیتے تھے اور یہ بھی کہ کالج میں آنے کے وقت جو کام مولانا کے سپرد کئے گئے تھے بعد میں ان میں اضافہ ہو گیا تھا.

۱۹۰۶ء کا سالانہ امتحان

خوش قسمتی سے ۱۹۰۵ء کے بعد ۱۹۰۶ء کے امتحان کا بھی کچھ تذکرہ مل جاتا ہے. اوپر گزر گیا ہے کہ شعبۂ دینیات کے سالانہ امتحانات بھی کالج کے سالانہ امتحان کی طرح فروری کے آخر یا شروع مارچ میں ہوتے تھے. سال ۱۹۰۵ء کے امتحان کی روداد اور عمدہ کارکردگی کا تذکرہ آچکا ہے. جو ترتیب پہلے امتحانات میں تھی وہی اس سال بھی ہوئی.

شعبہ دینیات کمیٹی نے دینیات کے سالانہ امتحانات لینے کے لئے گذشتہ سال کے مطابق چار علماء کے نام منتخب کئے تھے، یہ علماء حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا احمد علی صاحب سراوی (مدرس مدرسہ اسلامی میرٹھ) مولانا حفیظ اللہ صاحب (غالباً دہلوی) اور حضرت مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی کے ایک شاگرد مولانا عبدالغنی شکارپوری تھے.

مولانا عبداللہ انصاری نے دینیات کمیٹی کی اس تجویز کو ایک خط کی صورت میں متوقع ممتحنین کی خدمات میں بھیجا اور اصحاب کے نام جو خطوط تھے ان کا ہمیں علم نہیں لیکن حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کو جو خط لکھا گیا تھا اس کا متن دستیاب ہے. مولانا عبداللہ انصاری نے انہیں لکھا تھا:

> سراپا مجد و کرم، مولانا الحاج الحافظ مولوی اشرف علی صاحب تھانوی
>
> بعد سلام مسنون الاسلام!
>
> عرض ہے کہ اس سال دینیات کے امتحان کے لئے کمیٹی دینیات کالج علی گڑھ کے ممبروں نے آپ کو اور مولوی احمد علی صاحب مدرس میرٹھ و مولوی حفیظ اللہ صاحب و مولوی عبدالغنی صاحب شاگرد رشید مولانا محمد لطف اللہ صاحب کو تجویز کیا ہے.
>
> شاید آخر فروری یا مارچ میں امتحان ہوگا. تین سو پرچے جانچنے اور ان پر نمبر لگانے ہوں گے. سب سے پہلے آٹھ کتابوں کے سوالات بنانے ہوں گے. غرض ایک ہفتہ کا کام یہاں ہوتا ہے. امید کہ اگر آپ قبول فرمائیں تو میں آپ کو تقرر تاریخ امتحان سے مطلع کر دوں. اس سے دو روز قبل آپ یہاں رونق افروز ہوں تا کہ سوالات تجویز فرمائیں. سوالات طبع ہوں گے. فقط والسلام.(۱۱)

مولانا عبداللہ انصاری کے خط کی تحریر کے دس دن کے بعد کمیٹی دینیات کے سکریٹری مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی نے بھی مولانا اشرف علی تھانوی کو ایک خط لکھا تھا:

جناب مولوی صاحب زبدۃ العلماء العظام زاد اللہ فیوضہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ.

مسلمان علی گڑھ کی کمیٹی دینیات اہل سنت و جماعت کی یہ آرزو ہے کہ اس سال آپ قدم رنجہ فرما کر مدرسہ مذکور میں طلبہ کا سالانہ امتحان دینیات لیں اور بذریعہ وعظ ان کو فیضیاب فرمائیں. ۷ ماہ حال کو جلسہ مذکور نے یہ طے کر کے خاکسار کو اس امر میں آپ سے التماس کرنے کی ہدایت کی ہے. ہنوز تاریخ امتحان مقرر نہیں مگر عنقریب تقرر ہوگا. منشاء گرامی سے آگاہی بخشی جاوے تاکہ موجب اطمینان ہو.

جناب مولوی صاحب ناظم دینیات نے بھی اس بارہ میں آپ کو لکھا ہوگا. والسلام بالاکرام. (۱۲)

اسی مضمون کے خطوط اور صاحبان کو بھی بھیجے گئے. دوسرے صاحبان کے کیا جوابات آئے معلوم نہیں مگر امید ہے کہ وہ تشریف لائے ہوں گے. ان کی نگرانی میں پچھلے سالوں کے امتحانات کی طرح صاف ستھرے امتحان منعقد ہوئے. حضرت مولانا تھانوی نے امتحان کے لئے آنے سے معذرت کر دی تھی لیکن مولانا عبداللہ انصاری کے اس خط سے یہ ضرور معلوم ہوگیا کہ اس سال بھی تمام درجوں کا امتحان ہوا تھا جس میں آٹھ کتابیں بڑے درجوں کی تھیں اور دو درجوں کا پرانے معمول کے مطابق تحریری امتحان ہوا تھا. سب کے لیے معمول اور ضابطہ کی کاروائی ہوئی. لیکن مولانا عبداللہ انصاری کے اس خط میں یہ اطلاع اہم ہے کہ امتحان میں شریک ہونے والے طلبہ تین سو ہوں گے. یہ تعداد ۱۹۰۵ء کے امتحانات میں بیٹھنے والے طلبہ کی تعداد سے زیادہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کالج میں شعبۂ دینیات کی کارکردگی پر اعتماد اور اس کی طرف طلبہ کے رجوع اور اس شعبہ کی مقبولیت میں اچھا خاصا اضافہ ہوا اور طلبہ کی تعداد جو ۱۹۰۵ء میں ۱۵۰ تھی وہ ایک ہی سال میں بڑھ کر دوگنی ہوگئی تھی.

نصاب کی جامعیت اور تجدید کی کوشش

کالج میں دینیات کا نصاب اصلاح اور تغیر پذیر تھا جس کی ضرورت اور طلبہ کی صلاحیت ولیاقت کے مطابق خوب سے خوب تر کی جانب مسلسل سفر ہوتا رہتا تھا. اس سفر کی رفتار کبھی سست ہوتی کبھی تیز مگر حرکت اور تبدیلی کم وبیش جاری رہتی تھی. روداد امتحانات ۱۹۰۶-۱۹۰۵ء میں آچکا ہے کہ اس وقت سیرۃ مبارکہ پر مولانا عبداللہ انصاری کی ایک تالیف یا ترجمہ **آغاز اسلام** اور اس کے علاوہ سات کتابیں دینیات کے نصاب میں داخل تھیں. تاہم دینیات کمیٹی نصاب کی کتابوں اور ان کی افادیت کے مختلف گوشوں پر برابر نظر رکھتی تھی اور غور وفکر کرتی رہتی تھی. قرآئن سے ایسا نظر آتا ہے کہ دینیات کمیٹی نے اسی وقفہ میں شعبۂ دینیات کے نصاب میں مکمل تبدیلی کا ارادہ کرلیا تھا جس کے لئے اس نے شعبہ دینیات کے دوتین استادوں سے متوسط ضخامت کی کتابیں لکھوانا طے کیا تھا، جس میں ناظم شعبہ، مولانا عبداللہ انصاری اور ان کے چچازاد بھائی، شاگرد اور داماد مولانا رشید احمد سالم انصاری انبہٹوی بھی شامل تھے جو کئی سال سے شعبۂ دینیات اور فارسی میں استاد تھے.

مولانا عبداللہ انصاری نے **آغاز اسلام** کے علاوہ **ارکان اسلام** کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں ارکان اسلام کا مختصر مگر عمدہ تذکرہ کیا گیا ہے. اس کے سوا شیخ طاہر بن صالح الجزائری کی کتاب **العقائد الاسلامیه** کا ترجمہ **عقائد اسلامیه** کے نام سے کیا جس میں موقع بہ موقع مفید مضامین کا اضافہ بھی کیا. مولانا رشید احمد سالم انصاری نے شعبہ دینیات کے لئے حضرت شاہ ولی اللہ کی مشہور تالیف **الفوز الکبیر** کا اردو ترجمہ کیا اور شیخ محمد عبدہ مصری کے **رسالة التوحید** کو اردو کا جامہ پہنایا. یہ دونوں ترجمے کالج کے نصاب دینیات میں شامل ہوگئے تھے مگر یہ نصاب دینیات کا آخری تغیر نہیں تھا. مولانا عبداللہ انصاری اور مولانا رشید احمد سالم انصاری کی یہ کاوشیں بعد میں بھی جاری رہیں.

مولانا عبداللہ انصاری کے اہتمام میں شعبۂ دینیات کا علمی تعلیمی سفر جاری تھا. اس کے سالانہ امتحانات کے نتیجے عمدہ آرہے تھے اور دینیات کے شعبہ کے جو مقاصد تھے وہ بڑی حد

تک تکمیل پذیر تھے. علماء آتے سالانہ امتحانات لیتے، طلبہ کی دینی معلومات وقابلیت کا جائزہ لیتے، کالج کے دینی ماحول کو دیکھتے. نمازوں میں طلبہ کی اہتمام سے حاضری اور دینی صفات ایسی نہیں تھیں جو ان کو متاثر نہ کرتیں. اس سے اگر ایک جانب کالج کی انتظامیہ کی حوصلہ افزائی ہو رہی تھی تو دوسری طرف مولانا عبداللہ انصاری کے ذاتی وقار و مرتبہ میں اضافہ ہو رہا تھا.

امتحان کے لئے علماء کے کالج میں تشریف لانے اور امتحان کے بعد ان کی لکھی ہوئی رپورٹوں، معائنوں اور ان تاثرات کی وجہ سے جو وہ لکھتے اور اس سے بھی بڑھ کر جب وہ اپنے اپنے علاقوں میں جا کر وہاں کے عوام وخواص سے اس کا تذکرہ کرتے تھے تو اس سے کالج کو بہت فائدہ ہوتا تھا. اہل کالج کے دین وعقیدہ کے متعلق جو خیالات عام ہو گئے تھے ان کے دور کرنے میں مدد ملتی اور عوام کو اندازہ ہوتا کہ کالج ان کے فائدہ کے لئے قائم کیا گیا ہے، ان کے بچے وہاں جائیں گے اور پڑھیں گے تو وہ ان کے واسطے سے ملت اور ملک کے لئے کچھ مفید ہی ہوں گے. کالج کے ذمہ داران اس سے بھی خوش تھے اور سمجھتے تھے کہ کالج کے کارواں کو آگے بڑھانے میں یہ امتحانات مثبت نتائج مرتب کر رہے ہیں. ان امتحانات کے لئے علماء کی تشریف آوری اور علماء کا ہفتہ دس دن کالج میں قیام کرنا ایسے بہت سے شبہات کو دور کرتا تھا اور اعتراضات کو ختم کر رہا تھا جو کالج پر کثرت سے کئے جاتے تھے.

شاہ افغانستان شعبہ دینیات میں

یہ سب ہو رہا تھا کہ ۱۹۰۶ء میں اعلان ہوا کہ شاہ افغانستان امیر حبیب اللہ خان ۱۹۰۷ء کے آغاز پر ہندستان کے دورہ پر آرہے ہیں. اس زمانے کے حالات اور مسلمانوں کے افغانستان سے پرانے ثقافتی سیاسی رابطوں کی وجہ سے اس دورہ کی غیر معمولی اہمیت اور بڑی شہرت ہو گئی تھی.

امیر حبیب اللہ کا دورۂ ہندستان عالمی پیمانہ پر اس بحرانی زمانہ کے جوڑ توڑ کی سیاست کا جزو تھا. ہزاروں سال سے جیالے افغانوں کا ملک باب الہند تھا. اس ملک کے انقلابات کا اثر ہندستان پر پڑتا رہا ہے اور ہندستان میں پیش آنے والی تبدیلیاں افغان

زاویہ نظر کو تنگ یا کشادہ کرتی رہی ہیں. مدتوں وہ خطہ کبھی برصغیر سے وابستہ ہو گیا اور کبھی اس نے ہندستان کو وسطی ایشیا سے جوڑ دیا. ہندستان پر بڑی حد تک تسلط حاصل کر لینے کے بعد انگریزوں نے افغانستان میں بھی اسی سیاسی فوجی پالیسی سے کام لینا چاہا تھا جو ہندستان میں کامیاب ہو چکی تھی مگر ۱۷۶۴ء کی جنگ بکسر، ۱۸۳۹-۱۹۴۱ء کی جنگ افغانستان اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادیٔ ہندستان کی نوعیتوں میں بڑا بھاری فرق تھا. جنگ افغانستان میں دوبار ہزیمتوں کے بعد انگریز حکومت بڑے افغان سرداروں سے ''دوستی'' کی پالیسی کے ذریعہ افغانستان پر اپنا اثر باقی رکھنے پر عمل پیرا ہوئی تھی.

امیر حبیب اللہ خان انگریزوں سے مفاہمت کا رویہ رکھتے تھے جس کے گہرے سیاسی اثرات ہندستان میں محسوس کئے جا رہے تھے اور انگریز حکومت ان اثرات سے خوب فائدہ اٹھا رہی تھی. امیر حبیب اللہ خان کا دورۂ ہند اسی سیاسی عمل کا حصہ تھا جس کے افسوسناک نتائج خود امیر حبیب اللہ خان کو بھی بھگتنے پڑے.

تاہم یہ بھی درست ہے کہ امیر حبیب اللہ نرے سپاہی پیشہ حکمراں نہیں تھے بلکہ باخبر حکمراں تھے. ان کا ہندستان کا سفر یہاں کے سادہ دل اور جذباتی مسلمانوں کے لئے ایک بڑی خوش خبری تھی. ملک میں ہر جگہ اس کا چرچا اور پذیرائی ہوئی. کالج کے ذمہ داروں نے بھی فیصلہ کیا کہ اس موقع پر امیر حبیب اللہ کو کالج کے معائنہ کی دعوت دینی چاہئے. گورنر جنرل لارڈ منٹو اور ہندستان میں متعین افغانستان کے سفیر کے ذریعہ سے محسن الملک نے امیر حبیب اللہ کو علی گڑھ آنے کی دعوت دی اور انھوں نے یہ درخواست قبول کر لی.

افغانستان سے منظوری کی اطلاع آئی تو کالج کی انتظامیہ نے بادشاہ کے شایان شان استقبال کی تیاری شروع کر دی. طے ہوا کہ شاہ افغانستان ۱۶؍جنوری ۱۹۰۷ء کو علی گڑھ آئیں گے. ان کے استقبال کے لئے کالج کی انتظامیہ نے انتظامات کئے اور اس میں شرکت کے لئے ہندستان کی مقتدر شخصیتوں اور ممتاز علماء کو بھی مدعو کیا گیا. امیر حبیب اللہ اپنے نظام کے مطابق مقررہ وقت پر علی گڑھ کے اسٹیشن پر پہونچے. روایتی استقبال ہوا. کالج

پہنچنے کے بعد کالج کے زعماء، تعلیمی عملہ اور معزز حاضرین سے تعارف ہوا. امیر نے کچھ دیر آرام کیا. کھانا کھایا ظہر کی نماز پڑھی. نماز کے بعد شعبۂ دینیات کا جائزہ لینا تھا مگر امیر احبیب اللہ نے یہ بات شروع میں بالکل صاف کردی تھی کہ

میں جب تک بذات خود امتحان اور تحقیق نہ کرلوں کوئی رائے ظاہر نہیں کرسکتا. (۱۳)

شاہ افغانستان کے لب و لہجے سے کالج کے ذمہ داروں کو اندازہ ہوگیا تھا کہ امتحان ان کی توقع سے زیادہ سخت اور غیر معمولی ہوگا اس لئے ان کو اس کی بہت فکر تھی کہ اگر امیر ناخوش ہوئے یا امتحان ناکام رہا تو اس سے کالج کی حیثیت متاثر ہوگی. کالج کے ذمہ دار اور منتظمین حیران و پریشان تھے کہ کیا کیا جائے کہ اس درمیان امیر حبیب اللہ نے ایک بات اور کہہ کر منتظمین کی پریشانی میں مزید اضافہ کردیا. امیر حبیب اللہ نے کہا:

دو حیثیت سے کالج دیکھ سکتا ہوں. ایک بطور ممتحن کے دوسرے بطور سیاح کے. پہلی حیثیت سے ضروری ہے کہ ہر بات کی تحقیق و تفتیش اور طلبہ کا امتحان کر کے میں اپنی رائے ظاہر کروں اور دوسری صورت میں معمولی اور رسمی طور پر کالج کو دیکھ کر رخصت ہو جاؤں. اب بتاؤ ان باتوں میں سے کون سی بات کو ترجیح دیتے ہو. میری اچھی رائے یا بڑی رائے امتحان لینے پر منحصر ہے. (۱۴)

محسن الملک کا غیرت مندانہ فیصلہ

کالج کے سکریٹری محسن الملک نے امتحان کے مشکل لیکن غیرت مندانہ اور بہتر طریقہ کو پسند کیا اور شاہ سے عرض کیا کہ جس طرح پسند کریں امتحان لیں. امیر نے بنفس نفیس ایک ایک چیز کے خود جائزہ لینے کا اہتمام کیا. سب سے پہلے دارالاقامہ کا معائنہ کیا. نماز پڑھنے کے کمرے دیکھے. کھانے کے نظام کا جائزہ لیا. آخر میں دینیات کا جائزہ لینے اور دینی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو بلانے کی فرمائش کی. تعمیل حکم میں پہلے شعبۂ دینیات کے چند طلبہ شیعہ دینیات کے سربراہ مولوی عباس حسین کے ساتھ پیش ہوئے. امیر نے ایک طالب علم سے کہا اسلام کے بنیادی اصول بیان کرو.

طالب علم نے جواب دیا: توحید، عدل، نبوت، امامت، جہاد. (۱۵)

امیر افغانستان کو سن کر تعجب ہوا تو محسن الملک نے بتایا یہ جماعت شیعہ طلبہ کی ہے، شاہ افغانستان نے کہا سنی طلبہ کو پیش کرو. اس پر مولوی عباس حسین نے بصد ادب گذارش کی کہ:

''خدا نے اعلیٰ حضرت کو بادشاہ بنایا ہے. ظل اللہ کے نزدیک شیعہ سنی دونوں یکساں ہیں.''

سر رضا علی نے لکھا ہے کہ امیر حبیب اللہ خان نے جو جواب دیا وہ موتیوں میں تولنے کے قابل ہے. فرمایا:

آخوند! مجھے شیعہ سنی بلکہ ساری رعایا عزیز ہے، مگر بات یہ ہے کہ امتحان اس وقت ہی قابل اطمینان ہوسکتا ہے جب امتحان لینے والے کی واقفیت امتحان دینے والے سے زیادہ ہو. (۱۶)

یہ جواب سن کر مولوی عباس حسین خاموش ہو گئے. اس کے بعد سنی طلبہ کی باری آئی. مولانا عبداللہ انصاری پچاس طلبہ کو لے کر حاضر ہوئے. شاہ افغانستان نے ان میں سے چند طلبہ منتخب کئے اور ان کو اپنے قریب بلا کر سوالات کئے. طلبہ نے ایک دو جوابات کے علاوہ عموماً صحیح جوابات دیئے. ایسے جوابات کے لئے خود امیر نے یہ تسلیم کیا کہ یہ کسی قدر مشکل سوالات تھے. نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی عینی شہادت ہے کہ امتحان عقائد اور فقہ کا تھا. سوالات میں سے ایک سوال تھا کہ دم مسفوح کس کو کہتے ہیں. اس کے بعد ایک اور بچے کو بلایا اور ایک قطعی شرعی مسئلہ پوچھا کہ

مشکل فقہی سوالات

اگر ایک شخص کی وضو نہیں ہے اور اسے غسل بھی کرنا ہے اور وہ اچانک دریا میں گر جائے تو اس کا وضو یا غسل ہو گیا کیا؟

بچے نے جواب دیا:

بغیر ارادے کے بھی وضو اور غسل دونوں ہو جائیں گے.

امیر حبیب اللہ نے کہا

اگر اسی طرح بنا ارادے اور نیت کے تیمّم کر لے تو کیا وہ پاک ہو جائے گا؟

بچے نے انکار میں سر ہلایا اور بولا

تیمّم میں نیت ضروری ہے، کیونکہ پانی طاہر بھی ہے اور مطہر بھی، لیکن مٹی صرف طاہر ہے مطہر نہیں ہے. اسی واسطے تیمّم بغیر نیت کے نہیں ہوگا.

امیر حبیب اللہ بے حد خوش ہوئے. یہ ذہین اور متین بچہ نواب احمد سعید خاں چھتاری تھے. جو مولانا عبداللہ انصاری کے ان طلبہ میں سے تھے جنہوں نے امیر حبیب اللہ سے ملاقات کی تھی.

بہر حال امیر حبیب اللہ نے بہت اطمینان اور تفصیل سے دینیات کا امتحان لیا اسی مصروفیت کی وجہ سے معزز مہمان اسٹریچی ہال میں مقررہ وقت سے زیادہ دیر تک ٹھہرے. آخر میں علی الدین نامی ایک نوعمر طالب علم کو اپنے پاس بلا کر فرمایا کہ قرآن شریف میں سے تمہیں جو کچھ یاد ہو سناؤ. اس نوعمر طالب علم نے سورۃ آل عمران کا ایک رکوع پڑھنا شروع کیا:

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَاب.(۱۷)

اس بچے نے بہت خوش الحانی سے مصری لہجہ میں یہ آیتیں اس طرح تلاوت کیں کہ تمام حاضرین پر کیف اور وجد کی سی کیفیت طاری ہوگئی. امیر حبیب اللہ بھی بہت متاثر تھے. ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے جو داڑھی کو تر کرتے ہوئے نیچے گر رہے تھے. آنسو پونچھنے میں دو رومال تر ہو گئے تھے. بچہ نے تلاوت ختم کی تو امیر حبیب اللہ اپنی کرسی سے کھڑے ہوئے اور نہایت جوش میں کبھی فارسی میں کبھی اردو میں اور کبھی انگریزی میں بار بار کہتے اور دہراتے تھے کہ:

''اس مدرسہ کی جو بدگوئی مجھ سے کی گئی سب غلط اور جھوٹ ہے.''

اور کبھی کہتے:

''ہمہ دروغ است وکذب و بد گوئی''۔(۱۸)

امیر افغانستان نے یہ بھی کہا:

''ہم نے طلبہ کا امتحان لے کر اپنی تشفی کر لی اب ہمارا جواب ہے کہ سب بہت اچھا اور ہم بہت خوش''۔(۱۹)

شاہ افغانستان کے کلمات مدحت اور تحسین و آفرین سے کالج کے سکریٹری نواب محسن الملک کی خوشی و مسرت کا اندازہ لگانا آسان نہیں تھا۔ یہ ایک بہت بڑا غیر معمولی اور دورس نتائج رکھنے والا امتحان تھا جس میں کالج خصوصاً شعبۂ دینیات اور کالج کی انتظامیہ توقع سے زیادہ کامیاب ہوئی۔ چونکہ یہ کلمات تحسین کالج کا معائنہ کرنے والے عام مسافر، نووارد سیاح، کالج کی حیثیت و مقام سے بے خبر کسی شخص یا کسی ایسے ممتحن کے نہیں تھے جو عوام میں اپنا تعارف اور اثر نہیں رکھتا تھا، بلکہ یہ ایک ایسے عالم فاضل اور جہاں دیدہ حکمراں کے کلمات تھے جس کے تدبر اور فرزانگی کا چرچا عام تھا۔ وہ کالج کی ابتداء اس کے تمام منظر و پس منظر اور علمی تعلیمی پہلوؤں کی خاص واقفیت رکھتے تھے نیز کالج کے مخالفین نے کالج کی تمام کمزوریوں سے بادشاہ کو واقف کرا رکھا تھا، خصوصاً کالج کی دینی حالت اور طلبہ کی بد دینی کی نسبت معزز مہمان کو بدگمان کرنے کی بھی کوشش کی گئی تھی محترم مہمان نے انہی روایات و اطلاعات کی تصدیق کے لئے کالج کے شعبوں خصوصاً دینیات کے حصے کو بہت باریکی سے دیکھا اور گہرائی سے جانچا پرکھا تھا۔

شعبۂ دینیات کالج کی لاج

یہ امتحان اور جانچ کالج کے لئے ایک تمغہ اعزاز اور ایسی بے نظیر توثیق ثابت ہوا کہ جس سے کالج ہی نہیں بلکہ اس کے تمام معاونین کالج کے تمام ہمدردوں اور مخلصین کے علاوہ کالج کے ٹرسٹیوں، سکریٹری اور شعبہ دینیات کے ناظم کو بھی بہت خوشی ہوئی۔ یہ امتحان کالج کے لئے ایک ایسی دستاویز ثابت ہوا جو شعبۂ دینیات پر اعتراضات اور کالج پر بداعتمادی کے خیالات کو بہا کر لے گیا۔

امیر حبیب اللہ نے انہی کلمات تحسین پر بس نہیں کیا بلکہ امتحان کے اختتام پر جب نواب محسن الملک نے سپاس نامہ پیش کیا اور اس کو پڑھنا شروع کیا تو امیر حبیب اللہ نے اس کو وہاں تک سنا جہاں سے دینیات کی بات شروع ہوئی تھی جب دینیات کا ذکر آیا تو امیر نے نواب محسن الملک کو پڑھنے سے روک دیا اور فرمایا:

''میں خود دینیات کا امتحان لے چکا ہوں شنیدہ کے بود مانند دیدہ''۔ (۴۰)

شاہ نے جوابی تقریر میں کالج میں دینی تعلیم پر اطمینان ظاہر کیا اور کالج کے لئے شاہانہ عطیہ کی سند میں بھی اس اعتماد کا تذکرہ ہے، امیر نے لکھا ہے کہ:

اگر چہ از زبان بعضے مردم در باب شاگردان کالج موصوف شنیدہ بودم کہ در عقائد اسلامیہ خود درست نمی باشند. اما خود من بحضور خود بزبان خود از شاگردان کالج موصوف امتحان بعضے عقاید ضروری اسلام و مسائل نماز و روزہ را گرفتیم، تمام سوالہائے مرا بطریق عقاید اہل اسلام جواب مقتند. بعد ازاں کہ اطفال اہل اسلام بعقاید ضروری فرائض اسلام دانستہ شوند ہر گاہ شروع درس مروجہ یورپ را بکتند ہیچ عیبے نیست.

ترجمہ:

اگر چہ میں نے بعض لوگوں سے اس کالج کے طلبہ کے متعلق سنا تھا کہ وہ اپنے اسلامی عقیدے میں صحیح نہیں ہوتے، مگر خود میں نے اپنے سامنے اپنی زبان سے اس کالج کے کچھ طلبہ کا اسلام کے ضروری عقائد و مسائل اور نماز و روزہ کے متعلق (معلومات کا) امتحان لیا. طلبہ نے میرے تمام سوالات کا عقائد اسلام کی رو سے صحیح جواب دیا. جب مسلمانوں کے بچے اسلام کے ضروری عقائد اور فرائض اسلامی سے واقف ہوں تو وہ چاہے جہاں یورپی طریقے پر تعلیم حاصل کریں کوئی حرج نہیں ہے.

دینیات کے ثمرات

مولانا عبد اللہ انصاری کے شاگردوں کی ایسی غیر متوقع شاندار کامیابی سے کالج کو غیر معمولی فائدہ ہوا. کالج کے خالص تعلیمی مقاصد کی شہرت اور مدرسۃ العلوم کے طلبہ کی لامذہبیت اور نیچریت کی تردید میں درجنوں تقریریں اور مقالات وہ کام نہ کر سکے تھے جو شاہ

افغانستان کے چند کلمات سے ہوا، امیر حبیب اللہ خان کی پر جوش تحسین و تائید کی گونج پورے ملک میں دور تک سنی گئی اور کالج کے متعلق غلط فہمیوں اور طلبہ کی نیچریت کے اعتراضات کو اپنے ساتھ بہا کر لے گئی.

نیک نامی اور عطیات شاہی

شعبہ دینیات کے اس امتحان اور امیر حبیب اللہ خان کے کلمات تحسین سے کالج کو اور بھی کئی قسم کے فائدے ہوئے. شاہ نے بیس ہزار روپے ذاتی عطیہ کے طور پر عنایت فرمائے اور ہر سال چھ ہزار روپے دیئے جانے کا اعلان کیا، جس میں سے پہلے سال کے لئے چھ ہزار روپے اسی وقت عطا فرما دیئے گئے. نیز کالج میں امتحان کی کامیابی اور کالج کی سرخ روئی کی خبر نے کالج کے ہمدردوں کو جو مسرت اور نیک نامی بخشی تھی اس کے اثر سے ملک بھر میں جگہ جگہ سے کئی بڑے عطیات اور چندوں کا اعلان ہوا. بادشاہ افغانستان کا یہ سفر اور شعبہ دینیات کا یہ امتحان کالج کی تاریخ میں ہمیشہ کے لئے ثبت ہو گیا. اس طرح مولانا عبداللہ انصاری کی ذات سے کالج کو غیر معمولی عزت، شہرت اور نیک نامی ملی.

اس امتحان میں کامیابی سے کالج کو جو فائدے ہوئے وہ الگ لیکن سب سے بڑا فائدہ مولانا عبداللہ انصاری کی ذات کو پہنچا جن کے خلاف کالج میں کچھ لوگوں نے تحریک شروع کر رکھی تھی اور ان کو کالج اور شعبہ دینیات سے الگ کرانا چاہتے تھے اور اس کے لئے ایک بڑی مہم بھی چلا چکے تھے. ان لوگوں کے حوصلے ایسے پست ہوئے اور مولانا عبداللہ انصاری کے نام اور کام کی اس قدر شہرت اور پذیرائی ہوئی کہ ان کے خلاف تمام منصوبے اور خیالات ختم ہو گئے. مولانا عبداللہ انصاری اس وقت سے اپنی زندگی کے آخری لمحات تک شعبہ دینیات سے وابستہ اور اس کے سربراہ (ڈین-Dean) رہے. اس واقعہ کے بعد کسی کو بھی ان کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت نہ ہوئی. اور وہ پوری زندگی نہایت حرمت و آبرو اور نہایت نیک نامی کے ساتھ اسی عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے.

مولانا عبداللہ انصاری کو تقریباً بتیس سال ۱۸۹۳-۱۹۲۵ء ایم.اے.او. کالج میں

رہنے کا موقع ملا اور اس تمام مدت میں وہ اسی بڑے اور باوقار عہدے پر فائز رہے جس پر اول دن ان کا تقرر ہوا تھا. یہ بجائے خود ایک نادر مثال ہے. کالج کے دور ملازمت میں کم لوگ ہیں جن کو ایسے لمبے عرصہ تک کالج کی خدمت و ملازمت کا موقع ملا ہو اور ایسے اشخاص تو شاید چند ہی ہوں گے جو ملازمت اور تقرر کے پہلے دن کسی بڑے عہدے کے لیے نامزد کئے گئے ہوں اور وہ اپنی پوری ملازمت میں بلکہ وفات تک اسی منصب پر فائز رہے ہوں.

مولانا عبداللہ انصاری کے دور قیام ہی میں سرسید کی وفات ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء (۴ ذی القعدہ ۱۳۱۵ھ) میں ہوئی. سرسید کی وصیت کے مطابق نماز جنازہ مولانا عبداللہ انصاری نے پڑھائی. اس کے بعد واقعات کا ایک تسلسل ہے. سید محمود (م: ۸ مئی ۱۹۰۳ء) کا تقرر ہوا. نواب محسن الملک (م: ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۷ء) آئے. نواب وقار الملک (م: ۲۷ جنوری ۱۹۱۷ء) سربراہ کار مقرر ہوئے. انگریز افسران اور اسٹاف میں کئی مرتبہ تبدیلی عمل میں آئی. ہنری سِڈن (بعمر ۲۴ سال ۱۸۷۵-۱۸۸۳ء)، تھیوڈور بیک (بعمر ۲۴ سال ۱۸۸۳-۱۸۸۹ء)، تھیوڈور موریسن (بعمر ۳۶ سال ۱۸۹۹-۱۹۰۵ء) ابتداء سے مختلف اوقات میں کالج کے انگریز پرنسپل رہے. لیکن مولانا عبداللہ انصاری کے عہدہ و منصب پر کوئی آنچ نہیں آئی. ایسا تسلسل اور تمام ذمہ داروں اور عہدہ داروں کا اعتماد اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب کام کرنے والا اپنے کام میں حد درجہ مخلص، محنتی، ادارہ کا بہی خواہ ہو، ادارہ کے افسران اور منتظمہ کے آپس کے تنازعات اور اختلافی معاملات اور بحثوں سے محتاط اور الگ رہتا ہو، اور اس کی ادارہ کی خدمت اور متعلقہ کام کی نسبت کسی کو شک کی گنجائش نہ ہو، اس کی ملازمت کے اندراجات میں ایسی کوئی تحریر بھی نہ ہو جس سے اس پر حرف آتا ہو.

مولانا عبداللہ انصاری نے اسی ملی خدمت میں وقت گذارا جس کی وجہ سے وفات کے وقت تک اسی طرح نیک نام اور سربلند ہے جس طرح کالج سے وابستگی کے آغاز پر تھے. یہ صلاحیت و کمال ہر ایک کے حصہ میں نہیں آتا.

علی گڑھ میں کالج کے اس پہلے ڈین کے نام سے کوئی یادگار نہیں ہے.

بہ کہ بفروشند مستوری بمستان شما

حواشی

۱- حالی، مولانا الطاف حسین۔ **حیات جاوید**۲:۴۹۲۔ دہلی۔ ۱۹۳۹ء۔

۲- مستفاد از مضمون جلالی صاحب (جلالی کون؟)۔ جلالی صاحب کے مضمون میں کتابوں اور مضامین دونوں کی ترتیب نہیں تھی۔ یہاں ان کو کسی قدر مرتب کر دیا ہے۔

۳- رپورٹ امتحان تعلیم دینیات مدرسۃ العلوم ۱۹۰۵ء۔ روداد مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ علی گڑھ ۱۹۰۵ء۔

۴- حوالہ بالا ص-۲۱۹۔

۵- رپورٹ امتحان سالانہ دینیات مندرجہ روئداد ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ علی گڑھ ۱۹۰۵ء ص ۲۱۹-۲۲۰۔

۶- ایضاً۔

۷- روئداد مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ ۱۹۰۵ء ص ۲۱۹-۲۲۰۔

۸- ایضاً۔

۹- ایضاً ص ۲۲۲

۱۰- ایضاً ص ۲۲۲

۱۱- تھانوی، مولانا اشرف علی۔ **امداد الفتاویٰ**۶:۱۵۶ دار الاشاعت۔ کراچی طبع اول (؟) بلاسنہ۔

۱۲- ایضاً۔

۱۳- زبیری، محمد امین۔ **تذکرہ محسن** ص ۱۲۴۔ بھوپال ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۵ء۔

۱۴- ایضاً۔

۱۵- علی، سر رضا۔ **اعمال نامہ** ص ۱۳۸۔ پٹنہ ۱۹۹۲ء۔

۱۶- ایضاً۔

۱۷- القرآن الحکیم۔ **آل عمران**۳:۳۷-۳۸۔ زبیری۔ **تذکرہ محسن** ص ۱۲۷-۱۲۸۔

۱۸- زبیری۔ **تذکرہ محسن** ص ۱۲۸۔

۱۹- ایضاً ص ۱۲۷-۱۲۸۔

۲۰- ایضاً ص ۱۲۸۔

باب : ۸

تحریک ندوۃ العلماء

مولانا عبداللہ انصاری ضروریات زمانہ سے واقف، متوازن مزاج اور روشن خیال عالم تھے. ان کو قدیم طرز کے عربی اداروں کو قریب سے دیکھنے برتنے کا موقع ملا تھا اور وہ عرصہ تک اسی طریقے پر درس وافادہ میں مشغول رہے تھے. سرسید سے قدیم خاندانی واقفیت، ان کے ساتھ بزرگوں کے مراسم اور علی گڑھ کے قریب گلاوٹھی میں قیام کی وجہ سے وہ ایم.اے.او. کالج کے متعلق وسیع وکثیر معلومات رکھتے تھے اور اس کے سب اچھے بُرے پہلوان کی نظر میں تھے. بعد میں خود اس ادارہ سے وابستہ ہو گئے تو اس کو اور زیادہ بہتر طریقے پر سمجھنے کا موقع ملا. مگر افسوس کہ دینی اور دنیاوی تعلیم دونوں قسم کے ادارے اور طبقات جو مسلمانوں کی مذہبی، معاشی اور ملی تنظیم اور تعمیر نو میں ہندی ملت مسلمہ کے لئے نمونہ ومثال اور سفینہ ملت کے ناخدا تھے ایک دوسرے سے بہت دور اور بہت بدگمان تھے. علماء اور مصلحین کی یہ کشاکش حساس مسلمانوں کے لئے رنج کا سبب بنی ہوئی تھی. بہت سے مسلمانوں اور ارباب علم وفکر کی طرح مولانا عبداللہ انصاری بھی دونوں طبقات کی باہمی مغائرت، بڑھتے ہوئے فاصلوں اور بے اعتمادی کی اس خلیج کو دیکھ رہے تھے جو لحہ بہ لحہ گہری ہو رہی تھی.

مولانا عبداللہ انصاری اس ماحول سے بددل نہ تھے بلکہ ملت کے ایک مخلص مربی کی حیثیت سے اس مرض کے دور کرنے کے لئے کسی تدبیر اور علاج کی فکر میں تھے کہ اسی دوران مجلس ندوۃ العلماء کی تاسیس ہوئی جو مسلمانوں کے ماضی وحال، مشرق ومغرب اور قدیم وجدید کے خستہ وشکستہ رشتہ کو استوار کرنے کے لئے امید کی ایک نئی اور تازہ کرن بن کر اُبھری. اس تازہ کوشش میں ہر مکتب خیال اور فکر ومزاج کے ارباب علم ودانش جمع ہو گئے تھے اور سب مل کر ایک قابل قبول حل کی تلاش میں تھے. اس لئے امید تھی کہ یہ تحریک مؤثر مفید

اور دیرپا ثابت ہوگی اور اس کے اثرات دور تک پہونچیں گے.

یہ کوئی نئی آواز نہیں تھی. یہ تو صدیوں سے راسخ اسلامی تعلیمی اصول کی طرف لوٹنے کی ایک اور کوشش تھی. عہد جدید میں اورنگزیب عالمگیر (ح:۱۶۵۸-۱۷۰۷ء) پہلا ہندستانی تھا جس نے نظام تعلیم میں دوررس انقلابی تبدیلی کی ضرورت محسوس کی تھی اور ایک جامع اور فراگیر درسی نصاب مرتب کرنے پر ملا نظام الدین سہالوی کو مامور کیا تھا. نصاب تعلیم کی تاریخ اپنے مورخ کے انتظار میں ہے لیکن علمی انقلاب کا جو خواب اورنگزیب نے دیکھا تھا وہ ملت اسلامیان ہند کے لئے خاصا خواب ربا ثابت ہوا. جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی برطانوی طرز کے تعلیمی اداروں کے قیام نے ایشیائی اور اسلامی طرز تعلیم کو پسپائی پر مجبور کردیا تھا. ناکام جنگ آزادی کے بعد نہر علم کے بیچ میں ایسی چٹانیں ڈال دی گئیں کہ وہ دو الگ الگ دھاروں میں بٹ گئی، اگرچہ دونوں طرف پھر یکجان ہوجانے کی تمنا زائل نہیں ہوگئی تھی. اسی تمنا کا ایک ظہور ندوۃ العلماء کا اجلاس کانپور تھا.

دو دھاروں کا سنگم بنانے کی آرزو

تعلیم کے دو دھاروں کا سنگم بنانے کے اسی آرزو کی وجہ سے اس تحریک کو برصغیر کے تمام مسلمانوں اور جملہ دینی طبقوں کی مشترکہ آواز اور متحدہ پلیٹ فارم تصور کیا جارہا تھا. ایک درجہ میں یہ تحریک تمام مسلمانوں کی آواز تھی. مولانا عبداللہ انصاری خود اسی فکر و مذاق کے آدمی تھے. ان کے لئے ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ وقت کے اس اہم تقاضے سے تغافل برتیں اور اس تحریک سے جانتے بوجھتے بے تعلق رہیں، اس لئے جیسے ہی یہ صدا ان کے کانوں تک پہنچی انہوں نے فوراً اس آواز پر لبیک کہا اور تحریک اور جدوجہد میں شامل ہوگئے.

ندوۃ العلماء کی تحریک کا آغاز مدرسہ فیض عام کانپور کے فارغین کے سالانہ جلسہ دستار بندی کے موقع پر ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۲ء) میں ہوا تھا. مدرسہ کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لئے معمول کے مطابق چند جید علماء کانپور پہنچے، اجلاس کے دوران اور درمیانی وقفوں میں ایک دوسرے سے ملاقاتیں ہوئیں. یہ تمام علماء ملت اسلامیہ ہند کے ممتاز نمائندے،

اپنے علاقوں میں باثر، ملک کے دینی علمی افق پر کم یا زیادہ متعارف تھے اور اپنے اپنے انداز میں کام کرنے والے افراد تھے. ان سب کو مسلمانوں کی زبوں حالی، پست ہمتی، بے عملی اور آپس کے اختلافات سے سخت تکلیف تھی اور چاہتے تھے کوئی صورت ایسی نکلے یا انجمن ایسی قائم ہو جو ان کے معاملات یا مسائل کا فکر کرے اور ان سب کو اختلاف نظریات وسائل کے ساتھ ایک جگہ لانے کی کوشش کرے. اس کے لئے علماء کی ایک کمیٹی یا جماعت منتخب کی گئی اور طے یہ ہوا کہ یہ انجمن اس کام کو آگے بڑھانے کے لئے ایک بڑا جلسہ عام منعقد کرے.
یہ ارادہ ۱۳۱۱ھ میں پورا ہوا جب ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس عام کانپور میں طلب کیا گیا جس میں مؤقر علماء اور نامور اہل فضل وکمال کو مدعو کیا گیا تھا. علی گڑھ بھی اس کی دعوت آئی اور مولانا عبداللہ انصاری نے اجلاس میں شرکت کے لئے کان پور کا سفر کیا جس میں علامہ شبلی نعمانی ان کے رفیق تھے. مولانا عبداللہ انصاری اجلاس کے آغاز سے اس میں شامل رہے.

ندوہ کے پہلے جلسہ کی صدارت

اجلاس کے شرکاء میں مولانا عبداللہ انصاری کا بہت اکرام ہوا جس میں حضرت مولانا مملوک علی اور حضرت مولانا محمد قاسم اور علی گڑھ کی نسبت کا احساس بھی یقیناً شامل تھا.
مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی اور ندوۃ العلماء کے تذکرہ نگاروں کی اطلاع ہے کہ مولانا عبداللہ انصاری نے جلسے کی صدارت کے لئے مولانا لطف اللہ علی گڑھی کا نام پیش کیا جس کی تائید مولانا شاہ محمد حسین الہ آبادی نے کی اور مولانا لطف اللہ علی گڑھی نے اجلاس کی صدارت کی. مگر مولوی عبدالرزاق کانپوری مولف **البرامکہ** کا بیان ہے کہ مولانا عبداللہ انصاری اس اجلاس کے صدر بنائے گئے تھے. مولوی عبدالرزاق کانپوری خود اس جلسہ میں شریک تھے بلکہ اس کے بنیادی ارکان میں تھے اور عرصہ تک ندوۃ العلماء کے ناظم دفتر اور وقائع نویس رہے تھے. ان کا بیان ہے:

> اول مدرسہ فیض عام کے طلبہ کی دستار بندی ہوئی، اس کے بعد مولانا عبداللہ ناظم دینیات اس جلسہ کے صدر قرار پائے. (۱)

تاہم پہلا بیان بھی غلط نہیں. سہ روزہ اجلاس میں مختلف علماء جلسوں کی صدارت کرتے رہے تھے اور ۲۳ اپریل کو بعد نماز مغرب مولانا لطف اللہ علی گڑھی کی زیر صدارت ۳۰ علماء کا ایک نمائندہ اجلاس ہوا جس میں ندوۃ العلما کے اغراض و مقاصد اور اس کا دستور العمل زیر غور آیا. اس اجلاس میں مولانا شبلی نعمانی نے اپنا تیار کردہ دستور العمل پیش کیا جس کے بعد نصاب تعلیم مرتب کرنے کے لئے ایک ۱۲ رکنی مجلس مقرر کی گئی جس کے ایک رکن مولانا عبداللہ انصاری تھے. دوسرے روز صبح کا اجلاس بھی مولانا لطف اللہ علی گڑھی کی صدارت ہی میں منعقد ہوا.

مولانا عبداللہ انصاری کی تقریر

مولانا عبداللہ انصاری نے ندوہ کے اس ابتدائی جلسہ میں ایک جامع اور مفصل تقریر کی جس میں مسلمانوں کے ملی مسائل، اجتماعی کمزوریوں اور اصلاح طلب موضوعات پر توجہ دلائی تھی. یہ بہت اہم تقریر تھی. اس کا ایک مفصل اقتباس نواب محسن الملک نے ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس سالانہ ۱۸۹۴ء منعقدہ علی گڑھ میں پیش کیا تھا جس سے مولانا عبداللہ انصاری کے اصلاح ملت کے جذبہ اور مجوزہ تفصیلی تدابیر کا علم ہوتا ہے:

> اس وقت جو ہم اپنی تعلیمی اور اخلاقی حالت دیکھتے ہیں تو اس میں انتہا درجہ کی ابتری پاتے ہیں، اور اس پر آفت تو یہ ہے کہ ہماری تقدیر نے ایسا قضیہ منعکس کر دیا کہ ہم لوگ بلا کو بھی بلا نہیں سمجھتے بلکہ بلا کو عطا، درد کو دوا، زحمت کو رحمت، نقمت کو نعمت، تلون کو استقامت، ذلت کو عزت، قساوت کو اخوت، نفسانیت و تعصب کو حمایت دین وملت سمجھنے لگے ہیں.
>
> بھلا وہ مریض کیونکر صحت پا سکتا ہے کہ اپنے آپ کو مریض ہی نہ سمجھے. سب سے بڑھ کر انسان کے پیچھے یہ روگ ہے کہ باوجود بیمار ہونے کے پھر آپ کو تندرست سمجھے. جس قوم پر شامت اعمال کا وبال اور انقلاب کی بلا اور عام تباہی کی وباء آنے والی ہوتی ہے تو پہلے ہی سے اس قوم کی عقل الٹی ہو جاتی ہے. شفاعت پسند دنائت پذیر طباع ہو جاتے ہیں. چنانچہ فی زمانا نعوذ باللہ اپنا یہی حال ہے. (۲)

مرتب
ڈاکٹر رضیہ حامد

مجلس تدوین نصاب جدید

اس جلسہ کی آخری نشست ۷ اشوال ۱۳۱۱ھ (۲۴ اپریل ۱۸۹۴ء) میں جو تجویزیں منظور ہوئیں ان میں سے ایک اہم تجویز طریقہ تعلیم کی اصلاح اور نئے نصاب کی ترتیب بھی تھی. اصلاح نصاب کی یہ تجویز کثرت رائے سے منظور ہوئی اور طے شدہ ترتیب کے مطابق نصاب پر نظر ثانی اور نیا نصاب تعلیم مرتب کرنے کے لئے بارہ علماء کی ایک کمیٹی بنائی گئی. مولانا عبداللہ انصاری اس کمیٹی کے بنیادی رکن تھے.

نئے نصاب کی تشکیل، موزوں کتابوں کا انتخاب، اس کے نفاذ کی تدابیر، متوقع فوائد، نقصانات کے اندیشے، اہل مدارس اور تعلیمی حلقوں میں اس پر امکانی اعتراضات اور نئے خدشات وغیرہ ہر عنوان اہم اور غور وفکر کا مستحق تھا. نصاب سے متعلق ہر ایک پہلو پر مختلف نشستوں میں بار بار غور وفکر ہوا، جس کی وجہ سے ترتیب نصاب کے عمل میں بہت وقت صرف ہوا مولانا عبداللہ انصاری آخر تک اس میں شریک رہے. ندوہ کے اراکین ان کے طویل اور متنوع تدریسی تجربہ کے پیش نظر ان کی رائے کو بہت اہمیت دیتے تھے. یہی وجہ ہے کہ مولانا عبداللہ انصاری اس منصوبہ کی تکمیل کے بعد بھی ندوہ میں نصاب سے متعلق کمیٹیوں کے رکن رہے.. ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ نے جمادی الثانی ۱۳۱۷ھ میں مجلس نصاب تعلیم دارالعلوم مقرر کی تو مولانا عبداللہ انصاری اس میں بھی شامل تھے.

یہ بات بہت اہم ہے کہ علماء دیوبند میں مولانا عبداللہ انصاری جدت پسند تھے اور دین اور دنیا دونوں کی درستی اور فلاح کے قائل تھے. (۳)

ندوہ کے دوسرے اجلاس میں تقریر

مجلس ندوۃ العلماء کا دوسرا اجلاس ۶-۸ شوال ۱۳۱۲ھ (۱۲-۱۴ اپریل ۱۸۹۵ء) کو منعقد ہوا تھا. اس اجلاس میں مولانا عبداللہ انصاری نے آیت پاک هُوَالَّذِيٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ٥ (الانفال ۸:۶۲) پر مفصل وعظ کیا اور اس سے باہم اتفاق کو ضروری ثابت کر کے حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے آپس کے اتفاق کو واضح

کرتے ہوئے اسلام کے بنیادی ارکان نماز اور حج کی اجتماعی ہیئت اور ان سے اتفاق و اتحاد کی اجتماعی ضرورت اور افادیت ثابت کی. (۴)

اس سلسلہ کی آخری چھٹی نشست میں ندوۃ العلماء کا اساسی دستور العمل پیش ہوا جس میں چوبیس افراد پر مشتمل مجلس انتظامیہ بنائی گئی تھی. مولانا عبداللہ انصاری اس مجلس انتظامی کے رکن بھی تھے.

مولانا عبداللہ انصاری نے ان تمام جلسوں میں جو تقریریں کیں اور جو تجویزیں پیش کیں اور ان پر جو بحث و مباحثہ، تبادلۂ خیال اور عمل ہوا ان سب کو دیکھتے ہوئے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ندوۃ العلماء کی تحریک، اس کے تکوینی خدوخال، اس کے مقاصد و نظام، اس کی تجاویز اور اس کے سالانہ جلسوں سے مولانا عبداللہ انصاری کی گہری وابستگی آخر تک رہی. وہ ندوہ کے تمام اجتماعات، مشوروں اور اس کی مختلف کمیٹیوں میں پابندی اور اہتمام سے شامل ہوتے رہے.

ایک کم عمر ہم عصر مولانا سید عبدالحی حسنی (۱۲۸۶-۱۳۴۱ھ/ ۱۸۶۹-۱۹۲۲ء) کی چبھتی ہوئی رائے (نزهة الخواطر) کے باوجود، جسے ان کی معاصرانہ عدم رواداری قرار دے کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے یا ممکن ہے وہ بعد میں کسی شخص کی الحاقی عبارت ہو، مجلس ندوۃ العلماء کے زعماء اور اراکین سب ہی مولانا عبداللہ انصاری کے علم و عرفان کے کمالات، ان کی خاندانی علمی نسبت اور علی گڑھ کالج سے وابستگی کی وجہ سے ان کا احترام کرتے تھے اور اکثر بنیادی معاملات و مباحث میں ان کی رائے کو اہمیت دیتے تھے. مولانا عبداللہ انصاری اہل ندوہ کی عنایات اور محبت سے آگاہ تھے اور دیکھ رہے تھے کہ دیوبند اور علی گڑھ کی تعلیم گاہوں کی طرح ندوہ بھی جو ایک نئے نہج پر قائم ہوا ہے ترقی کر رہا ہے. ان کو یقین تھا کہ یہ نیا ادارہ کسی وقت ان دو عظیم اداروں کی طرح مرکز قلب و نگاہ بن جائے گا.

مولانا عبداللہ انصاری کو علمائے دیوبند کی خالص دینی زندگی، تقوی طہارت اور ان بزرگوں کے دینی، علمی، باطنی کمالات کا خوب مشاہدہ اور تجربہ تھا کہ ان ہی کے قدموں

میں بیٹھ کر پڑھا اور سیکھا تھا. ادھر ارباب علی گڑھ کی اولوالعزمیوں اور مقاصد سے بھی وہ آگاہ تھے. ندوہ ان دونوں مناہج کے درمیان ایک راستے کی تلاش تھی. مولانا عبداللہ انصاری کا احساس تھا کہ دینی و مادی علوم یکساں طور پر حاصل کرنا مسلمانوں کی ضرورت تھی. اس نقطۂ نظر سے انہوں نے ندوہ کی علمی مجلسوں اور نشستوں میں فکر دیوبند اور طرز علی گڑھ دونوں کی بہترین نمائندگی کی. اپنے بزرگوں اور صحیح دینی علمی طریقہ کے مطابق دینی علوم کے مقاصد اور اصولوں کو بھی پیش نظر رکھا اور علی گڑھ کے تجربہ سے عصر جدید مسائل کو حل کرنے کے لئے جس استفادہ اور اعتدال کی ضرورت تھی اس کی نشاندہی بھی کی. انہوں نے نہ قدیم صالح کو ترک کیا، نہ جدید نافع سے منہ موڑا بلکہ علمی توازن اور فکری اعتدال کے ساتھ اہل ندوہ کے ساتھ چلتے رہے اور اسی جدوجہد میں سفر حیات تمام ہوا.

نادیہ میں انقلابی تجاویز

مجلس ندوۃ العلماء کے دوسرے اجلاس میں مولانا عبداللہ انصاری نے جو تجاویز پیش کیں اور جن خیالات کا اظہار کیا ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی ہنگامی ابال یا اچانک خیال آرائی نہیں تھی بلکہ ایک عرصہ کے غور و فکر اور عملی تجربہ کا نتیجہ تھا.

مولانا عبداللہ انصاری کو دینی مدارس کے طرز تعلیم میں اصلاح کی ضرورت کا احساس بطور مدرس کے ہو تو کیا حیرت کہ برسوں اس نظام کے تحت نوجوان طلبہ کو پڑھا کر ایک مفکر اور صاحب نظر استاذ کو اس نظام کے حسن و قبح کا اندازہ کرنا چنداں مشکل نہ تھا لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا عبداللہ انصاری طالب علمی کے دور ہی سے اس نظام کو پرکھ رہے تھے اور اسی زمانہ سے طلبہ کے قوائے ذہنی پر اس نظام اور نصاب کے اثرات کا بغور جائزہ لے رہے تھے.

درس نظامی کی تاریخ

دارالعلوم دیوبند سمیت تمام دینی مدارس نے جزوی تبدیلیوں کے ساتھ درس نظامی کے طور پر معروف نصاب تعلیم کو اپنا لیا تھا. یہ نصاب تعلیم ملا نظام الدین سہالوی (۱۶۷۷-

۱۷۴۸ء) نے اورنگ زیب عالمگیر (م:۱۷۰۷ء) کی ہدایت پر مرتب کیا تھا جس کے دو بنیادی مقاصد تھے. ایک یہ کہ برصغیر تاریخ میں پہلی بار قندھار و کابل سے سیستان سے بنگال و آسام تک اور بلوچستان و سندھ سے مدراس و منگلور تک ایک متحدہ ملک کی صورت میں سامنے آیا تھا اور بہت سی مذہبی، علاقائی، نسلی اور لسانی قومیتوں پر مشتمل ایک قومی گہوارہ بنا تھا. لہٰذا رفاہ عامہ کی خاطر اس مملکت کو ایک عادلانہ سیاسی اور اقتصادی نظام درکار تھا اور اس کے لئے اسلامی علوم کے ماہرین کی ضرورت تھی تا کہ وہ مجوزہ عادلانہ نظام تقویت پا سکے. دوسری جانب اتنے بڑے ملک کے انتظامی امور کی نگرانی کے لئے ایسا عملہ درکار تھا جو ایک طرف قانون کا ماہر ہو اور دوسری جانب ملک کی مادی ترقی و فلاح کی منصوبہ سازی کا اہل ہو. اس پیمانہ پر اورنگزیب کے پیش نظر اکبری دور کے استاذ فتح اللہ شیرازی جیسا عبقری تھا جو بلند پایہ فقیہ تھے اور ساتھ ہی اقتصادیات، ریاضی، فلکیات (علم ہیئت) طب، کیمیا کے ماہر اور اس معیار کے موجد انجنیر تھے جنہوں نے لگاتار بارہ گولے داغنے والی ایسی توپ ایجاد کی تھی جو حالت امن میں کھیتوں میں کسانوں کے کام آتی تھی. چنانچہ اورنگزیب کا مقصد فقیہ سائنسداں اور اساطین سلطنت تیار کرنے والا تعلیمی نظام تھا.

ملا نظام الدین سہالوی نے یہ نظام تعلیم مرتب کرنے کی ذمہ داری لی اگرچہ اس میں مادی علوم کی اُس باکمال مہارت کا امکان نہ تھا جو ملک اور مسلمانوں کو نئے فتح اللہ شیرازی دے سکتا. اورنگزیب کے بعد سلطنت مغلیہ میں انحطاط آیا تو علمی عبقریت کا خواب پھر کسی بادشاہ یا امیر وزیر کی آنکھوں میں نہ جاگا. البتہ درس نظامی جیسا بھی تھا باقی رہ گیا اور کانپور میں ندوۃ العلماء کے پہلے جلاس میں مولانا عبداللہ انصاری اس تصور کی تجدید کے سب سے نمایاں مفکر ثابت ہوئے جس کا ثبوت ان کی صدارتی تقریر کا یہ جملہ ہے کہ:

عہد جدید کا انقلابی مفکر

> تعلیم میں ہم وہ انداز اختیار کریں جن سے ماضی میں ایک محدث طبیب، ایک فقیہ کیمیا گر، اور ایک عالم دین سائنسداں بھی ہوتا تھا.

بیشک یہ بڑا انقلابی اور تازہ کار تصورت تھا؛ لیکن پھر یہی علمی فلسفہ مسلمانوں کی علمی میراث اور ملت کا تاریخی سرمایہ بھی تھا. مولانا عبداللہ انصاری کے پڑپوتے محمد طارق غازی (**نظریۂ تہذیب** ص۱۶۴-۱۷۴) نے اسی نقطۂ نظر کی شرح کرتے ہوئے عہد صحابہؓ سے حکیم الاسلام امام زکریا ابن محمد قزوینی (۱۲۰۸-۱۲۸۳ء) تک چھ سو برس کے دوران نمودار ہونے والے فقیہ کیمیا گروں اور عالم دین سائنسدانوں کے ناموں اور ان کے کارناموں کی تفصیل دینے کے بعد لکھا ہے کہ

> یہ نکتہ ذہن میں رہے کہ بیشک احادیث میں دنیا کو ملعون کہا گیا ہے مگر کہیں بھی علوم دنیا کو ملعون نہیں قرار دیا گیا. چنانچہ اگر کوئی مسلمان یہ سوچے کہ علوم عناصر بھی اسی ملعونیت کی زد میں آتے ہیں تو وہ بے خیالی میں بالواسطہ طور پر حضرت آدم علیہ السلام کے شرف (مسجود ملائک ہونے کے سبب) سے غفلت کرے گا.

محمد طارق غازی. **نظریۂ تہذیب**/نظریۂ مادیات. اقرا ایجوکیشن فاؤنڈیشن. ممبئی. ۲۰۱۷ء. ص۱۷۴-۱۷۵.

مولانا عبداللہ انصاری اسلامی تاریخ کے اس علمی انقلاب کو دوبارہ برپا کرنے کے خواہاں تھے. انہوں نے اساطین امت کو اس کی دعوت دی اور اپنی اولاد میں اس فکر کو منتقل کر دیا.

زمانۂ طالب علمی کا تجربہ

چنانچہ نادیۃ العلماء کانپور میں ان کا مبتکرانہ بیان نہ تو اتفاقی خیال تھا، نہ شاعری، نہ زور خطابت اور زبان آوری تھی. بلکہ اس خیال کا ایک ایک لفظ برسوں کے غور فکر، علمی اور تدریسی تجربات اور ملی دردمندی کا آئینہ دار تھا. یاد رہے کہ مولانا عبداللہ انصاری ۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲ء) میں دارالعلوم دیوبند کے فارغ ہو گئے تھے لیکن وہ مطمئن نہیں تھے. غالباً یہ بھی ان کی انفرادیت تھی کہ سال بھر بعد پھر مدرسہ میں واپس آئے اور مزید دو سال کے دوران ۱۲۹۲ھ تک ادبیات عربی میں **دیوان حماسہ**، منطق وحکمت میں **صدرا**، ریاضی و فرائض میں **شرح چغمینی**، اور کلام میں **شرح مواقف** وغیرہ کے امتحانات دئے.

ایک سال علی گڑھ کے کسی مدرسہ میں تدریسی خدمت کے بعد بغرض تعلیم مدرسہ میں واپسی مروجہ نصاب تعلیم اور نظام تعلیم سے ان کے عدم اطمینان کی کھلی دلیل ہے۔لہذا موقعہ ملنے پر ان نصابی اور نظامی کمزوریوں اور خرابیوں کو رفع کرنے کی غرض سے انقلابی اقدامات کے لئے ندوہ کی تحریک میں ان کا قائدانہ کردار نہ صرف ان کے دقیق علمی ذوق کا ثبوت ہے بلکہ اس اہم مسئلہ پر ان کی بلیغ فکر کا آئینہ دار بھی ہے.

فکرِ اورنگزیب کی بازگشت

ایک سادہ سا خیال تو یہ ہے کہ اگر وہ علی گڑھ نہ گئے ہوتے تو ممکن ہے وہ یہ سب کچھ نہ سوچتے یا نہ کرت لیکن مغربی علوم کی تعلیم اور شے ہے اور علم عناصر کی تحصیل چیزے دیگرے. یورپ کے صنعتی انقلاب کا سبب اور نتیجہ بننے والے مادی علوم کی بنیاد اقتصادی استحصال پر رکھی گئی تھی، جبکہ اسلامی روحانی علوم سے سیراب علوم عناصر کی نہاد انسانی فلاح پر تھی. یہ فرق ذہن میں رکھنا ضروری ہے. اگر دونوں تجاویز میں کوئی فرق نہ ہوتا تو مولانا عبداللہ انصاری نادیۃ العلماء کی تحریک کو تضیع اوقات سمجھتے کہ اس مہم کا جو اس کا منشا تھا وہ تو علی گڑھ میں پورا ہو رہا تھا. وہ ایک طرف علی گڑھ میں فکری خلا محسوس کرتے تھے اور دوسری طرف مدارس کے نظام تعلیم سے غیر مطمئن تھے. چنانچہ تعلیم سے رسمی فراغت کے بعد مزید دو سال کے لئے مدرسہ میں واپسی یا تو ایک عبقری اور ابتکاری مفکر کا تعارف ہے یا کم سے کم درجہ میں اورنگ زیب عالمگیر کے انقلابی فکر کی بازگشت تھی.

ایک قابل غور نکتہ ہے کہ مولانا عبداللہ انصاری کی توجہ دینی مدارس کے نصاب اور طرز تدریس کی اصلاح پر مرکوز رہی جس سے خیال ہوتا ہے کہ وہ اسی مٹی میں نم پاتے تھے اور اسی ادارہ کے بیج دیکھتے تھے.

مولانا عبداللہ انصاری دینی مدارس کے نظام تعلیم اور مروج نصاب تعلیم کو زیادہ مفید بنانے کے لئے جدید نقطۂ نظر سے مادی علوم کو اس نصاب میں شامل کرنا چاہتے تھے. یہ ترمیم و اضافہ اس لحاظ سے مسلمانوں کی تعلیم گاہوں کی شیرازہ بندی کی ایک تدبیر تھی کہ اس

طرح وہ باہم قریب آئیں، الگ الگ دھارے نہ رہیں، اور ایک بڑی ندی اور ایسا مواج دریا بن جائیں جس کے دونوں کناروں پر سیرابی، شادابی اور سرسبزی کا اطمینان و سامان ہوتا ہے. ان کے پیش نظر دوسرا اہم نکتہ یہ تھا اس طرح تعلیم کے میدان میں باہمی تفرقہ و انتشار اور بے اعتمادی ختم ہوگی اور ہر مدرسہ خود کو دوسرے کا رفیق سمجھے، مدمقابل اور فریق نہ بنے.

مجلس ندوۃ العلماء کے دوسرے اجلاس کی جملہ نشستوں میں مولانا عبداللہ انصاری نے جن خیالات کا اظہار کیا ان میں سے کئی کا تعلق خصوصاً مدارس میں باہم رابطہ اور نصاب تعلیم میں معقولات بلکہ ترقی یافتہ مادی علوم کے صیغہ میں انقلابی اصلاحات سے تھا. ان موضوعات پر ان کی تجاویز ندوۃ العلماء کی مجالس میں خوش دلی اور اکثریت کی رائے سے قبول کی گئیں. درحقیقت یہی تجاویز ندوۃ العلماء کی جانب سے اپنا ایک مدرسہ یا دارالعلوم قائم کرنے کی محرک بنیں اور انہی تجاویز پر عمل کی وجہ سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تشکیل و تاسیس عمل میں آئی. مولانا عبداللہ انصاری کی جدتِ فکر ہی تھی جو ندوہ کے تعلیمی کارواں کو آگے بڑھانے میں مددگار بلکہ رہنما ثابت ہوئی.

اس لحاظ سے مولانا عبداللہ انصاری انجمن ندوۃ العلماء اور خصوصاً دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے بانیوں میں سے ہیں، اور اس ادارہ کے مبتکر مفکر ہیں.

وہ ندوۃ کے تمام جلسوں میں شرکت کرتے رہے. شائد ہی کسی سخت مجبوری یا بیماری کی وجہ سے ندوہ کے کسی اجلاس یا مشاورتی نشستوں میں شرکت نہ کی ہو. ندوہ کا انیسواں اجلاس منعقدہ ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء وہ آخری جلسہ تھا جس میں مولانا عبداللہ انصاری شریک ہوئے تھے. اس کے اگلے سال ۱۳۴۴ھ/۱۹۲۵ء میں مجلس ندوۃ العلما کے اجلاس پٹیالہ میں مولانا عبداللہ انصاری کے لئے قرارداد تعزیت پیش کی گئی.

تہتر سال کی عمر میں ۱۹۲۵ء میں مولانا عبداللہ انصاری کا انتقال ان کے آبائی قصبہ انبہٹہ میں ہوا اور وہیں خاندانی قبرستان میں آم کے درختوں کے ایک جھنڈ کے سائے میں آسودہ خاک پاک ہیں.

زمانہ کی ایک بڑی ضرورت

ان نکات کی بازگشت ندوہ کے جلسوں میں سنہ جاتی رہی. ندوۃ العلماء کے سب سے پہلے اجلاس منعقدہ کانپور میں مولانا عبداللہ انصاری کا خطاب کئی اعتبار سے اہم اور اُس زمانہ کی ایک بڑی ضرورت پر متوجہ کرتا تھا. ان افکار سے امت آج بھی فائدہ اٹھا سکتی ہے:

الحمدللہ ثم الحمدللہ، بدون کسی کی فکر و تدبیر کے تخمیناً پچیس سال سے داعیہ غیبی کے سبب علوم اسلام کے زندہ رہنے کے اکثر اسباب موجود ہو گئے. ماشاءاللہ بہت سے لائق و فائق علماء فضلا موجود ہیں. مدارس اسلامیہ بہ کثرت جاری ہیں. طلبا ہر مدرسے میں مناسب تعداد کے ساتھ موجود ہیں. کتب درسیہ ہر مدرسے میں بفضلہٖ تعالیٰ بقدر ضرورت پڑھائی جاتی ہیں. خیر خواہان اسلام بڑی عُلوِ ہمتی کے ساتھ سالہا سال سے خدمت علماء و طلبہ و دیگر حوائج مدارس میں جان و مال بہ طیب نفس نثار کر رہے ہیں. پس بحمدللہ اس وقت زندگی علوم کے تمام سامان امید سے زیادہ ہر جگہ مہیا ہیں.

مگر خوبی قسمت سے اتفاقی کاموں میں بھی نفسانیت کو دخل دیا جا رہا ہے. وہ یہ کہ تھوڑی سی مسافت کے درمیان میں بہت سے مدارس جاری کر رکھے ہیں. یہ نہیں کہ باتفاق رائے انہیں مدارس کو جہات اربعہ میں ایک مناسب مسافت پر مقرر کرتے کہ جس سے عظیم الشان نفع پہنچتا. سب سے بڑھ کر یہ ابتری ہے کہ بعض بعض شہر بلکہ بعض بعض قصبے میں بلا ضرورت کئی کئی مدرسے ہیں اور ہر مدرسے کے مدرس و مہتمم اپنے ہی مدرسے کی ترقی کے خواہاں ہیں. حتیٰ کہ بعض حضرات اس درجہ اپنے مدرسے کی خیر خواہی میں منہمک ہو جاتے ہیں کہ دوسرے مدارس کے تنزل بلکہ تخریب کے درپے ہو جاتے ہیں جیسا کہ یہ امر آج کل مشاہد ہو رہا ہے.

اس تقریر میں مولانا عبداللہ انصاری نے دینی مدارس کو زیادہ مفید اور موثر بنانے کے لئے چند اہم مشورے بھی دیئے تھے:

اگر یہ حضرات ایک شہر یا قصبے میں ایک ہی مدرسہ رکھیں اور سب مل کر ایک ہی مدرسے کو ترقی دیں تو کس قدر ایک ہی مدرسہ ترقی علم کا ذریعہ ہو اور اتفاق کی وجہ سے تمام حوائجِ مدرسہ کا سر انجام ہوتا رہے، اور طلبا ایسے ایسے کامل فارغ التحصیل

ہوں کہ باید و شاید مگر قریب قریب ،شہر بشہر ،قصبہ بقصبہ بلا نظام و بغیر سلسلہ مدارس ہونے کی وجہ سے علی الخصوص ایک ایک شہر میں بلا ضرورت کئی کئی مدرسے ہونے کے سبب چار و ناچار مدرسین کو بغرض رونق مدرسہ طلبا کی وہ وہ خوشامدیں کرنی پڑتی ہیں کہ جس کا بیان نہیں ہوسکتا.اور نیز مہتممین ایسی ایسی بیجا ناز برداریاں کر کے طلبہ کو تھامتے ہیں کہ جس کی حد نہیں.پس عاقل اور دانا لوگ اس امر سے قیاس کر سکتے ہیں کہ جب طالب مطلوب بن جائے تو کمال کس طرح حاصل ہوگا.

کمزوریوں کی نشان دہی

انہوں نے مدارس کی چند کمزوریوں کی طرف بھی اشارات کیے:

علاوہ بریں طالب علم کو استعداد ہو یا نہ ہو،شوق ہو یا نہ ہو پانچ پانچ چھ چھ سبق شروع کرادیے جاتے ہیں.مدرسین کو یہ فخر کہ ہمارے مدرسے میں اِس سال اتنی کتابوں کی تدریس ہوئی اور اس قدر طلبہ کے دستار فضیلت باندھی گئی اور طلبہ بوجہ نادانی متعدد اسباق اور مدرسین و مہتممین کی دلداریوں کی خوشی میں پھولے نہیں سماتے،حالانکہ ان کے ساتھ یہ برتاؤ ایسا ہے کہ جیسے ضعیف بچے کو گھنٹے گھنٹے پر روٹی دے کر ہلاک کریں،یا چراغ میں اس قدر تیل ڈال دیں کہ اُس کی لو بھی ڈوب جائے اور چراغ گل ہو جائے.فی زمانا جو ناقص الاستعداد طلبہ ہونے کے وجوہات ہیں منجملہ ان کے ایک خاص وجہ احقر کے نزدیک تکثیر اسباق اور ناز برداری کی حالت میں طلباء کا رہنا ہے.

اس کے بعد مولانا عبداللہ انصاری نے اپنے اور اس سے پہلے دور کے اساتذہ اور طلبہ کی علمی محنتوں،مغز زنی اور کتابوں کی کم یابی کا مؤثر انداز میں ذکر کیا ہے:

جن حضرات نے ان مدارس اسلامیہ سے پیشتر طالب علمی کی ہے ان کے جگر آج تک جان رہے ہیں کہ طالب علمی کیسی کٹھن چیز ہے اور مدرسی کس جانفشانی کا نام ہے.مدرسی یہ کہ تمام حواشی اور شروح کا مطلب تو ازبر ہو مگر خدمت تدریس کا اطمینان میسر نہ ہو.طالب علمی یہ کہ نہ کتاب دستیاب،نہ روٹی کپڑے کا انتظام،نہ رہنے کے مکان کا بندوبست.سچ ہے طالب علمی کا پیشہ اور سب پیشوں سے زیادہ

مشکل ہے آسان نہیں.

لَوْ کَانَ طَلَبُ الْعِلْمِ اَسْهَلَ حِرْفَةٍ لَمَا كَانَ ذُوْ جَهْلٍ عَلَى الاَرْضِ فِي زَمَنٍ =اگر علم کی طلب کچھ آسان کام ہوتا تو آج کل زمانہ میں زمین پر جہل عام پھیلا ہوا ہوتا.

سو اُس وقت بڑے جد و جہد سے اگر کوئی بد خط کرم خوردہ کتاب مل گئی اسی کو ہزار غنیمت سمجھا اور مثل صحیفۂ آسمانی کے اس کی تعظیم کی اور احتیاط سے رکھا. بعد دستیابی کتاب روز دو وقتہ اُستاد کے درِ دولت پر حاضری دیتے ہیں اور کمال ادب اور احترام سے سلام کر کے کسی کونے میں جا بیٹھتے ہیں اور استاد صاحب کی آواز پر کان لگ رہے ہیں. روزانہ اسی تگ و دو میں وقت مقررہ پورا کر کے چلے آتے ہیں. اگر دوسرے تیسرے وقت اُستاد صاحب نے چیں بہ جبیں ہو کر فرما دیا کہ ہاں میاں! کچھ تھوڑا سا سبق کہنا ہے تو کہہ لو. یا میاں مجھ کو فلاں جگہ جانا ہے ہمراہ چلو اور راستے میں پڑھتے چلنا تو شاگرد صاحب نے شاد ہو کر دست بستہ عرض کیا کہ بہت اچھا اور استاد صاحب کی اس شفقت کو ایسا غنیمت سمجھا کہ گویا روح القدس تعلیم کے واسطے اُتر آئے ہیں، حضرت خضر پڑھانے پر متوجہ ہو گئے.

پس چونکہ اس کتاب بد خط و کرم خوردہ میں بدون اعلیٰ درجے کی عرق ریزی کے مطالعہ نہیں نکل سکتا تھا ادھر استاد کی توجہ بھی عنقا صفت، لہٰذا مطالعے میں شبانہ روز ایسی جان کھپی کرتے تھے کہ مضمون سبق کا خلاصہ مطالعے ہی میں حفظ ہو جاتا تھا اور استاد صاحب سے صرف تصحیح کی ضرورت رہتی تھی یا کوئی خاص نکتہ حاصل ہو جاتا تھا. سو اُن کو ایک کتاب پڑھ لینے میں وہ قوت مطالعہ بڑھ جاتی تھی کہ اس وقت کے فارغ التحصیل لوگوں کو بھی وہ ملکہ نہیں ہوتا اور بڑے بڑے نکات غامضہ استادوں کے ایک اشارے میں سمجھ جاتے تھے کہ اس وقت کے بعض مدرسین کتاب سے بھی نہیں سمجھ سکتے.

مدرسوں کی کثرت اور تعلیم کی کمزوری کا ایک قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ طلبہ کی لیاقت اور استعداد میں کمی آنے لگی. مولانا عبداللہ انصاری کے زمانہ تعلیم میں **شرح جامی** پڑھنے

والا آدھا عالم گنا جاتا تھا، مگر اب **شرح جامی** پڑھنے والوں کو طالب علم کہنا بھی صحیح معلوم نہیں ہوتا. اس وقت طلبہ سخت پریشانی اور کھانے کی مشکل کے باوجود محنت سے پڑھتے تھے، اب تمام سہولتوں کے بعد بھی تعلیم پر توجہ نہیں. مولانا عبداللہ انصاری کے الفاظ میں:

حواشی وشروح کا نقصان

اسی وجہ سے پیشتر کے زمانے میں **شرح ملا** پڑھنے والا نصف عالم گنا جاتا تھا اور اب **شرح ملّا** کے پڑھنے والے بھی طالب علم ہونے کے بھی مصداق مشکل سے ہوتے ہیں الا ماشاءاللہ. پس اس وقت کے کتب درسیہ کی صحت اور صفائی اور اعلیٰ درجے کے محشی ہونے نے طلبہ کو مطالعے کی محنت سے بے فکر کردیا اور اس وقت کے علماء ہیں کہ بوجہ کثرت مدارس اپنے تعلق کی شکل بنی رہنے کی وجہ سے طلبہ کے خوشامدی بن گئے، یعنی پڑھیں یا نہ پڑھیں لیکن پڑے رہیں کہ مدرسے کا ڈھنگ بنا رہے تاکہ چندہ مقررہ آتا رہے. پیشتر طلبہ کو مرض ثم خیراً کا باعتبار سبق کے لاحق ہوتا تھا وہ مرض مبارک تھا، اور اب باعتبار طبق کے لاحق ہوتا ہے اور یہ مرض نامبارک ہے. اکثر طلبہ کو اس وقت میں روٹی کپڑا اور دیگر حوائج اہل شہر کی سخاوت کے صدقے مہتممین کی دریوزہ گری کی بدولت گھر سے زیادہ میسر آنے لگے. پس اس اطمینان کی حالت میں آیا ہوا شوق بھی دل سے جاتا رہا. چنانچہ بہت سے طلبہ جو اطراف وجوانب سے آتے ہیں ان میں یہ مشاہدہ ہو چکا ہے کہ جب اپنے گھر سے آئے تو محنتی اور شوقین تھے اور بعد تقرر سبق وطبق ایسی بے فکری سے سوتے ہیں کہ جیسے کوئی سوداگر گھوڑے بیچ کر سوتا ہے. **اَللّٰھُمَّ ارْحَمْنَا وَامْلَأْ قُلُوْبَنَا بِشَوْقِ العُلُومِ الْبَاقِیَہ وَلَا تَشْغلنا بِلَذَائِذِ الفَانِیہ. اٰمین ثم اٰمین.**

مولانا عبداللہ انصاری کا یہ خیال بعد میں بالکل درست ثابت ہوا کہ مدرسوں کی تعداد میں جس قدر اضافہ ہوگا ان کی افادیت کم ہوتی جائے گی. ان سے ناکارہ، بے شعور اور بے لیاقت طلبہ نکلیں گے جو ملت کے لئے بے فائدہ ہوں گے. سو سال سے زیادہ ہوگئے صورت حال میں ادنیٰ فرق جو آیا ہو آج بھی یہی ہو رہا ہے.

کثرت مدارس کے اسباب

اس کا ایک بدیہی سبب ہے کہ انگریزی استعمار سے پہلے علماء دین معاشرہ میں عزت مند تھے اور حکومت میں بڑے چھوٹے عہدوں پر فائز ہوتے تھے. گورا شاہی میں دانستہ ان کا یہ امتیاز ختم کر دیا گیا تھا. معاش کے یہ دروازے بند ہو جانے کے بعد وہ مسجدوں میں موذن اور امام بن کر اپنے بال بچوں کا پیٹ پال سکتے تھے. ان کی سادہ زندگیاں عیش و عشرت سے بیگانہ تھیں. انہیں وہ مال ومتاع مطلوب ہی نہ تھا جو اہل دنیا کی حویلیوں کے دروازوں سے دیوان خانوں اور خوابگاہوں تک بکھرا ہوا تھا. ان کے فکری رہنماؤں نے ۱۸۵۷ء کے بعد انہیں ایک راستہ دکھادیا تھا. سوانہوں نے ملک میں نگر نگر تعلیم کو عام کرنے کا بیڑا اٹھایا. اور یوں ہر شہر اور قصبہ میں لاتعداد مکاتب اور مدارس قائم ہو گئے. یہ کوئی برا کام نہیں تھا اور غیر منظم ہی سہی، اس مہم کے مفید نتائج کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا.

مگر یہ بھی درست ہے کہ اس سے علمی معیار متاثر ہوا تھا بالکل اسی طرح جیسے آج گلی گلی کھلے ہوئے مغربی طرز کے سکولوں میں تعلیم کا معیار پست ہے. لیکن یہ بھی پیش نظر رہے کہ نہ ہر مدرسہ دار العلوم دیوبند اور جامعہ ازہر ہوتا ہے، نہ ہر یونیورسٹی ہارورڈ اور سوربون ہوتی ہے، نہ ہر طالبعلم اشرف علی تھانوی اور مناظر احسن گیلانی ہوتا ہے اور نہ ہر سٹوڈنٹ خلیق احمد نظامی اور عبید الرحمان صدیقی ہوتا ہے. تاہم ہر نظام میں بہتری اور معیار کو بلند تر کرنے کی ضرورت رہتی ہے تا کہ اس کے عمدہ نتائج نکلیں.

اہل شعور کی ترجمانی

مولانا عبداللہ انصاری نے مدارس کے سلسلہ میں جو چند باتیں یا اصول وقواعد مرتب کئے تھے اس سے ان کے فکر کی گہرائی، دور بیں نظر اور وسیع ذہنی افق کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان مسائل کا آج بھی تقریباً وہی حل ہے جو مولانا عبداللہ انصاری نے سو سال پہلے تجویز کیا تھا. کاش اس پر عمل ہوا ہوتا تو مدارس کی شان ہی اور ہوتی، ان سے ویسے ہی افراد تیار ہو کر نکلتے جس کی زمانہ کو ضرورت ہے.

مجلس ندوۃ العلماء کے دوسرے اجلاس میں مولانا عبداللہ انصاری کی اس تقریر کا ملک میں پر جوش استقبال ہوا. اہل نظر نے اسے اپنے دل کی آواز اور اپنے خیالات کی ترجمانی سمجھا. اہل شعور نے اسے ایک ثمر بار مستقبل کی نوید جانا. نواب محسن الملک نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں اس تقریر کے اقتباسات پیش کئے اور مولانا عبداللہ انصاری کی اس تقریر کی تائید وتحسین کرتے ہوئے کہا:

محسن الملک کی تائید

جناب مولوی عبداللہ صاحب انصاری نے اپنی قوم کی حالت کی جو تصویر کھینچی ہے وہ دیکھنے کے لائق ہے. ہم میں سے کون ایسا ہے. جس نے قوم کی حالت پر اس بزرگ دیندار سے زیادہ توجہ کی ہو یا اس پرہیز گار فاضل سے بڑھ کر مسلمانوں کی ڈراونی تصویر کھینچی ہو. وہ فرماتے ہیں کہ " اس وقت جو ہم اپنی تعلیمی اور اخلاقی حالت دیکھتے ہیں تو اس میں انتہا درجہ کی ابتری پاتے ہیں اور اس پر آفت تو یہ ہے کہ ہماری تقدیر نے ایسا قضیہ منعکس کر دیا کہ ہم لوگ بلا کو بھی بلا نہیں سمجھتے بلکہ بلا کو عطا، درد کو دوا، زحمت کو رحمت، قمت کو نعمت، تلون کو استقامت، ذلت کو عزت، قساوت کو اخوت، نفسانیت وتعصب کو حمایت دین وملت سمجھنے لگے. بھلا وہ مریض کیونکر صحت پا سکتا ہے کہ اپنے آپ کو مریض ہی نہ سمجھے. سب سے بڑھ کر انسان کے پیچھے یہ روگ ہے کہ باوجود بیمار ہونے کے پھر آپ کو تندرست سمجھے. جس قوم پر شامت اعمال کا وبال اور انقلاب کی بلا اور عام تباہی کی وبا آنے والی ہوتی ہے تو پہلے ہی سے اُس قوم کی عقل الٹی ہو جاتی ہے. شناعت دنائت پذیر طبائع ہو جاتے ہیں. چنانچہ فی زمانا نعوذ باللہ اپنی یہی حالت ہے." اس کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ " خوبی قسمت سے اتفاقی کاموں میں بھی نفسانیت کو دخل دیا جا رہا ہے. وہ یہ کہ تھوڑی سی مسافت کے درمیان میں بہت سے مدارس جاری کر رکھے ہیں. یہ نہیں کہ باتفاق رائے انہیں مدارس کو جہات اربعہ میں ایک مناسب مسافت پر مقرر کرتے کہ جس سے عظیم الشان نفع پہنچتا. سب سے بڑھ کر یہ ابتری ہے کہ بعض بعض شہروں بلکہ بعض بعض قصبوں میں بلا ضرورت کئی کئی مدرسے ہیں اور ہر مدرسے کے مدرس و مہتمم

اپنے ہی مدرسے کی ترقی کے خواہاں ہیں، حتیٰ کہ بعض حضرات اس درجہ اپنے مدرسے کی خیر خواہی میں منہمک ہو جاتے ہیں کہ دوسرے مدارس کے تنزل بلکہ تخریب کے درپے ہو جاتے ہیں، جیسا کہ یہ امر آج کل مشاہد ہو رہا ہے۔ (۵)

حواشی

۱- صدیقی، مولانا عبدالوحید۔ **حیات ظہور**، ص ۷۵۵، فتح پور ۱۹۹۴ء۔

۲- محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس۔ اقتباس تقریر محسن الملک (ریزولیوشن اور تائید ندوۃ العلما)۔ اجلاس نہم منعقدہ علی گڑھ، دسمبر ۱۸۹۴ء، مطبوعہ مفید عام آگرہ: ۱۸۹۵ء

۳- جلیس، محمد الحق۔ **تاریخ ندوۃ العلماء** ۱:۱۰۷ لکھنؤ ۱۴۰۳ھ۔

۴- ندوۃ العلماء۔ روداد اجلاس دوم منعقدہ لکھنؤ ص ۶-۷۔ مطبع انتظامی۔ کانپور۔

۵- محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس۔ روداد اجلاس نہم منعقدہ علی گڑھ، ص ۴۰-۴۱۔

باب : ۹

ملی تحریکات

مولانا عبداللہ انصاری کو خاندانی اور روحانی سلسلے میں ایسے افراد سے نسبت خاص حاصل تھی جو فرنگی حکومت کے مخالف تھے اور فدائیان حریت کے اس جانباز دستہ میں شامل تھے جو ۱۸۵۷ء میں شاملی اور تھانہ بھون میں ایک پُر جوش منظم جنگ کی قیادت کر چکا تھا. مولانا عبداللہ انصاری کو یہ جذبہ اور آزادی کی تڑپ ورثہ میں ملی تھی. بے شک ذاتی حیثیت میں یہ رنگ ایسا گہرا اور پختہ تھا کہ سرسید کی طویل رفاقت اور ایم. اے. او. کالج میں تقریباً تہائی صدی گزارنے کے بعد بھی اس میں کوئی کمزوری نہیں آئی تھی، لیکن علی گڑھ کالج بہر حال ایک سرکاری ادارہ تھا جسے سرکار انگریزی کی تائید حمایت حاصل ہو. اس لئے مولانا عبداللہ انصاری کے دل میں موجود آزادی کا خاندانی اور ملی جذبہ احتیاط کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا.

علاوہ ازیں علی گڑھ کی مصروفیات اور دوسرے قومی مشاغل کی وجہ سے کالج سے باہر ملک کی عملی سیاست میں وہ سرگرم حصہ نہیں لے سکتے تھے، پھر بھی امکانی حد تک وہ آزادی وطن کی سیاسی تحریکات کی حمایت اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہے. برطانوی راج کی سطح پر ایسی سرگرمیوں میں مشغول لوگوں کو ''جرائم پیشہ'' کہا جاتا تھا.

اہل مغرب کے اساطین و اکابر کو اہانت اور شتم کرنے میں ید طولیٰ حاصل ہے. ان سے ذرا اختلاف کیجئے اور پھر دیکھئے انداز شر اندازئ گفتار. کسی زمانہ میں اردو میں ایک لفظ تھا ''ٹھگ'' جس کے معنی چور، دغاباز، راہزن ہوتا تھا اور ایسے لٹیروں کے پیشہ ور گروہ بھی ہوتے تھے. انگریز حکمرانوں نے آزادی کے سپاہی ہندستانیوں کے لئے انگریزی میں یہ لفظ ٹھگ رائج کر دیا. جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کو ''غدر'' - غداری - کا نام دیا. خود سرسید نے بھی اسے بغاوت ہی قرار دیا تھا، جذبہ حریت کا غیر منظم اظہار نہیں تو ثابت ہوا کہ آزادی کی

جد جہد جرم اور معاشرتی فساد تھی۔ چنانچہ ایسی حرکتوں سے باخبر رہنے کے لئے پولس میں ایک خفیہ محکمہ قائم ہوا جس کا نام کریمنل انویسٹگیشن ڈپارٹمنٹ یا سی۔آئی۔ڈی۔(Criminal Investigation Department - CID) مجرمانہ سرگرمیوں کی تفتیش کا شعبہ۔

مجرموں کے دفتر کی کارگزاری

مجرموں کی تفتیش کے اسی خفیہ شعبہ CID کی اطلاع ہے کہ مولانا عبداللہ انصاری نے ۱۹۱۳ء میں برطانوی مال کے مقاطعہ (boycott) کے فتویٰ پر دستخط کئے تھے مگر بعد میں ایک بیان کے ذریعہ یہ حمایت واپس لے لی تھی۔

یہ بیان مولانا سید محمد میاں نے ریشمی رومال تحریک پر ایک غیر مستند کتاب میں نقل کیا ہے۔ اگر چہ مولانا سید محمد میاں تاریخی حقائق سے باخبر تھے لیکن ان کی یہ کتاب بنیادی طور پر انگریز سرکار کے نقطۂ نظر پر مبنی ہے اسی لئے علمی دنیا میں یہ کتاب مستند نہیں سمجھی گئی۔

اس کے علاوہ بھی یہ سرکاری بیان اصولی طور سے قابل اعتبار نہیں ہے کیونکہ برطانوی خفیہ پولس کے بیانات یکطرفہ اور اکثر غیر مصدقہ ہوتے تھے اور عموماً ایسے ایجنٹوں کی فراہم کی ہوئی خبروں پر مشتمل ہوتے جن کو کسی خاص شخص سے کوئی پرخاش ہوتی تھی۔ کالج میں ایسے چند افراد تھے جو مولانا عبداللہ انصاری کو شعبہ دینیات سے برطرف کرنا چاہتے تھے۔ ان میں سے کوئی یا ان کا کوئی کارندہ خفیہ پولس کا مخبر ہوسکتا تھا مخبری کی یہ لعنت جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد شروع ہوئی تھی جب ''کالے مخبر'' سیکڑوں ہزاروں ہندستانیوں کی موت کا سبب بن گئے تھے۔ اول تو مولانا عبداللہ انصاری مفتی نہیں تھے کہ کسی مسئلہ پر خود فتویٰ دیں یا انہیں کسی اور مفتی کے فتوے کی تصدیق و تائید کا اختیار ہو۔ البتہ قومی اہمیت کے کسی معاملہ میں رائے رکھنے اور اس کے اظہار کا حق انہیں ضرور تھا مگر اس پر قدغن تھی۔ لہٰذا خفیہ پولس کی رپورٹ کے اس جزو کو درست مان بھی لیا جائے کہ مولانا عبداللہ انصاری نے ''فتویٰ'' واپس لے لیا تھا تو بظاہر اس کا سبب کالج کے ذمہ داروں پر سرکاری دباؤ اور نتیجتاً ذمہ داروں کا مولانا عبداللہ انصاری سے رجوع کے لئے اصرار ہی ہوسکتا تھا۔ چنانچہ اس لحاظ سے برطانوی خفیہ پولس کی یہ

رپورٹ خود برطانوی حکومت ہند کی مجرمانہ سرگرمیوں کو بےنقاب کرتی ہے۔

ہندستان کی مکمل آزادی کی اولین تحریک کا منصوبہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے بنایا تھا۔ یہ تحریک شاملی کے محاذ ۱۸۵۷ء کا دوسرا دور تھی۔ اور اسے زیادہ بڑے پیمانہ پر برپا کرنا مقصود تھا۔ اس تحریک کے ماتحت شیخ الہند کے شاگرد اور مخلصین ترکی اور افغانستان کے سیاسی تعاون سے ہندستان پر مسلط انگریز حکومت کے خلاف فوجی اقدام کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لئے قبائل آزاد، افغانستان، ترکانیہ کے عوام کے نام عثمانی سلطان ترکیہ کا ایک پیغام جہاد ریشمی رومالوں پر نظر نہ آنے والی روشنائی سے لکھا گیا تھا جس بنا پر یہ جدو جہد ریشمی رومال تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔ ہندستان کی تاریخ آزادی میں اس تحریک اور اس کے تمام قائدین کا تذکرہ بالکل نہیں کیا جاتا۔ پاکستان میں بھی اس تحریک کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا کیونکہ یہ پورے ہندستان کی آزادی کا احاطہ کرتی تھی، فقط شمال مغربی ہندستان کے محدود علاقوں کے مسلمانوں کی محدود آزادی کا نہیں۔

ریشمی رومال تحریک

ریشمی رومال تحریک میں جنود ربانیہ کے نام سے ہندستان کی آزادی کے لئے ایک لشکر جرار کھڑا کیا گیا تھا۔ اس لشکر کے قائدین نے میجر جنرل کے عہدہ کے لئے تین نام منتخب کیے تھے ان میں تیسرا نام مولانا عبداللہ انصاری کا تھا۔

کچھ اپنوں اور کچھ غیروں نے آزادی کی اس تحریک کے راز برطانوی حکام کے حوالے کردئے جس کی وجہ سے وہ تحریک برپا ہی نہ ہوسکی۔ تاہم سپاہ آزادی میں ایک اہم عہدہ پر مولانا عبداللہ انصاری کے تقرر سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شیخ الہند سے کتنے قریب، اس تحریک کے فکری محاذ پر کس قدر متحرک، اور اس کے کارکنوں کی نظر میں کتنے با اعتماد تھے۔

مکہ کا شریف حسین عثمانی ترکوں کا پروردہ اور سلطنت عثمانیہ کی طرف سے مکہ کا حاکم مقرر تھا۔ اسے برطانوی ایجنٹ ٹی۔ ای۔ لارنس نے بےمول خرید لیا تھا۔ اس نے شیخ الہند کو گرفتار کر کے انہیں اور ان کے چند جاں نثار رفقاء کو انگریزوں کے حوالہ کردیا تھا۔ بعد

میں دوسرے کارکنوں پر بھی مختلف صورتوں میں عتاب ہوا. بعد میں وہ سب لوگ جو شیخ الہند کے معاون ورفیق تھے حکومت کی نظر میں مجرم قرار پائے اوران کے مختصر احوال وکوائف سے واقفیت اوران پر نظر رکھنے کے لئے برطانوی حکومت کی جانب سے افسروں کے لئے خفیہ تعارفی کتابچہ شائع ہوا تھا جس میں مولانا عبداللہ انصاری کا تذکرہ بھی تھا:

> ایم.عبداللہ انصاری. ضلع سہارنپور، صوبہ جات متحدہ. کا باشندہ ہے. ایم.اے.او.کالج میں وہ ناظم دینیات رہا ہے. اس کی طرف ۱۹۱۳ء میں توجہ ہوئی جب کہ اس نے یورپین مال کے بائیکاٹ کے فضل الحسن حسرت موہانی کے فتویٰ (کذا) پر دستخط کئے. بعد میں اخبارات کو ایک خط کے ذریعے اس نے فتویٰ کی حمایت واپس لے لی. جنود ربانیہ کی فہرست میں وہ میجر جنرل ہے.(۱)

مولانا کے انقلابی خیالات اور آزادی کی جدوجہد سے سب واقف تھے. انہوں نے حسرت موہانی علیگ کی مہم سے اپنا نام واپس لیا تو اس لئے نہیں کہ وہ اصولی طور پر حسرت موہانی کی تحریک کے مخالف تھے بلکہ اس لئے کہ وہ سرسید کے قائم کردہ کالج میں ناظمِ دینیات تھے اور اس کالج کو پہلے دن سے برطانوی حکومت کی سرپرستی اور تعاون حاصل تھا. مولانا عبداللہ انصاری خالص مادی تعلیم کے ماحول میں مسلمان بچوں کے اندر دینی شعور کی ترویج کے لئے وہاں آئے تھے. کالج کی انتظامیہ ان کے فیصلہ سے مطمئن ہوگئی تھی. عملی سیاست سے تو ان کا تعلق تھا ہی نہیں. لیکن تحریک ریشمی رومال سے ذہنی وابستگی کی بنیاد پر یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے کالج کے طلبہ میں ملک کی آزادی کا احساس اور جذبہ ضرور پیدا کیا ہوگا. چونکہ وہ عملی سیاست سے کنارہ کش تھے اس لئے اس بات کا چرچا نہیں ہوا.

حاشیہ

۱- میاں، سید محمد. **تحریک شیخ الہند** سی آئی ڈی رپورٹ ترجمہ رفیق عزیز بیگ. دہلی. ۱۳۹۵ھ.

باب : ۱۰

تالیفات اور تحریریں

مولانا عبداللہ انصاری کو تصنیف و تالیف کا فطری ذوق تھا. زمانہ طالب علمی ہی سے ان کی تحریروں میں فکر کا عنصر نمایاں تھا اور تجزیہ کاری مؤثر تھی. اس خوبی کا ایک عمدہ مظاہرہ علم تفسیر میں ان کے اس مقالہ میں ہوتا ہے جو ایک امتحانی سوال کے جواب میں انہوں نے تحریر کیا تھا تحریر و تقریر کی یہ خوبیاں وہ اپنے ذی استعداد شاگردوں میں بھی منتقل کرتے تھے. جس کا ایک مظاہرہ افغانستان کے امیر حبیب اللہ خان کے دورہ علی گڑھ کے دوران ہوا تھا.

علی گڑھ آنے سے پہلے ان کی خواہش تھی کہ **مثنوی مولانا روم** کا نسخۂ حاجی امداداللہ شائع کریں. یہ خواہش پوری نہ ہو سکی. ان کی دوسری تحریری کاوش **بکٹ کھانی** یا **درد نہانی** یا **بارہ ماسہ** ہے. جس کی تالیف کی ابتداء علی گڑھ آنے سے دو سال پہلے ۱۳۰۹ھ (۱۸۹۱ء) میں ہو گئی تھی. علی گڑھ میں قیام کے دوران ان کے ذوق تحریر نے ترقی کی اور ان کے قلم سے کئی کتابوں کے ترجمے اور مؤلفات وقفہ وقفہ سے شائع ہوتی رہیں.

مولانا عبداللہ انصاری کی وہ تمام تصانیف و مولفات اور ترجمے جو دستیاب ہیں ان کا کسی قدر تعارف آئندہ سطور میں آرہا ہے. اس وقت تک ان کی کل سات کتابوں کا علم ہوا ہے جو حسب ذیل ہیں:

۱- **اَجوِبۂ اربعین** - مولانا محمد قاسم نانوتوی کے شریک تصنیف

۲- **آغاز اسلام** - سیرت مبارک پر تالیف

۳- **عقائد اسلامیہ** - اردو ترجمہ تالیف شیخ طاہر بن صالح الجزائری

۴- **ارکان اسلام** - اسلامی دینیات پر فقہ کی کتاب

۵- **سعادۃ المریدین** - تصوف و سلوک میں

۶- **رھنمائے تصوف**

۷- **بکٹ کھانی = درد نھانی عرف بارہ ماسہ ربانی**

اَجوِ بہ اَربعین

مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی کی تالیفات میں پہلی علمی یادگار حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی تالیف لطیف **اَجـوِبۂ اربعین** میں شرکت ہے۔[1] اس میں دو نکتے ہیں. ایک تو یہ بجائے خود بڑی سعادت کی بات تھی کہ ایک نوجوان کی حیثیت سے وہ مولانا نانا توی جیسے عبقری بزرگ اور مفکر عالم کے شریک تصنیف ہوئے، اور دوسرے یہ مولانا عبداللہ انصاری کی علمی استعداد پر مولانا نانوتوی کے مکمل اعتماد کا اظہار تھا.

یہاں جملۂ معترضہ کے طور پر **نزهة الخواطر** میں مولانا عبدالحی حسنی سے غلط طور پر منسوب ایک قول پر توجہ جاتی ہے کہ وہ ''کم علم شخص'' تھے. وہاں مولانا عبداللہ الانصاری انبہٹوی (۸:۱۲۹۱) پر اجمالی شذرہ کی آخری عبارت ہے:

> **. . . وولی خطابة والموعظة فی مدرسة العلوم بعلیگڑه لانتسابه الی الشیخ قاسم المذکور سنة احدی عشر و ثلاث مئة والف. و هو قلیل الخبره بالعلوم مع صلاح فی الطریقة الظاهریه.**
>
> **مات فی نحو اربع و اربعین و ثلاث مئة و الف فی "بومبائی".**

نزهة الخواطر شمار ۲۹۷ - ۸:۱۲۹۱

مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں خطابت اور موعظۃ پر سنہ ایک ہزار تین سو گیارہ میں مقرر ہوئے تھے بوجہ مذکورہ شیخ (محمد) قاسم (نانوتوی) سے اپنی نسبت کے. کم علم آدمی تھے اور طریقہ ظاہریہ میں صلاحیت تھی.

انتقال ایک ہزار تین سو چوالیس کے آس پاس بمبئی میں ہوا.

یہ عبارت مولانا سید عبدالحی حسنی کی نہیں ہے جن کا انتقال مولانا عبداللہ انصاری

کے انتقال سے تین سال پہلے ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۳ء میں ہو چکا تھا. چنانچہ اس الحاقی عبارت کا لکھنے والا یا تو حقیقت سے بے خبر تھا یا اس نے دو شخصیتوں - مولانا عبداللہ الانصاری انبہٹوی اور مولوی عبداللہ احمد حیٰ - کو ایک سمجھنے کی غلطی کی جیسا کہ تفصیل آگے بیان آئے گی.

نزهة الخواطر کی جلد ہشتم میں عبداللہ نام کے ۱۷/ اندراجات صفحات ۱۲۹۱ سے ۱۲۹۸ تک ہیں. ان میں مولوی عبداللہ احمد حیٰ کا ذکر نہیں ہے اور اس لئے نہیں ہے کہ ان مذکور مولوی عبداللہ احمد حیٰ کا انتقال مولانا عبدالحی حسنی کے انتقال کے بعد ہوا تھا. یہاں اس سے بحث نہیں کہ مولوی عبداللہ احمد حیٰ مرحوم کا علمی درجہ کیا تھا، بلکہ فقط یہ ظاہر کرنا ہے کہ جس نے بھی **نزهة الخواطر** میں اضافی عبارت سازی کی ہے وہ مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی کے علمی مقام سے ناواقف تھا جن کی علمیت پر مولانا محمد قاسم نانوتوی کو ان کے زمانہ طالب علمی ہی سے اعتماد تھا. عبارت سازی ہی کا شاخسانہ ہے کہ ندوۃ العلماء کے بانی کی حیثیت سے مولانا محمد علی مونگیری (۱۲۶۲-۱۳۴۶ھ/۱۸۴۶-۱۹۲۷ء) کا ذکر (**نزهة الخواطر** شذرہ ۴۷۱ - ۸: ۱۳۶۸-۱۳۷۰) حالانکہ ان کا انتقال مولانا عبدالحی حسنی کے انتقال کے چار سال بعد ہوا تھا؛ اور ذیلی حیثیت سے (**نزهة الخواطر** شذرہ ۱۹۰ - ۸: ۱۲۵۵) مولانا ظہور الاسلام فتحپوری (م: ۱۳۲۹ھ/ ۱۹۱۱ء) اور مولانا شبلی نعمانی (م: ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء(کا ذکر (**نزهة الخواطر** شذرہ ۱۶۷- ۸: ۱۲۴۱) پایا جاتا ہے. تاہم عبارت ساز نے تحریک ندوۃ العلماء میں مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی کی علمی وفکری مساہمت اور ہمکاری کا ذکر نہیں کیا ہے خواہ کسی عناد کی وجہ سے یا کسی انجانے خوف کی بنا پر. واللہ اعلم. **اللهم احفظنا من شرور انفسنا.**

آغاز اسلام

مولانا عبداللہ انصاری کی تالیفات میں سب سے بڑی طبع زاد تالیف سیرۃ نبوی پر **آغاز اسلام** ہے جس میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے وفات شریفہ تک کے تمام حالات اختصار اور جامعیت کے ساتھ موثر عبارت میں لکھے ہیں. کتاب کا پہلا عنوان یا باب **پیدائش آنحضرت صلی الله علیه وسلم** ہے

جس کا آغاز اس طرح ہوا ہے:

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت کسریٰ کے سنہ ۴۰ میں تولد فرمایا.
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے باپ کا نام عبداللہ اور دادا کا نام عبدالمطلب تھا اور والدہ شریفہ کا نام آمنہ تھا جو وہب بن مناف کی بیٹی تھیں. اور حلیمہ سعدیہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دودھ پلایا. وہ حضرت کی رضاعی ماں تھیں. جس وقت دو مہینے کے ہوئے آپ کے والد عبداللہ کا انتقال ہوگیا اور آپ کے دادا عبدالمطلب واقعہ فیل سے آٹھ برس بعد وفات پاگئے. آپ کی عمر اس وقت سات برس کی تھی. (۲)

مختصر اور جامع اسلوب میں تمام واقعات ترتیب وار نقل اور بیان کرتے چلے گئے ہیں کہ پڑھنے والے کو تکلف اور الجھاؤ محسوس نہیں ہوتا. سیرت مبارکہ کے تمام احوال ۶۳ صفحات میں پورے ہوگئے ہیں. اس کے بعد خصال حمیدہ کا ذکر آیا ہے اور چند جوامع الکلم کے ترجمہ پر کتاب ختم ہوگئی ہے. مگر تعجب ہے کہ مصنف نے آغاز کتاب سے اختتام تک کہیں اپنا نام نہیں لکھا. کتاب میں تمہید ہے، نہ اختتامی کلمات، نہ حرف ناشر نہ خاتمہ الطبع. صرف سرورق پر مصنف کا نام لکھا ہوا ہے. جس کے الفاظ یہ ہیں:

مؤلفہ

جناب مولوی ابومحمد عبداللہ صاحب انصاری

ناظم محکمہ دینیات مدرسۃ العلوم علی گڑھ

جس کو خاکسار محمد عبدالاحد نے بماہ شعبان المعظم ۱۳۲۶ھ (ستمبر ۱۹۰۸ء) اپنے مطبع مجتبائی دہلی میں طبع کیا.

یہ کتاب علی گڑھ کالج کے دینیات کے نصاب میں بھی شامل تھی.

یہاں یہ ذکر کردینا چاہیے کہ **آغاز اسلام** کے نام سے اس کے بعد کئی کتابیں چھپیں، جس میں سے دو علامہ شبلی کی تالیف **بدء الاسلام** کا ترجمہ ہیں. ان میں سے ایک ترجمہ میمو شاہ سلطان بانو نے کیا تھا جو ڈاکٹر ظفر الاسلام کی اطلاع کے مطابق ۱۳۴۳ھ (۱۹۲۴ء) میں رحمانی پریس دہلی سے چھپا تھا.

ارکان اسلام

اسلام کے ابتدائی اور بنیادی پانچوں ارکان کا سادہ عام فہم زبان میں تعارف ہے مطبع مجتبائی دہلی کی فہرست کتب برائے ۱۹۰۵ء میں اس کا اندراج ہے۔ (۳)

عقائد اسلامیہ

مولانا عبداللہ انصاری اور ان کے عہد کے ان کے علمی رفقاء خصوصاً چند خاندانی عزیزوں نے جو ایم۔اے۔او۔ کالج میں استاد یا ملازم تھے عربی کے ممتاز مصنفین کی تازہ اور عمدہ کتابوں کے اردو ترجموں کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ مولانا عبداللہ انصاری نے جن کتابوں کے ترجمے کئے اس میں اس دور کے نامور مفکر علامہ طاہر بن محمد صالح الجزائری (م:۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء) کی کتاب **الجواهر الكلاميه فى العقائد الاسلاميه** کا ترجمہ بھی شامل ہے، یہ ترجمہ **عقائد اسلامیه** کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس کتاب کا کوئی نسخہ نہیں مل سکا، لیکن مولانا عبداللہ انصاری کی مشہور تالیف، **بکٹ کهانی یا باره ماسه ربانی** کے آخر میں ان کی چند مطبوعہ کتابوں کا نام اور تعارف درج کیا گیا ہے۔ جس میں **عقائد اسلامیه** کا نام بھی شامل ہے۔

سعادۃ المریدین

یہ تالیف حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی اور مشائخ سلوک کے اقوال وارشادات کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب کا اشتہار **بکٹ کهانی** کے اختتام پر درج ہے۔

رہنمائے تصوف

مولانا عبداللہ انصاری کی تین متصوفانہ منظومات کے ایک مجموعہ کا نام ہے۔ جس میں **فریاد فراق ناله عشاق، صدائے دل پذیر درد مند فقیر** اور **طوطی نامه فقیری دمامه** شامل ہیں۔

ان تینوں منظومات میں دل شاعر کے دردو سوز کا اظہار ہے اور یہ نظمیں راہِ خدا کا

شوق پیدا کرتی ہیں. تینوں کا یہی ایک مضمون ہے مگر انداز مختلف ہے.

فریاد فراق نالہ عشاق میں ضمنی عنوانات بھی ہیں. دوسری نظمیں اس سے خالی ہیں. دونوں منظومات میں مضمون کی یکسانیت کے علاوہ شعریت بھی کم ہے، تاہم دل کی کسک محسوس ہوتی ہے. آخری نظم **طوطی نامہ فقیری دمامہ** کا مقصود تو اگر چہ یہی عشق ربانی اور صدائے دل کی نغمہ سنجی ہے لیکن اس کا اسلوب بیان پہلی نظموں سے مختلف ہے. یہ مجموعہ **رہنمائے تصوف** ۱۳۴۱ (۱۹۲۲ء) میں مطبع یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ سے شائع ہوا تھا.

بکٹ کہانی: درد نہانی یا بارہ ماسہ ربانی

بکٹ کہانی عرف درد نہانی یا بارہ ماسہ ربانی ہندستان کی اور اردو ہندی شاعری کی ایک صنف ہے. جس میں محبت اور فراق کا پرکشش اور دل آویز اظہار غم ہوتا ہے اور جس میں دل کی کہانی، برہن کی بپتا، جدائی کا درد اور ملاقات و وصال کی توقع ایسی کرب آمیز اور دل گداز لے میں بیان ہوتی ہے کہ پڑھنے والوں کی کیفیت بھی دگرگوں ہو جاتی ہے.

ادبیات مغرب کے حملہ سے متاثر اردو منے بہت کچھ کھویا. اسی میں بارہ ماسہ کی صنف بھی ہے. اس متروک صنفِ شاعری میں فراق و ہجر کا قصہ مہینوں اور موسموں کے ساتھ رنگ بدلتا ہے اور موسمی کیفیات کا علم اور بیان میں مہارت چاہتا ہے. کہانی کی پوری روداد عورت کی زبان سے ادا ہوتی ہے. **بکٹ کہانی** بھی اسی اسلوب میں شروع ہوتی ہے:

لگا پھر میں بھی لکھنے ایک کہانی زباں رکھی وہی سادی زنانی

یہ بیان ہندی مہینوں کی ترتیب پر آگے بڑھتا ہے اور جیسے جیسے رُت بدلتی ہے ویسے ویسے جدائی کی کڑھن میں اضافہ اور فراق کا زخم ہرا ہوتا رہتا ہے

بکٹ کہانی ہندی سال کے بارہ مہینوں کے سفر سے گذرتی ہوئی اختتام تک پہنچتی ہے، جو لمحہ وصال ہوتا ہے. ماہ بھادوں کے احوال سے متعلق چند اشعار کی غمنا کی اور اثر انگیزی ملاحظہ کیجیے:

گھٹا غم کی امنڈ چھاتی سے آئی | مری آنکھوں نے برکھا ہے لگائی
بھرے ہیں ہر طرف بھادوں نے جل تھل | مگر میں خشک لب ہوں اور بیکل
سکھی ری جبکہ بادل آ کے کڑکے | تو پہروں دل مرا بے طور دھڑکے
کڑک سُن سُن کے تھر تھر کانپتی ہوں | تجن کو ہر طرف میں جھانکتی ہوں
بھلا کیسے یہ رُت کاٹوں اکیلی | مری تو جان اس پپّا نے لے لی

بکٹ کہانی میں ہندی شاعری کی روایت کے مطابق محبت کا اظہار اور دل کی کہانی چونکہ عورت کی زبان سے ادا ہوتی ہے اس لئے اس میں دردوسوز کے علاوہ ایک خاص قسم کی حلاوت بھی ہے. جو بکٹ کہانیاں اب تک دریافت ہوئی ہیں ان میں سے کئی کا مقصد معرفت کا سبق، دل عاشق کے سوز، اندرونی تڑپ اور اس بے چینی کا اظہار ہے جس کا الفاظ میں تذکرہ آسان نہیں ہے. اس لئے ان کی دل کشی کچھ سوا ہو گئی ہے.

درد نہانی کا موضوع تزکیۂ نفس اور حصول معرفت ہے. شاعر نے جاندار اسلوب اور مربوط پیرائے میں سلوک و معرفت، انکشاف حق اور اصلاح باطن کا راستہ کا دکھایا ہے اور عشق الٰہی کو عشق مجازی کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا ہے. جویان معرفت باطنی مفہوم پر نظر رکھتے ہیں اور سادہ دل ظاہری الفاظ سے لطف لیتے ہیں.[۴] اس کی باطنی معنویت اور عرفان و آگہی کی حقیقت کا کچھ اندازہ ذیل کے دعائیہ اشعار سے ہو سکتا ہے:

کہیں مٹ جائے یہ دل کی سیاہی | منور ہو میرا باطن الٰہی
غذائے معنوی کا نوش مل جائے | سماعِ باطنی کا گوش کھل جائے
دوئی کے نقش کو دل سے مٹا دے | ہر اک پردے کو آنکھوں سے ہٹا دے
یہی معراج ہے میری الٰہی | مشرف کردے وحدت سے کماہی
شہا اصلی مرا مطلب یہی ہے | سوا تیرے مٹے دل سے ہر ایک شے

علمائے ادب نے حسن کلام اور تاثیر کلام ہی کو کسی ادب پارے کا اصل جوہر قرار

دیا ہے۔ مثنوی **درد نہانی** ، **بارہ ماسہ ربانی** میں یہ دونوں ادبی جوہر پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتے ہیں۔

بارہ ماسہ ربانی کی تالیف ۱۳۰۹ھ میں شروع ہوئی مگر پہلے دو عنوانات کے بعد مضامین کی آمد بند ہوگئی تھی اور ۱۴ برس تک یہ نظم یوں ہی نامکمل پڑی رہی:

رہی چودہ برس تک یہ ادھوری ہوئی سن تیرہ سو تیئس میں پوری

اتنے طویل عرصے تک مسلسل غور خوض اور تحسین و تزئین کرنے کی وجہ سے دردِ نہانی میں تخلیقی شان اور فنی رچاؤ کا پیدا ہونا ایک فطری بات ہے۔ انسانی جذبات میں سب سے زیادہ مؤثر اور طاقتور جذبہ درد اور غم کا جذبہ ہوتا ہے۔ انگریزی شاعر پرسی شیلی کا کہنا ہے:

Our sweetest songs are those that tell of

saddest thoughts.

ہمارے سب سے مدھر نغمے سب سے غمناک جذبات کے ترجمان ہوتے ہیں۔

اس منظومہ کی تکمیل میں شاعر کی ذاتی دلچسپی کے علاوہ ان کے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی پسندیدگی اور دعا و توجہ بھی شامل تھی۔

مولانا عبداللہ انصاری کی **بکٹ کہانی** پہلی بار مطبع احمدی علی گڑھ سے منشی سعید احمد فاروقی تھانوی کے اہتمام سے چھپی تھی۔ سنہ طباعت درج نہیں۔ بکٹ کہانیوں کے سلسلہ کی آخری معلوم یادگار مولانا عبداللہ انصاری کی **بکٹ کہانی** ہے۔

حواشی

۱- نانوتوی، مولانا محمد قاسم۔ **أجوِبۂ اربعین**۔ ۱:۱۰۸۔ مطبع ضیائی۔ میرٹھ۔ ۱۹۲۱ء۔

۲- انصاری، مولانا عبداللہ۔ **آغاز اسلام**۔ ص۲۔ مطبع مجتبائی دہلی۔ ۱۹۰۸ء۔

۳- انصاری، مولانا عبداللہ۔ **ارکان اسلام**۔ فہرست مطبع مجتبائی۔ ص۱۰۔ دہلی۔ ۱۹۰۵ء۔

۴- مولانا عبداللہ انصاری کی مثنوی **بارہ ماسہ** کی فنی خصوصیات اور ادبی محاسن کی وضاحت کے لئے دیکھئے **اردو میں بارہ ماسے کی روایت: مطالعہ و متن**، ڈاکٹر تنویر علوی، ص ۳۸۵۔ دہلی۔ ۱۹۸۸ء۔

باب : ۱۱

ایک اور تنازعہ

جوشخص مزاجاً ستیزہ کار ہوتا ہے اگر وہ ایک کے بعد دوسرے مجادلہ میں پڑتا رہے تو کیا عجب، لیکن طرفہ تماشا یہ ہے کہ آدمی سادہ مزاج ہو مگر اپنے عہد میں جدت افکار کا نمائندہ بھی ہو تو اسے بھی تنازعات سے فرصت نہیں ملتی.

مولانا عبداللہ انصاری کی پوری زندگی میں ستیزہ کاری کی کوئی روایت نہیں ملتی. البتہ ان کے جدت افکار اور تجدید ذہن کی کوششیں ان کی تاریخ میں نمایاں ہیں اور اگر ایسے امور میں ان سے اختلاف رائے ہو تو قابل فہم ہے. لیکن مولانا عبداللہ انصاری کی جدت طرازی قدیم روایات سے بغاوت کا نتیجہ تھی نہ اس کی تحریک. وہ قدیم روایات پر جمی ہوئی گرد کو صاف کرنا چاہتے تھے جس کا اظہار درسیات کے باب میں ان کی تحریروں اور مساعی ہوتا ہے. اس سمت میں وہ پیش رفت نہ ہو سکی جو وہ چاہتے تھے اور اس موضوع پر مباحثہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں.

البتہ مولانا عبداللہ انصاری بعض ایسے تنازعات کا بھی شکار ہوئے جن کا نشانہ ان کے اعتقادات کو بنایا گیا. یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ وہ اس خانوادہ کے ایک فرد تھے جو ہندستان میں احیائے اسلام، احیائے شریعت وسنت اور دینی تعلیمی ترقی کی نمایاں علامت رہا ہے. قدرتی بات تھی کہ وہ انہی اصول ونظریات کے حامی اور پابند ہوں اور اسی طریقہ کار سے وابستہ اور اسی مسلک کے پیرو ہوں جو اُن کے بزرگوں کی اعتقادی پہچان تھا. خاندانی پس منظر کے علاوہ مولانا عبداللہ انصاری کی تعلیم وتربیت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی جیسے بڑے علماء کی نگرانی وسرپرستی میں ہوئی تھی. ظاہر ہے ان بزرگوں کا رنگ اور فکر مولانا عبداللہ انصاری کے دینی نظریات پر چھایا ہوا تھا. اس کی دلیل یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد انہیں سلسلۂ دیوبند کے دو بڑے مدرسوں، منبع العلوم

گلاوٹھی اور مدرسہ تھانہ بھون کا مدرس و منتظم بنایا گیا تھا. اس وقت کوئی بات ایسی نہیں ہوئی تھی جس سے ان کے مذہبی نظریات پر تنقید کی جاتی. مگر جب انہوں نے علی گڑھ کالج کی ملازمت منظور کرلی تو ان کے متعلق سوالات شروع ہو گئے.

دوہری بدگمانی

کچھ لوگوں کی طرف سے دوہری بدگمانی کو راہ دی گئی. اس بدگمانی کو سرسید کے انتقال (۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۸ء) کے بعد بڑی ہوا دی گئی. کہا گیا کہ سرسید کی وفات کے بعد ان کی فاتحہ اور سوئم کی مجلس ہوئی اور یہ بھی کہا گیا کہ مولانا عبداللہ انصاری بھی اس میں شریک ہوئے تھے. اس پر کچھ ہونا تھا تو یہ ہوتا کہ سرسید اور ان کا خاندان تو غیر مقلد تھے اور فاتحہ سوئم وغیرہ کے قائل ہی نہ تھے، تو ان کے واسطے یہ سب کیوں ہوتا. مگر اس تاویل کے بجائے مولانا عبداللہ انصاری کے خلاف آوازیں اٹھنی شروع ہو گئیں یہاں تک کہا گیا کہ ان کے نظریات اپنے استادوں اور ولی اللہی علماء سے مختلف ہیں.

ان باتوں کا ذکر متعدد تحریروں اور رسائل میں بھی آیا. بعض اندراجات سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چند لوگوں نے اس کام کو ایک منصوبہ کے تحت آگے بڑھایا تھا اور شاید اس سلسلہ میں چند اشتہارات وغیرہ بھی چھپے تھے.

تعجب ہے کہ اب تک اس بے بنیاد سازش اور کردار کشی کے کچھ اثرات باقی چلے آ رہے ہیں اور چند لوگ مولانا عبداللہ انصاری کو دیوبند کے سلسلۂ زریں سے الگ خیال کرتے ہیں؛ حالانکہ بعض مباحث و مسائل میں جزوی اختلاف رائے کے باوصف مولانا عبداللہ انصاری تمام تر اسی نظریہ اور اصول کے عامل اور متبع رہے جو علمائے سلف سے متوارث چلا آ رہا ہے اور جس کی علمائے خاندان حضرت شاہ ولی اللہ اور اسی کے اتباع میں دیوبند کے علماء نمائندگی اور ترجمانی کرتے ہیں.

بہر حال جب یہ بحث شروع ہوئی اور مولانا انصاری کو جماعت ولی اللہی اور ان کے بزرگوں سے کاٹنے کی کوشش کی گئی تو اس وقت مولانا عبداللہ انصاری نے ایک تحریر کے

ذریعے اپنے عقائد ونظریات اور فقہی مسلک کی وضاحت کی تھی. یہ تحریر شاید ایک مرتبہ چھپی بھی ہے. اصل تحریر جو مولانا عبداللہ انصاری کے قلم سے ہے ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے.(۱) (بدقسمتی سے یہ ساری قیمتی اور نادر دستاویزیں ایک ایسے حادثہ میں ضائع ہو چکی ہیں جس کے وقوعہ میں مسلم یونیورسٹی کے بعض ارباب حل وعقد کا ذکر آتا ہے)

اعتقادات کے متعلق بیانات

مولانا عبداللہ انصاری کی اس تحریر سے ان تمام الزامی تحریروں اور غلط بیانیوں کی صاف تردید ہو جاتی ہے. یہ تحریر مولانا عبداللہ انصاری کی ایک اہم یادگار کی حیثیت رکھتی ہے اور ان کے نظریات کی دریافت میں اس کا بنیادی حصہ ہے. یہاں من وعن نقل ہے:

۱- ذکر ولادت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جو بروایات صحیحہ ہو اور وعظ معمول کے مرتبہ سے کسی طرح نہ بڑھاوے اور کسی طرح کے اس کو لزوم مالا یلزم نہ سمجھے تو موجب خیر و برکت کا ہے بشرطیکہ درجۂ ......(؟) میں رکھے اور گاہے ماہے اتفاق ہوتا ہو.

۲- ایصال ثواب موتیٰ کو اگر کسی شخص نے اپنے ذاتی مال سے جو کسب حلال سے حاصل ہوا، فقرا و مساکین کو دے کر کہا یا کچھ تلاوت قرآن شریف کی یا استغفار و کلمہ طیبہ پڑھ کر حسب اتفاق تیسرے دن یا دسویں دن کسی وجہ خاص سے بخشا حالانکہ اس کے عقیدہ میں روز اول بوجہ شدت احتیاج میت کے افضل جانتا ہے اور قبولیت کے باب میں جملہ ایام کو مساوی سمجھتا ہے اور ثواب پہنچانے کو محض تبرع اور سلوک اپنے ذمہ جانتا ہے، فرض واجب نہیں جانتا، تو اس کا ثواب میت کو پہنچ جائے گا اور ثواب پہنچانے والا بھی ماجور ہوگا.

الراقم عبداللہ بقلم خود

اسی تحریر پر مزید یہ بھی لکھا ہے کہ:

المفتقر الی الباری، عبداللہ انصاری بیان کرتا ہے کہ مسائل بالا کو احقر نے اپنے بزرگوں کے کلام سے اس طرح سمجھا ہے، اگر حضرت مولانا مولوی محمد قاسم و

حضرت مولانا مولوی محمد یعقوب رحمہا اللہ تعالیٰ کی کسی تحریر سے اس کے خلاف ثابت ہو تو احقر کے حافظہ کی غلطی ہوگی اور اپنا عقیدہ وہی ہوگا جو ان حضرات نے تحریر فرمایا ہے.

طالب حق کو اصرار نہیں ہوتا اور اپنی سمجھ اور حافظہ پر بھروسہ نہیں ہوتا. فقط

عبداللہ انصاری بقلم خود

حاشیہ

۱- اس تحریر کا عکس، سہ ماہی **فکر و نظر** علی گڑھ (نامورانِ علی گڑھ کا دوسرا کارواں علی گڑھ. ۱۹۸۶ء) میں میرے مضمون کے ساتھ شائع ہو چکا ہے- کاندھلوی.

باب : ۱۲

چند تقاریر

مولانا عبداللہ انصاری میں وعظ وتقریر کی لیاقت فطری تھی. اس کے جوہران کی نوعمری ہی میں کھلنے لگے تھے. اس کا عام اندازہ اس وقت ہوا جب ایک مرتبہ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے مولانا عبداللہ انصاری کو اپنی جگہ وعظ کہنے کی ہدایت کی.

مولانا نانوتوی رمضان المبارک میں ہر جمعہ کو اپنے وطن نانوتہ میں ماہ صیام کی مناسبت سے کسی آیت یا رمضان کے احکام ومسائل کے موضوع پر اپنی مسجد میں خطاب فرمایا کرتے تھے.

ایک مرتبہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کی طبیعت ناساز تھی. مسجد میں وعظ کہنے کا موقع نہیں تھا لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ معمول ناغہ ہو اور قصبہ اور دیہات کے جو لوگ ان کے وعظ اور دینی باتوں کے اشتیاق میں نانوتہ کی جامع مسجد میں حاضر ہوتے تھے وہ رمضان کے مبارک دنوں میں مایوس واپس ہوں. لیکن سوال یہ تھا جس پر کئی لوگوں کی نظریں لگی ہوں گی کہ مولانا نانوتوی کی نمائندگی کون کرے. اور وہاں ایسا کون ہے جو علمی مہارت، حسنِ استدلال اور خوش بیانی میں مولانا نانوتوی کا نمائندہ اور قائم مقام ثابت ہو. ایسا نمائندہ جس کی تقریر وتعبیر مولانا نانوتوی کی تقریر وتعبیر سمجھا جائے اور وہ ان کے اسلوب پر علمی مضامین اور رمضان المبارک کے متعلق باتیں برجستہ اور بے تکلف پیش کر سکے.

اس وقت مولانا عبداللہ انصاری دارالعلوم دیوبند میں پڑھتے تھے اور نوعمر تھے. مولانا نانوتوی سے ان کی قرابت داری تھی اور مولانا نانوتوی ان کی صلاحیت ولیاقت اور قدرت کلام سے اپنے شاگرد ہونے کی وجہ سے بہت اچھی طرح واقف تھے اور جانتے تھے کہ ان کے خیالات ونظریات ان کے طرز تقریر اور مزاج وتعبیرات کو وہاں حاضر اور موجود

افراد میں مولوی عبداللہ انصاری سب سے زیادہ سمجھتے تھے اور اس موقع پر وعظ اور تقریر میں بھی وہی سب سے بہتر نمائندگی کر سکیں گے. اس لئے مولانا نانوتوی نے مولانا عبداللہ انصاری کو ہدایت کی کہ اس جمعہ کے بعد وہ وعظ و تقریر کریں. ساتھ ہی تقریر کا عنوان بھی متعین فرمادیا کہ وعظ حدیث نبوی **من صام رمضان ایماناو احتسابا** کے موضوع پر ہوگی جس پر مولانا نانوتوی پچھلے وعظ کہتے آرہے تھے.

حضرت نانوتوی کی نیابت

مولانا انصاری کو اس ہدایت سے حیرت ہوئی کہ وہ کہاں اور مولانا نانوتوی کی مسند پر بیٹھ کر وعظ وارشاد کہاں؟ اس لئے انکار کیا اور اس خدمت کے انجام دینے میں تکلف ہوا، لیکن مولانا نانوتوی کے حکم دینے کے بعد صاف انکار بھی مشکل تھا چنانچہ مجلس وعظ برپا ہوئی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کی نمائندگی کرتے ہوئے مولانا عبداللہ انصاری نے وعظ کہا.

وعظ بھی کیا شاندار، بھرپور اور مسلسل کہ لوگوں نے اس کو مولانا نانوتوی کے وعظ کے مماثل سمجھا اور یہ خیال کیا کہ مولانا انصاری کی زبان سے مولانا نانوتوی بول رہے ہیں.

ایک موقعہ پر اس واقعہ اور خطاب کا تذکرہ خود مولانا عبداللہ انصاری نے کیا تھا:

> میں نانوتہ میں ایک رمضان میں حاضر تھا اور پورے رمضان مقیم رہا. اس رمضان میں حضرت (نانوتوی) نے حدیث **من صام رمضان ایمانا و احتسابا غفرله ما تقدم من ذنبه** کو اختیار فرمایا اور مسلسل تین جمعوں میں اسی کا بیان فرماتے رہے. آخری جمعہ میں کچھ طبیعت ناساز ہوگئی تو مجھے فرمایا کہ مولوی عبداللہ اس جمعہ میں تم اسی حدیث کے سلسلے میں بیان کردو. میں شرح جامی پڑھتا تھا. میں نے عرض کیا کہ حضرت میں تو حدیث کے مدلول کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا تقریر و بیان کیا کروں گا فرمایا، بھائی اللہ پر بھروسہ کر کے کھڑے ہو جانا خدا مدد فرمائے گا. باوجود صد انکار کے مجھے حضرت نے کھڑا کر دیا. میں لرزاں و ترساں منبر کے پاس کھڑا ہوگیا، خطبہ بھی پڑھ لیا حدیث بھی پڑھ لی اور کچھ ترجمہ وغیرہ شروع کیا. (۱)

مولانا عبداللہ انصاری نے اس وعظ و تقریر اور اس کے مضامین کو مولانا محمد قاسم

نانوتوی کی توجہ اوران کے علم کا فیضان قرار دیا ہے اور اس تذکرہ میں فرمایا:

> اتنا تو میں نے دیکھا کہ حضرت باہر کی سہ دری میں گردن جھکائے میری طرف متوجہ ہیں پھر مجھے خبر نہ رہی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں تقریباً دو ڈھائی گھنٹے میں نے بیان کیا. نہ بیان سے پہلے خبر تھی کہ کیا کہوں گا نہ بعد میں خبر ہوئی کہ کیا بیان کیا مگر لوگوں نے کہا کہ نہایت اونچے اونچے علوم بیان کئے. (۲)

مولانا محمد قاسم نانوتوی کے اثرات و تعلیمات کی کارفرمائی تو مولانا عبداللہ انصاری کی تعلیم و تربیت میں ہمیشہ جاری رہی جو یقیناً اس وعظ میں بھی خاصی ظاہر ہوئی ہو گی. مولانا نانوتوی نے بھی اس وعظ کے لئے مولانا عبداللہ انصاری کا انتخاب کیا اسی لئے کہ وہ ان کی علمی صلاحیتوں، فہم و ذکاوت، مطالعہ، قوت بیان اور استدلال ذہن کی تیزی سے واقف ہوں گے. ورنہ وہ انہیں اس بھاری بوجھ کے اٹھانے کی زحمت نہ دیتے.

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

مولانا عبداللہ انصاری کی یہ صلاحیت فطری تھی. ان میں یہ قوتِ بیان، حسن تقریر، طرز گفتگو، عنوان کے تمام گوشوں کو جامعیت اور ترتیب واختصار سے تسلسل کے ساتھ پیش کرنے کی استعداد ابتدا ہی سے موجود تھی. علی گڑھ کالج کی مسجد میں ہر جمعہ کی مجالس وعظ کے علاوہ مختلف جلسوں، اجتماعات، ندوۃ العلماء لکھنؤ کے اجلاسوں اور علمی نشستوں کے موقعوں پر اس کا خوب خوب اظہار ہوتا رہا.

تقریر وتحریر کا ملکہ

اگر چہ تحریر میں تقریر کے حسن اور انداز خطابت کا اظہار ممکن نہیں ہوتا لیکن اکثر تقریریں اور مواعظ ایسے ہوتے ہیں کہ مجلس وعظ اور تقریر میں وہ کیسے ہی دلکش اور قابل قدر معلوم ہوں اور سامعین پر ان کا کیا ہی گہرا اثر نظر آتا ہو لیکن جب ان کو تحریر میں منتقل کیا جاتا ہے تو وہ تقریر جس سے مجمع دم بخود اور فضا مخمور و مرتعش نظر آ رہی ہو بے مزہ اور بے کیف نظر آتی ہیں. پتہ چلتا ہے کہ وہ تو صرف مقرر کے اندازِ بیان کی ساحری اور ماحول کا اثر تھا جس

نے اس تقریر کو معجز بیان سمجھا تھا ورنہ حقیقت میں اس تقریر میں کوئی بڑی اور گہری بات یا فکر ومعنویت نہیں تھی. لیکن مولانا عبداللہ انصاری کی تقریروں کے جو ٹکڑے یا نمونے ہم تک پہنچے ہیں اس میں سے اکثر وہ ہیں جس کے لئے انہوں نے بظاہر پہلے سے کوئی یادداشت نہیں لکھی ہوگی. زیادہ تر تقریریں برجستہ اور تازہ وارد مباحث وسوالات کے جواب میں کی گئیں تھیں. اس کے باوجود ان کی افادیت، ترتیب اور فکر کی گہرائی اور حسنِ بیانی کاغذ کے صفحات پر بھی اسی طرح نمایاں ہے جس کا مجلس وعظ وتقریر میں مشاہدہ ہوا. یہ تقریر کا وہ امتیاز اور مقرر کا ایسا وصف ہے جس میں بہت کم واعظ اور مقرر کامیاب ہوتے ہیں.

آئندہ صفحات میں مولانا عبداللہ انصاری کی چند تقریروں کے اقتباسات یا وہ حصے جو مختلف رودادوں اور رپورٹوں میں محفوظ ہو گئے ہیں نقل کئے جاتے ہیں، ان سے مولانا عبداللہ انصاری کی قوت خطابت اور حسن تعبیر کے علاوہ ان موضوعات پر ان کے مطالعہ کی وسعت، فکر واحساسات کی گہرائی اور مستقبل کے تصورات کا بھی اندازہ ہوگا.

خطبۂ کانپور

پہلی مفصل تقریر وہ ہے جو مولانا عبداللہ انصاری نے نادیۃ العلماء کے پہلے جلسے میں پیش کرنے کے لئے تحریری طور پر مرتب کی تھی. یہی نادیہ (اجتماع) بعد میں مدرسہ ندوۃ العلماء میں بدل گیا تھا. ندوۃ العلماء کے پہلے باقاعدہ اجلاس کانپور ۱۵-۷ اشوال ۱۳۱۱ھ (۲۲-۲۴ اپریل ۱۸۹۴ء) کی روداد میں اس تقریر کا اکثر حصہ چھپا ہے. اس تقریر سے دینی اداروں اور مدارس میں تعلیم کے نظام، ترتیب اور نصاب وغیرہ کے متعلق مولانا کے خیالات کا علم ہوتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نظر کیسی دوربیں اور صائب تھی جس نے آنے والی مشکلات اور کمزوریوں کا اندازہ وقت سے بہت پہلے کر لیا تھا.

یہ تقریر جس قدر چھپی ہے یہاں درج کی جا رہی ہے مگر اسی روداد کے بعد مندرجات (۳) سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اشاعت سے تقریر کے وہ حصے نکال دیئے گئے تھے جن میں مولانا عبداللہ انصاری نے مدارس میں تعلیم وترقی کے اصول وضوابط کا تذکرہ کیا

تھا۔اس کے باوجود اس تقریر کی اہمیت و معنویت سے انکار نہیں کیا جاسکتا.

نادیۃ العلماء سے خطاب

اس تقریر کے چند اقتباسات آٹھویں باب میں گزر چکے ہیں، مکمل مطبوعہ تقریر یہاں پیش ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِی مَنَّ عَلٰی نَبِیِّنَا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم بِتَأْلِیْفِ الْقُلُوْبِ وَ اَطْفَأَ بِبَرَکَتِہٖ مَاکَانَ مُضْطَرِماً بَیْنَ الْقَبَائِلِ مِنْ نَارِ الْحُرُوْبِ وَ شَدَّ أَزْرَ الصَّحَابَۃِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُم اَجْمَعِیْنَ بِالْاِتِّفَاقِ، وَخَلَّصَھُم عَنِ التَّبَاغُضِ وَ التَّحَاسُدِ وَالنِّفَاقِ، وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی نَبِیِّہٖ وَصَفِیِّہٖ مَعْدَنِ الْاَخْلَاقِ، وَ عَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ الَّذِیْنَ شَیَّدُوا الدِّیْنَ بِالْوِفَاقِ، واسْتَأْصِلُوا الْکُفْرَ مِنَ الْحِجَازِ وَالْمِصْرِ وَ الْعِرَاقِ.

حمد و ستائش اللہ کی جس نے ہمارے نبی پر احسان فرما کر دلوں کو باہم مانوس کر دیا، اور اپنی برکت سے گل کر دیا قبائل کی باہمی جنگ کی آگ کے بھڑکتے شعلوں کو، اور صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کی پیٹھ کو مضبوط کیا انہیں باہمی اتفاق سے قوت عطا فرما کر، اور انہیں محفوظ فرمایا بغض و حسد اور نفاق سے۔ پس صلوۃ و سلام اس کے نبی اور اس کے وصی پر جو اخلاق کا معدن ہیں اور ان کے اصحاب پر جنہیں مضبوط کیا ان کی باہمی موافقت سے اور جڑ سے اکھاڑ پھینکا کفر کو حجاز و مصر و عراق سے۔

حمد و صلوۃ کے بعد یہ امید وارِ فضل باری عبد اللہ الانصاری اول شکریہ خداوند دو جہاں کا کمال فرحت و انبساط کے ساتھ اس نعمت عظمیٰ پر ادا کرتا ہے کہ قادر علی الاطلاق نے سالہا سال کے بعد جماعت اہل اسلام کی طرف سے آواز روح افزا یہ سنائی کہ علوم اسلام کیونکر زندہ رہ سکتے ہیں، اور مسلمانوں کا نفاق باہمی کس طرح دور ہوسکتا ہے، اور وہ کون سے طریقے ہیں جن کے اختیار کرنے سے اسلام اور اہل اسلام اچھی حالت پر قائم رہ سکتے ہیں. جس خداوند قادر علی الاطلاق نے محض اپنے فضل و کرم سے یہ آواز دلکش سنائی اسی کے فضل اتم سے امید کامیابی کی بھی کی جاتی ہے۔اس لئے کہ جس درجے کے تنزل کو ہماری حالت علمیہ و عملیہ و اخلاقیہ پہنچ گئی ہے وہ اسی کی مقتضی ہے کہ اب ہماری ترقی کا دور شروع ہو کیونکہ عادۃ اللہ اسی

طرح جاری ہے کہ ہر تنزل کے بعد ترقی اور ہر ترقی کے بعد تنزل کا دور شروع ہوتا ہے، جیسے شمس فلکی مدام دوائر صغار کو طے کر کے دوائر کبار کی طرف تدریجی طور پر میلان کرتا ہے اور دوائر کبار سے دوائر صغار کی طرف تدریجاً متوجہ ہوتا ہے۔

پس اس وقت جو ہم اپنی تعلیمی اور اخلاقی حالت دیکھتے ہیں تو اس میں انتہا درجے کی ابتری پاتے ہیں اور نیز بوجہ ابتریٔ تعلیم صفاتِ اسلامیہ اتحاد، ایتلاف، غم گساری، تواضع، عزم، ارادہ ودیگر صفات حمیدہ سے ہم لوگ بے بہرہ ہو گئے اور اخلاق ذمیمہ شقاق، نفاق، بغض، عناد، بزدلی، کبر، غرور میں نعوذ باللہ اول درجے پر فائز ہیں۔ان صفات ذمیمہ کا جوش اس امر کی خبر دے رہا ہے کہ خدانخواستہ اہل اسلام پر اور ادبار آنے والا ہے اس لئے کہ یہی صفات ذمیمہ مخبر ادبار عقلاء کے نزدیک ہیں جیسے صفات حمیدہ عند العقل مبشر اقبال ہیں۔اس لئے کہ رفتار زمانہ سے یہ امر ہر شخص پر واضح ہو چکا ہے کہ جس زمانے میں جس قوم نے ترقی پائی ہے صفات حمیدہ ہی کی بدولت پائی ہے اور جس قوم پر جب کبھی ادبار آیا ہے بداعمالی ہی کی وجہ سے آیا ہے۔

تجزیۂ حالات کی ضرورت

اب ہم کو اپنی حالت پر خیال کرنا چاہئے کہ ہم لوگ فی زمانناباعتبارِ تعلیم و اخلاق بااقبال ہیں یا دائرۂ ادبار نے ہمارا احاطہ کر رکھا ہے۔پس ہر شخص اپنے سلف صالح کی حالت پر قیاس کر کے یہی کہے گا کہ بے شک ہم پر دائرۂ ادبار محیط ہو رہا ہے اور روز بروز وہ دائرہ فراخ ہوتا جاتا ہے۔اور سبب اُس دائرہ کی فراخی کا ادباری پرکار کی ساقین کا بُعد ہے۔جس قدر ادباری پرکار کی ساقین میں بُعد ہوتا جائے گا اسی قدر دائرۂ ادبار کا فراخ ہونا بدیہی بات ہے۔اور بُعد ساقین ادبار پرکار کا عند العقل بدنظمیٔ تعلیم وفساد ذات البین ہے۔جس قدر ہم میں وقتاً فوقتاً بدنظمیٔ تعلیم وفساد ذات البین بڑھتا گیا اُسی قدر دائرۂ ادبار فراخ ہوتا گیا۔

ملاحظہ فرمایئے کہ اول صرف عوام الناس ہی کو دائرۂ ادبار محیط تھا کہ وہ بطمع دنیائے دنی آپس میں لڑتے تھے۔افسوس ہزار افسوس کہ وہ دائرہ فراخ ہوتے ہوتے خواص کو بھی محیط ہو گیا کہ وہ لوگ احاطۂ للّٰہیت واخلاص سے نکل کر نفسانیت وتعصب

کی چال چلنے لگے، الا ماشاء اللہ. اور دشمن دین شیطان لعین بھی جس قدر نفسانیت و غفلت تعلیم سے خوش ہوتا ہے ایسا کسی کبیرہ گناہ سے خوش نہیں ہوتا.

سبب اُس کا یہ ہے کہ نفسانیت و جہالت راس الکبائر ہے. یہی نفسانیت و جہالت جھوٹ بلواتی ہے. یہی مسلمانوں کی آبروریزی کے درپے ہوتی ہے. یہی آزادی کی فکر میں لگاتی ہے. یہی کشت وخون کراتی ہے. یہی قطع قرابت کے درپے ہوتی ہے. یہی تحصیل کمالات کے کارخانوں کو غارت کرتی ہے. یہی اہل اسلامؑ کی بیخ وبنیاد کا تزلزل بلکہ استیصال کر ڈالتی ہے.

ہائے یہ بلائے عظیم اور عام ہو جائے اس مصیبت سے بڑھ کر اہل اسلام کے لئے کوئی بلا نہیں کہ جس پر سب مل کر توجہ کریں اور خدائے تعالیٰ سے بکمال عجز و نیاز خلاصی کی دعا چاہیں.

مگر آفت تو یہ ہے کہ ہماری تقدیر نے ایسا قضیہ منعکس کر دیا کہ ہم لوگ بلا کو بلا ہی نہیں سمجھتے بلکہ بلا کو عطا، درد کو دوا، زحمت کو رحمت، نقمت کو نعمت، تلون کو استقامت، ذِلت کو عزت، قساوت کو اُخوت، نفسانیت وتعصب کو حمایت دین و ملت سمجھنے لگے. بھلا وہ مریض کیونکر صحت پا سکتا ہے کہ اپنے آپ کو مریض ہی نہ سمجھے. سب سے بڑھ کر انسان کے پیچھے یہ روگ ہے کہ باوجود بیمار ہونے کے پھر آپ کو تندرست سمجھے.

جس قوم پر شامت اعمال کا وبال اور انقلاب کی بلا اور عام تباہی کی وبا آنے والی ہوتی ہے تو پہلے ہی سے اُس قوم کی الٹی عقل ہو جاتی ہے. شناعت پسند دنائت پذیر طبائع ہو جاتے ہیں.۔ چنانچہ فی زماننا نعوذ باللہ اپنا یہی حال ہے.

انحطاط کے اسباب

اب اے اہل اسلام ذرا اپنے انقلاب کو تو ملاحظہ فرمایئے کہ باعتبار دین و دنیا پیشتر ہمارے کیا کیا نام اور کیا کیا القاب تھے اور اب کیا ہیں. جس قدر انقلاب اپنی حالت میں آ گیا اصلی سبب اس کا نفسانیت اور جہالت ہے. شب و روز حقد و حسد، بغض و عناد کے دمدمے باندھے جاتے ہیں. قطع قرابت، جنگ و جدال،

اضاعت مال کے بڑے زور شور کے ساتھ طرفین سے حملے ہو رہے ہیں اور اس کی طرف اصلاً خیال نہیں کہ ان اختلافات سے کہ جن کا منشا نفسانیت ہے روز بروز مخالفین اسلام کے مستحکم قلعے بنتے جاتے ہیں. پس یہ چین سے ان مستحکم قلعوں میں شاداں وفرحاں بیٹھے ہوئے ہمارا تماشہ دیکھ رہے ہیں اور ہم کو اپنی ہی بلا میں گرفتار دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں. اور اہل اسلام تو میدان تخالف میں جوشِ نفسانیت کے سبب مسائل اختلافیہ کے حربوں سے خودکشی کے مرتکب ہو رہے ہیں.

بریں حال اے دل بباید گریست

اے دردمندان امت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ذرا ہوش میں آؤ اور دیکھو کہ امت مرحومہ کیسے کیسے اسباب غضبیہ میں گرفتار ہو کر دریائے جہالت ونفسانیت کے منجدھار تک پہنچ گئی ہے. خدا کے لئے جلدی جس طرح بن پڑے ڈوبتی قوم کو بچاؤ.

۱۸۵۷ء کے بعد کا انقلاب

اور یہ امر تمام حضرات جانتے ہیں کہ دہلی کے ہنگامے (۱۸۵۷ء) کے بعد دس بارہ برس تک مطلقاً تعلیم وتعلم کا نام ونشان باقی نہیں رہا تھا تمام نام آور علماء خانہ بدوشی کی حالت میں کس تکلیف سے بسر اوقات فرماتے تھے. علماء کی اس پریشانی اور بے سروسامانی نے طلبا کے دلوں کو افسردہ کر دیا تھا.

مگر الحمد للہ ثم الحمد للہ، بدون کسی کی فکر وتدبیر کے تخمیناً پچیس سال سے داعیہ غیبی کے سبب علوم اسلام کے زندہ رہنے کے اکثر اسباب موجود ہو گئے. ماشاء اللہ بہت سے لائق وفائق علماء وفضلا موجود ہیں. مدارس اسلامیہ بہ کثرت جاری ہیں. طلبا ہر مدرسے میں مناسب تعداد کے ساتھ موجود ہیں. کتب درسیہ ہر مدرسے میں بفضلہٖ تعالیٰ بقدر ضرورت پڑھائے جاتے ہیں. خیر خواہانِ اسلام بڑی علوِ ہمتی کے سالہا سال سے خدمت علماوطلباء ودیگر حوائج مدارس میں جان ومال بہ طیب نفس نثار کر رہے ہیں. پس بحمد اللہ اس وقت زندگی علوم کے تمام سامان امید سے زیادہ ہر جگہ مہیا ہیں.

مگر خوبیٔ قسمت سے اتفاقی کاموں میں بھی نفسانیت کو دخل دیا جا رہا ہے. وہ یہ کہ تھوڑی سی مسافت کے درمیان میں بہت سے مدارس جاری کر رکھے ہیں. یہ نہیں

کہ باتفاق رائے انھیں مدارس کو جہات اربعہ میں ایک مناسب مسافت پر مقرر کرتے کہ جس سے عظیم الشان نفع پہنچتا. سب سے بڑھ کر یہ ابتری ہے کہ بعض بعض شہروں بلکہ بعض بعض قصبات میں بلاضرورت کئی کئی مدرسے ہیں اور ہر مدرسے کے مدرس و مہتمم اپنے ہی مدرسے کی ترقی کے خواہاں ہیں، حتیٰ کہ بعض حضرات اس درجہ اپنے مدرسے کی خیر خواہی میں منہمک ہو جاتے ہیں کہ دوسرے مدارس کے تنزل بلکہ تخریب کے درپے ہو جاتے ہیں جیسا کہ یہ امر آج کل مشاہد ہو رہا ہے.

نشرِ علم یا انتشارِ مدارس

اگر یہ حضرات ایک شہر یا قصبے میں ایک ہی مدرسہ رکھیں اور سب مل کر ایک ہی مدرسہ کو ترقی دیں تو کس قدر ایک ہی مدرسہ ترقی علم کا ذریعہ ہو اور اس اتفاق کی وجہ سے تمام حوائج مدرسہ کا سرانجام ہوتا رہے اور طلباء ایسے ایسے کامل فارغ التحصیل ہوں کہ باید و شاید. مگر قریب قریب، شہر بشہر، قصبہ بقصبہ بلا نظام و بغیر سلسلہ مدارس ہونے کی وجہ سے علی الخصوص ایک ایک شہر میں بلاضرورت کئی کئی مدرسے ہونے کے سبب چار و ناچار مدرسین کو بغرض رونق مدرسہ طلبہ کی وہ وہ خوشامدیں کرنی پڑتی ہیں کہ جس کا بیان نہیں ہو سکتا. اور نیز مہتممین ایسی ایسی بیجا ناز برداریاں کر کے طلبہ کو تھامتے ہیں کہ جس کی حد نہیں. پس عاقل اور دانا لوگ اس امر سے قیاس کر سکتے ہیں کہ جب طالب مطلوب بن جائے تو کمال کس طرح حاصل ہوگا؟

علاوہ بریں طالب علم کو استعداد ہو یا نہ ہو، شوق ہو یا نہ ہو، پانچ پانچ چھ چھ سبق شروع کرا دیے جاتے ہیں. مدرسین کو یہ فخر کہ ہمارے مدرسے میں اِس سال اتنی کتابوں کی تدریس ہوئی اور اس قدر طلبہ کے دستار فضیلت باندھی گئی اور طلبہ بوجہ نادانی متعدد اسباق اور مدرسین و مہتممین کی دلداریوں کی خوشی میں پھولے نہیں سماتے، حالانکہ ان کے ساتھ یہ برتاؤ ایسا ہے کہ جیسے ضعیف بچے کو گھنٹے گھنٹے پر روٹی دے کر ہلاک کریں، یا چراغ میں اس قدر تیل ڈال دیں کہ اُس کی لَو بھی ڈوب جائے اور چراغ گل ہو جائے. فی زمانا جو ناقص الاستعداد طلبہ ہونے کے وجوہات ہیں منجملہ ان کے ایک خاص وجہ احقر کے نزدیک تکثیر اسباق اور ناز برداری کی حالت میں طلبہ کا رہنا ہے.

جن حضرات نے ان مدارس اسلامیہ سے پیشتر طالب علمی کی ہے ان کے جگر آج تک جان رہے ہیں کہ طالب علمی کیسی کٹھن چیز ہے، اور مدرسی کس جانفشانی کا نام ہے. مدرسی یہ کہ تمام حواشی اور شروح کا مطلب تو از بر ہو مگر خدمت تدریس کا اطمینان میسر نہ ہو. طالب علمی یہ کہ نہ کتاب دستیاب، نہ روٹی کپڑے کا انتظام، نہ رہنے کی مکان کا بندوبست. سچ ہے طالب علمی کا پیشہ اور سب پیشوں سے زیادہ مشکل ہے آسان نہیں:

لَوْ كَانَ طَلَبُ الْعِلْمِ اَسهَلَ حِرفَةٍ لَمَا كَانَ ذُوْ جَهْلٍ عَلَى الْاَرْضِ فِى زَمَنٍ

سو اُس وقت بڑی جد و جہد سے اگر کوئی بدخط کرم خوردہ کتاب مل گئی اسی کو ہزار غنیمت سمجھا اور مثل صحیفۂ آسمانی کے اس کی تعظیم کی اور احتیاط سے رکھا.

بعد دستیابی کتاب روز دو وقتہ اُستاد کے درِ دولت پر حاضری دیتے ہیں اور کمال ادب اور احترام سے سلام کر کے کسی کونے میں جا بیٹھتے ہیں. اور استاد صاحب کی آواز پر کان لگ رہے ہیں. روزانہ اسی تگ و دو میں وقت مقررہ پورا کر کے چلے آتے ہیں. اگر دوسرے تیسرے وقت اُستاد صاحب نے چیں بہ جبیں ہو کر فرما دیا کہ ہاں میاں کچھ تھوڑا سا سبق کہنا ہے تو کہہ لو، یا میاں مجھ کو فلاں جگہ جانا ہے ہمراہ چلو اور راستے میں پڑھتے چلنا، تو شاگرد صاحب نے شاد ہو کر دست بستہ عرض کیا کہ بہت اچھا اور استاد صاحب کی اس شفقت کو ایسا غنیمت سمجھا کہ گویا روح القدس تعلیم کے واسطے اتر آئے یا حضرت خضر پڑھانے پر متوجہ ہو گئے.

پس چونکہ اس کتاب بدخط و کرم خوردہ میں بدون اعلیٰ درجے کی عرق ریزی کے مطالعہ نہیں نکل سکتا تھا، ادھر استاد کی توجہ بھی عنقا صفت، لہٰذا مطالعے میں شبانہ روز ایسی جان کھپی کرتے تھے کہ مضمون سبق کا خلاصہ مطالعے ہی میں حفظ ہو جاتا تھا اور استاد صاحب سے صرف تصحیح کی ضرورت رہتی تھی یا کوئی خاص نکتہ حاصل ہو جاتا تھا، سو اُن کو کتاب پڑھ لینے میں وہ قوت مطالعہ بڑھ جاتی تھی کہ اس وقت کے فارغ التحصیل لوگوں کو بھی وہ ملکہ نہیں ہوتا اور بڑے بڑے نکات غامضہ استادوں کے ایک اشارے میں سمجھ جاتے تھے کہ اس وقت کے بعض مدرسین کتاب سے بھی نہیں سمجھ سکتے.

اسی وجہ سے پیشتر کے زمانے میں **شرح ملا** پڑھنے والا نصف عالم گنا جاتا تھا اور اب **شرح ملا** کے پڑھنے والے بھی طالب علم ہونے کے مصداق مشکل سے ہوتے ہیں. الا ماشاء اللہ.

پس اس وقت کے کتب درسیہ کی صحت اور صفائی اور اعلیٰ درجے کے محشی ہونے نے طلبہ کو مطالعے کی محنت سے بے فکر کر دیا. اور اس وقت کے علماء ہیں کہ بوجہ کثرت مدارس اپنے تعلق کی شکل بنی رہنے کی وجہ سے طلبہ کے خوشامدی بن گئے، یعنی پڑھیں یا نہ پڑھیں لیکن پڑے رہیں کہ مدرسے کا ڈھنگ بنا رہے تا کہ چندۂ مقررہ آتا رہے.

پیشتر طلبہ کو مرض ثم خیرا کا باعتبار سبق کے لاحق ہوتا تھا وہ مرض مبارک تھا اور اب باعتبار طبق کے لاحق ہوتا ہے اور یہ مرض نامبارک ہے. اکثر طلبہ کو اس وقت میں روٹی کپڑا اور دیگر حوائج اہل شہر کی سخاوت کے صدقے مہتممین کی دریوزہ گری کی بدولت گھر سے زیادہ میسر آنے لگے. پس اس اطمینان کی حالت میں آیا ہوا شوق بھی دل سے جاتا رہا. چنانچہ بہت سے طلبہ جو اطراف وجوانب سے آتے ہیں ان میں یہ مشاہدہ ہو چکا ہے کہ جب اپنے گھر سے آئے تو محنتی اور شوقین تھے اور بعد تقرر سبق وطبق ایسی بے فکری سے سوتے ہیں کہ جیسے کوئی سوداگر گھوڑے بیچ کر سوتا ہے. **اَللّٰھُمَّ اِرْحَمْنَا وَامْلَأْ قُلُوْبَنَا بِشَوْقِ الْعُلُوْمِ الْبَاقِیَہ وَلَا تَشغلنا بِلَذَائِذِ الْفَانِیَه. اٰمین ثم اٰمین.**

اول گزارش احقر کی مجوزین جلسہ کی خدمت میں یہ ہے کہ یہ جلسہ مبارک دمیمون جو منعقد ہوا ہے فی الحقیقہ یہ وہ الہام اللہ تعالیٰ نے آپ لوگوں کے پاک قلبوں پر کیا ہے جو ہمیشہ قوم کے پیش رو لوگوں پر کیا کرتا ہے. اس جلسے کا انعقاد ہماری تمام بہبودیوں کے لئے اعلیٰ درجے کا ذریعہ ہے. اسی ستون کے نمونے سے اسلامی چھت روز بروز بیٹھتی چلی جاتی تھی. اس جلسے کو مجمع البحرین، فلاح دارین، و بنیاد دین وعلم اسلام، غرض کہ جو کہیں بجا اور درست ہے. اہل عقل خوب جانتے ہیں کہ یہ کیسی کچھ دولت عظیم ہے. پس اس وقت ہم سب کو پروردگار عالم کا شکریہ اس نعمت پر تہہ دل سے ادا کرنا چاہئے کہ ہم کو گورنمنٹ ایسی بے نفس اور بے تعصب ملی کہ جملہ رعایا اپنی اپنی

مذہبی ضرورتوں کو اس کے سایۂ معدلت میں حسب دلخواہ پورا کرتی ہے اور ہر مذہب اور ملت کے تمام ارکان اعلان کے ساتھ ادا ہوتے ہیں، علی الخصوص اسلام اور اہل اسلام کی جگہ اس کے دل میں بہت کچھ ہے. **اَلحمدُ لِلّٰہِ وَ شکر للہ**. خداوند تعالیٰ مدام گورنمنٹ عالیہ میں صفت رحم اور عدل کی روز افزوں فرمائے. آمین ثم آمین.

اصلاحی مہم کا نسخہ

اب مجوزین جلسہ کی خدمت میں بقیہ گزارش یہ ہے کہ جس طرح بن پڑے کم از کم دس بارہ برس تک اسی طرح سالانہ جلسے کا انتظام فرمایا جائے. انشاء اللہ تعالیٰ یہ جلسہ تمام مہمات دین کے لئے پورا کفیل ہوگا اور بحول اللہ وقوۃ عمدہ عمدہ نتائج سال بسال اس سے ظاہر ہوتے رہیں گے. سو اگر خدانخواستہ دو تین برس حسب دلخواہ آپ صاحبوں کے اس میں کامیابی نہ ہو تو بھی گھبرا کر اس کو موقوف نہ کریں.

اور یہ بھی التماس ہے کہ یہ جلسہ سال بسال مختلف مقامات میں ہوا کرے تا کہ اس کی برکت اور رونق اور اثر معنوی سے سب جگہ کے لوگوں کو روحانی زندگی حاصل ہو، کیونکہ آپ صاحب اب ملاحظہ فرمائیں گے کہ اس جلسے کے انوار و برکات خاص کانپور اور اس کے قرب و جوار کیسے کچھ پھیلتے ہیں پس ان انوار اور برکات سے سب کو بہرہ مند ہونا چاہئے.

اب یہ احقر کمال منت و الحاح سے دست بستہ تمام بزرگان تشریف فرمائے جلسہ کی خدمت میں گزارش کرتا ہے کہ للہ آپ بزرگوں سے جس طرح بن پڑے دو چار اصول انتظام پر اتفاق فرمائیں تا کہ اسلام کی مدد ہو اور منعقدانِ جلسہ کا دل بڑھے اور مخالفین کو ہنسی اور آوازے کسنے کا موقع نہ ملے.

خداوند قادر مطلق ہم لوگوں کو ایسی توفیق اتفاق عطا فرمائے جیسی کہ مجوزان جلسہ کو انعقاد جلسہ کی توفیق مرحمت فرمائی. **آمین یا رب العالمین.**

اس کے بعد مولانا عبداللہ انصاری نے اتفاق اور تعلیم کی بابت نہایت عمدہ تجویز اوران کے قواعد انتظامیہ لکھے ہیں جو نہایت قابل قدر ہیں. مگر چونکہ قبل از وقت ہیں اس لئے ان کا لکھنا غیر مناسب معلوم ہوتا ہے، البتہ بعض باتیں یہاں لکھی جاتی ہیں. مولانا عبداللہ

انصاری تعلیم کے متعلق پانچ انتظام تحریر فرماتے ہیں:

۱- انتظام مدارس یعنی تمام مدارس میں واسطہ و رابطہ فرع و اصل کا کر دیا جائے۔

۲- انتظام اعلیٰ تعلیم کہ بعض علوم اور کتب جدیدہ داخل کی جائیں اور بعض موقوف کی جائیں اور بعض میں حسب مصلحت کمی بیشی کی جائے۔

۳- انتظام طلبہ کہ محنت اور شوق سے پڑھیں اور بدون حصولِ سند ایک مدرسے سے دوسرے مدرسے میں باختیار خود مثل شتر بے مہار داخل نہ ہوں۔

۴- انتظام امتحان کہ پورا ہو اور معتد بہ نفع حاصل ہو۔

۵- انتظام دستار بندی کہ بدون مناسبت جملہ علوم و استعداد کامل کے صرف دل خوش کرنے کے لئے رسمی دستار بندی ہرگز نہ ہو۔

ان نکات کی تفصیل بیان کرنے کے بعد مولانا عبداللہ انصاری نے فرمایا:

اور ان انتظامات خمسہ کے اکثر دفعات انشااللہ تعالیٰ احقر پیش کش خدمت کرے گا۔

وحدت کلمہ کی اساس پر یکجہتی

اس سے پہلے اراکین جلسہ کی خدمت میں ایک امر ضروری یہ پیش کرنا ہے کہ آپ کا مدعا اُس وقت حاصل ہو سکتا ہے کہ آپ اس امر میں مدام کوشش رکھیں کہ تمام کلمہ گو اور اہل قبلہ سے فروعی مسائل کی منازعت اُٹھ جائے اور سب کلمہ گو مثل اعضائے شخص واحد کے دردمند ہو جائیں، کیونکہ اس وقت سب کو یہ یقین کر لینا چاہئے کہ بوجہ ہجوم مخالفینِ اسلام ہم لوگ بدرجۂ غایت اتفاق باہمی کے محتاج ہیں۔ یہ وقت ہرگز ہرگز متفرق ہونے کا نہیں ہے کہ ظلمت کفر چار طرف زور شور کے ساتھ چھا رہی ہے اور جا بجا مخالفین اسلام طرح طرح سے ہماری ہلاکت دین کے درپے ہیں۔ پس اس وقت ہم کو بتقاضائے **کُوْنُوا عِبَادَاللّٰهِ اخوانا** اُخوت اسلامی کی وجہ سے ایک ہو کر باطل فرقوں کے حملوں کو تحریر و تقریر سے روکیں اور یہ برکت **کَلِمَةُ اللّٰهِ هی العلیاء اعلاء کلمة اللّٰه** ہو جانے پر جب آفتاب

ہدایت روشن ہوگا ہر ایک کی افراط وتفریط ظاہر ہو جائے گی اور وقت حصول فراغ نزاع باہمی کے اس کی تدبیر برمحل اور مناسب وقت ہوگی.

اس وقت یہ آپس کے جھگڑے سراسر بے محل اور بے موقع ہیں. اس وقت لازم ہے کہ جملہ کلمہ گو اور اہل قبلہ اپنے اپنے دعوؤں کو واپس لے لیں. اپنے فعل کے مختار رہیں اور آپس کے مباحثے کو ترک کر کے اتفاق پیدا کرنے اور اُس کے مضبوط رہنے کی کوشش کرتے رہیں. اہل اسلام کی نجاح اور فلاح کی صورت بجز اس طریقے کے احقر کے نزدیک اور کوئی نہیں.

اختلاف مسالک کا احترام

اور یہ جو اختلاف ہمارے عینی بھائیوں میں آمین بالجہر و رفع یدین وغیرہ کا پڑ رہا ہے اس کی اصلاح کمترین کے خیال میں اس طرح آتی ہے کہ اس بات پر فریقین کے علماء اتفاق فرمالیں کہ علمائے عامل بالحدیث بوجہ فرط محبت عمل بالحدیث آمین بالجہر اور رفع یدین وغیرہ اُمور خود کیا کریں مگر عوام الناس کو ہرگز ہرگز تلقین نہ فرمائیں کیونکہ عوام کالانعام کے اعتقاد فاسد ہو جاتے ہیں. یہ لوگ کم حوصلہ ہونے کے سبب ائمہ سے برگشتہ ہو جاتے ہیں اور فقہ سے بوجہ جہالت منکر ہو جاتے ہیں، حالانکہ فقہ کا ماخذ خاص قرآن وحدیث ہے. اور حضرات مقلدین علمائے عامل بالحدیث کی آمین بالجہر پر ہرگز لب کشا نہ ہوں بلکہ دل سے ان کا احترام فرمائیں کیونکہ عمل بالحدیث اُس حالت میں کہ درجہ اجتہاد کا حاصل نہ ہو مغلوب المحبت لوگوں کا کام ہے.

ایک مدت دراز سے دردمندان اسلام اس مسئلے کے حل کرنے کے درپے تھے کہ روز بروز مسلمانوں کی حالت کس وجہ سے پست ہوتی جاتی ہے اور ضعف اسلام کو قوت ہوتی جاتی ہے اور اہل اسلام برکات حقیقت اسلام سے محروم ہوتے جاتے ہیں. الحمد للہ علی احسانہ کہ اب مسألہ باتفاق آراء طے ہوگیا اور اس کا سبب اصلی معلوم ہوگیا وہ یہ کہ اہل اسلام کی چستی ان کی حالت دینیہ کے متغیر ہونے کی وجہ سے ہے. چنانچہ اُس کی توثیق کلام ربانی سے بھی ہوگئی. إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ یعنی حق تعالیٰ کبھی کسی قوم کی حالت کو

نہیں بدلتا جب تک وہ قوم اپنے دلوں کی کیفیت کو نہ بدلے.

جماعت تبلیغ کی الہامی تمہید

پس جب کہ دردمندان اسلام کو اہل اسلام کی پستی کے مرض مہلک کا سبب خاص معلوم ہو گیا تو اس سبب کے ازالے کے لئے ایک جماعت اشاعت اسلام قائم ہونی چاہئے جس کے تین مقصد ہوں گے.

مقصد اول یہ جماعت ایسے علمائے واعظین کو جو کہ سیرت محمدی علی صاحبہا الف الف صلوۃ وسلام سے مشرف ہوں قصبات و دیہات میں روانہ کیا کرے جو عقائد اسلام وارکان خمسۂ اسلام اوران کے اسرار وحکمتوں کی منادی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے طرز پر فرمایا کریں اور اہل اسلام کو فرائض مذہبی کا اپنی وعظ و نصیحت کی سچی تاثیروں سے پابند کریں تا کہ جملہ اہل اسلام برکات اسلامی سے بہرہ مند ہوں. اور اُن علماء کی خدمت بقدر کفاف جماعت اشاعت اسلام کے ذمہ ہو گی. عام اہل اسلام سے ان کی خدمت کا اصلاً تعلق نہ ہو گا. اس حالت میں اُن واعظین کا اثر نہ صرف عوام ہی پر پڑے گا بلکہ خواص بھی ان کے استغناء کی وجہ سے گرویدہ ہو جائیں گے. غرض کہ وہ سب کے دلوں کے مالک ہو جائیں گے.

دوسرا مقصد یہ کہ جس قدر مدارس اسلامیہ میں اندرونی نقصانات ہیں یہ جماعت تدابیر حسنہ سے ان کی اصلاح کرے گی اور حتی المقدور ان مدارس کی اعانت کرے گی.

تیسرا مقصد یہ کہ جس قدر اسکول وکالج ہیں ان میں جو جو نقصانات مشاہدہ ہو رہے ہیں یہ جماعت ایسی تجاویز نیک کرے گی جن سے وہ نقصانات رفع ہوں اور ایسی مختصر تعلیم دینی جاری کرے گی جس کا انگریزی تعلیم کے ساتھ حاصل کرنا دشوار نہ ہو تا کہ طلبہ اعمال حسنہ کی طرف بالطبع مائل ہوں اور صورت وسیرت محمدی کا نمونہ بنیں. (۴)

وفاق المدارس کا ابتکاری تصور

تجویز سوم یہ کہ مدارس اسلامی جو کثرت سے جا بجا قائم ہیں ان کو ایک

سلسلہ میں مربوط کرنے کے لئے دو تین بڑے بڑے مدرسہ مثل مدرسۂ دیوبند و مدرسۂ فیض عام کانپور و مدرسۂ احمدیہ آرہ وغیرہ بطور دارالعلوم کے قرار دیئے جائیں اور چھوٹے چھوٹے مدرسہ ان کی شاخیں بنائی جائیں اور ان کی تمام کارروائی ان دارالعلوم کی نگرانی وانتظام میں رہے۔

ندوۃ العلماء کے اجلاس میں یہ تجاویز پیش کرتے ہوئے مولانا عبداللہ انصاری نے مختصر الفاظ میں فرمایا کہ سلسلہ مدارس کا قائم ہونا بہت مفید ہے، البتہ جو دارالعلوم قائم ہوں ان کو افسر المدارس یا راس المدارس کہنا چاہئے۔ ارتباط نہ صرف برائے نام ہو بلکہ دل سے وابستہ ہونا چاہئے تاکہ کوئی تفرق باقی نہ رہے۔

اس تقریر کا مطالعہ چند امور پر متوجہ کرتا ہے جو کم و بیش نصف صدی پہلے مولانا عبداللہ انصاریؒ کے قلم وزبان سے علماء اخص الخواص اور عامۃ الناس کے گوش گزار ہوئی تھیں اور بعد میں ان تجاویز پر عمل درآمد ہوا اور ان کے خوشگوار نتائج سے ملت اسلامیہ کو فائدہ ہوا۔

سالانہ ملی جلسوں کی اہمیت

اول یہ کہ نادیۃ العلماء جیسے سالانہ اجلاس منعقد کئے جاتے رہیں جن میں ایک طرف جید علماء عصر جمع ہوں، ان کے مابین ذاتی روابط قائم ہوں، باہم تبادلہ خیال اور ملی ترقی کے موضوعات پر تازہ تجویز پر غور وخوض ہو، اور سالہائے گزشتہ میں ان تجاویز پر عمل درآمد اور نتائج کا جائزہ لیا جائے، منصوبوں میں مناسب حال و مستقبل ترمیم وتبدیلی کی جائے، اور دوسری جانب ان علما اور قائدین کے افکار عالیہ سے عام مسلمان بھی بہرہ مند ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ اس قسم کے سالانہ اجلاسوں کا تصور سرسید نے دیا تھا اور ہندستان کے طول وعرض میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس لگاتار چالیس سال تک منعقد ہوتے رہے۔ انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ اجلاس اگرچہ صرف لاہور تک محدود رہے لیکن اہل لاہور اور نواحی اضلاع کے ذہنوں پر ان اجلاسوں کا مثبت اثر بہرحال پڑا۔ مزید برآں ۱۹۲۸-۱۹۳۵ء کے دوران آل انڈیا مسلم کانفرنس منعقد ہوتی رہی جس کا

مقصد پیش آمدہ سیاسی معاملات کا حل تلاش کرنا ہوتا تھا۔

آزادیٔ ہند کے بعد کچھ مدت مسلمانانِ ہند نے اوسطاً ہر دس سال میں علماء، مشائخ اور قائدین کے موضوعاتی اجلاسوں کا ایک نظام قائم کیا تھا۔ آزادی کے پانچ سال بعد بمبئی میں آل انڈیا دینی تعلیمی کنونشن منعقد ہوا تھا جس کے ماتحت پورے ملک میں تقریباً ہر مسجد میں لاکھوں دینی مکاتب قائم ہوئے اور یوں آزادی کے بعد کی پہلی نسل کا دین وایمان علمی اور عملی بن سکا۔

اس کے بعد ۱۹۶۳ میں دہلی میں آل انڈیا مسلم کنونشن منعقد ہوا جس میں قومی اور ملی دونوں قسم کے امور پر کھلے مذاکرے ہوئے اور ان کی قراردادوں سے ملک کے قومی لیڈروں نے بھی فائدہ اٹھایا۔

اس اجلاس کے دس سال بعد ۱۹۷۲-۷۳ء میں بمبئی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا کنونشن منعقد ہوا جس کا تاسیسی مقصد تو عام مسلمانوں اور حکومت ہند اور ریاستی حکومتوں کو قانون شریعت سے باخبر کرنا تھا اور جن امور پر شریعت اسلامی کے مغائر قانون بن گئے تھے عوامی اور سرکاری سطح پر ان کی اصلاح کا کام کرنا تھا، اگرچہ اس سمت میں قرار واقعی کام نہ ہوسکا، پھر بھی بورڈ نے بعض دیگر ملی معاملات میں ملت کی ہنگامی اور جزوی رہنمائی ضرور کی، گو کہ بورڈ تازہ کار ملی قیادت کا منبع نہ بن سکا۔ مسلم پرسنل لا بورڈ کے سالانہ اجلاس ملک بھر میں ہوتے رہتے ہیں اور ان سے کچھ فائدہ بھی ضرور ہوا مگر ایک طرف تو ملک میں عدم رواداری میں بھاری اضافہ ہوا ہے اور دوسری طرف خود جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں میں مرادات اسلام سے مغائرت پیدا ہوئی اور بورڈ یا خود علماء ماضی کی طرح اس معاملہ میں رہنمائی نہ کرسکے۔

دینی مدارس کا اساسی مقصد

دوسرا نکتہ یہ کہ کیا عجب جو مولانا عبداللہ انصاری کی نگاہ فراست پر آج کی حالت ہویدا ہو کہ انہوں نے نادیۃ العلما کے کانپور اجلاس میں اس پر زور دیا کہ مدارس دینیہ کا اہم مقصد طلبہ میں اعلیٰ درجہ کی استعداد پیدا کرنا ہونا چاہیئے کیونکہ اسی کے نتیجہ میں اعلیٰ صلاحیت

کے اساتذہ نکل کر سامنے آئیں گے اور وہیں سے ہمہ گیر قیادت بھی ابھرے گی. بدقسمتی سے تعلیمی ادارے خواہ دینی ہوں یا دنیاوی اس مقصد کی پزیرائی نہ کر سکے اور ملت اسلامیہ ہند کو اس معیار کے طلبہ اور اساتذہ میسر نہیں آرہے ہیں جن کا تقاضا یہ بحرانی دور کرتا ہے.

تیسرا نکتہ یہ کہ طلبہ اور اساتذہ کے بلند معیار کے مقصد کا انحصار نصاب تعلیم کی اصلاح پر ہے. یہ بات بھی سو سال پہلے مولانا عبداللہ انصاری کے ذہن رسا پر روشن تھی جسے انہوں نے ندوۃ العلماء کے اجلاس کانپور میں جامع اور دردمندانہ خطاب میں بیان کردیا تھا. یہ الگ بات ہے کہ وقتی اور ادارہ جاتی مفادات اس تجویز کے قبول عام میں رکاوٹ کل بھی تھے آج بھی ہیں.

مکاتب اور جامعات کا نظام

چوتھا نکتہ یہ کہ مولانا عبداللہ انصاری چاہتے تھے کہ تمام مدارس دینیہ کے لئے جامعاتی درجہ ضروری نہ قرار دیا جائے اور مختلف علاقوں میں جامعات کی شکل میں دار العلوم قائم ہوں جہاں بلند استعداد اہل اللہ اساتذہ اعلی کتابیں اور علوم پڑھانے لئے موجود ہوں اور باقی مدارس ان جامعات کے معاون اور ملحقہ ذیلی تعلیمی ادارے سمجھے جائیں. ہندستان میں بڑے مدارس نے اس نظام کو اختیار کیا اور اس کے عمدہ نتائج بھی سامنے آئے. پاکستان میں وفاق المدارس قائم ہوگیا. بلاشبہ یہ مولانا عبداللہ انصاری کی دوراندیشی کا ایک نمونہ ہے.

پانچواں نکتہ یہ کہ ایک ایسے زمانہ میں جب سلطنت انگلشیہ کی درپردہ تائید و حمایت سے برصغیر اور عالم عرب میں فرقہ سازی اور ان فرقوں کے ذریعہ تکفیری سرگرمیوں میں اضافہ ہورہا تھا، مولانا عبداللہ انصاری نے ایسی تمام سرگرمیوں کو ملت کے ہمہ گیر مفاد کے خلاف قرار دیا اور وحدت کلمہ کی بنیاد پر ملی یکجہتی پر زور دیا. اس سلسلہ میں انہوں نے خاص طور سے مقلدین اور غیر مقلدین کے مابین خلیج کو رواداری، مروت اور برداشت کے ذریعہ پاٹ ڈالنے کی وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیا. یہ ضرورت جتنی کل تھی اتنی ہی آج ہے کہ ۱۸۹۴ء کی وہ آواز آج تقریبا سوا سو سال بعد برصغیر میں مختلف مسلکوں کے چند ممتاز علماء

دین کا مقصد حیات بنی نظر آتی ہے۔

چھٹا نکتہ یہ کہ مولانا عبداللہ انصاری کو تبلیغی جماعت کا فکری موسس کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کانپور اجلاس میں انہوں نے ۱۳۱۱ھ میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ ایک ایسی جماعت علماء کی قائم ہو جو سیرت محمدی سے مشرف علماء واعظین کو ''قصبات و دیہات میں روانہ کیا کرے جو عقائد اسلام وارکان خمسۂ اسلام اوران کے اسرار و حکمتوں کی منادی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے طرز پر فرمایا کریں''۔

اس دعوت عام کے ۳۳ سال بعد حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ نے ۱۹۲۷ء میں انہی مقاصد کے لئے جماعت تبلیغ قائم فرمائی جس سے بلاشبہ ملت اسلامیہ کو غیر معمولی فائدہ ہوا مگر مرور زمانہ کے ساتھ اس میں یہ خلا در آیا کہ علماء کے بجائے ادھر ادھر جانے والی جماعتوں پر غیر علماء کا قبضہ ہو گیا جو مبادیات دین سے جزوی واقفیت تو رکھتے ہیں مگر شریعت کی علمی اور فقہی باریکیوں کا علم نہیں رکھتے۔

بدعات کے انسداد کا نکتہ

دین میں بدعات ایسے ہی نیم علم یا بے علم مخلصین نے پیدا کی ہیں۔ مولانا عبداللہ انصاری خود اعلیٰ پایہ کے عالم دین اور مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی جیسے عبقری علماء کے تلمیذ خاص تھے اور خود ان کی نگاہ فراست سے عمرانی عادتوں کے نتائج پوشیدہ نہیں تھے اسی لئے انہوں نے کانپور اجلاس میں اس جماعت کے لئے صرف ''سیرت محمدی سے مشرف علماء واعظین'' کو جماعتوں کی شکل میں قصبات و دیہات میں بھیجنے کی تجویز رکھی تھی تا کہ کسی امکانی بدعت کو ابھرنے سے پہلے ہی مٹا دیا جائے۔ بے شک بزرگ علماء دین جو اس کام میں مشغول ہوئے انہوں نے اپنے علم اور عمل سے مروجہ بدعات کا قلع قمع کیا تھا۔ یہی مولانا عبداللہ انصاری کا منشا تھا۔

خطبۂ کانپور کی ان تشریحات سے ظاہر ہے کہ مولانا عبداللہ انصاری پر آشوب زمانہ میں روشن مستقبل کا خواب دیکھ رہے تھے۔ جاگتی آنکھوں دیکھا جانے والے اس خواب

کی تعبیر بننے کی توانائی اس زندہ ملت کے تمام افراد اور اداروں میں آج بھی موجود ہے۔

حواشی

۱- گیلانی، مولانا مناظر احسن. سوانح قاسمی گیلانی. ۱: ۳۴۴. طبع اول. دیوبند ۱۳۷۳ھ.

۲- ایضاً.

۳- روداد سال اول اجلاس، نادیۃ العلماء (ندوۃ العلماء) ۱۳۱۱ھ. ص ۱۰۸.

۴- روداد اجلاس چہارم، ندوۃ العلماء، منعقدہ میرٹھ. شوال ۱۳۱۴ھ/ مارچ ۱۸۹۷ء. ص ۳۷-۴۷.

باب : ۱۴

وفات اور مدفن

مولانا عبداللہ انصاری نے تقریباً ۷۳ سال عمر پائی جس میں سے چونتیس سال سے زیادہ مدت تک وہ مدرسۃ العلوم مسلمانان عرف ایم.اے.او.کالج علی گڑھ سے وابستہ رہے. نئی نسلوں کی اسلامی ذہن سازی انہیں اس درجہ عزیز تھی کہ زندگی کے تقریباً آخری دنوں تک علی گڑھ میں مقیم رہے اور شعبۂ دینیات میں خدمت انجام دیتے رہے.

ان کا انتقال ۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۵ء میں اپنے آبائی وطن انبہٹہ پیرزادگان، ضلع سہارنپور، میں ہوا اور وہیں انصار انبہٹہ کے قدیمی خاندانی قبرستان میں امت کے ایک مخلص مفکر کی تدفین ہوئی. آخری دور حیات میں کسی بیماری یا مرض وفات کی تفصیلات معلوم نہیں، لیکن انتقال سے چند ہفتہ قبل وہ انبہٹہ چلے گئے تھے جس کی صراحت وہاں کے مقامی باشندوں کے بیان سے ملتی ہے.

سنہ وفات کا تعین

ان کی وفات کے بعد ندوۃ العلماء کے بیسویں سالانہ جلسے میں ان کی وفات پر جو اظہار تاسف کیا گیا اور قرارداد تعزیت منظور کی گئی اس سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا عبداللہ انصاری کا انتقال ۱۳۴۴ھ (۱۹۲۵ء) کے غالباً ابتدائی تین مہینوں محرم تا ربیع الاول میں سے کسی مہینے میں ہوا تھا.

ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۳۴۴ھ میں گزشتہ کارروائی کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے مولانا عبداللہ انصاری کے حادثۂ وفات کا ذکر کیا گیا ہے. پھر اجلاس میں تعزیت کی قرارداد بھی پیش ہوئی جس میں اس تحریک کے ایک قدیم رفیق کی جدائی پر تأسف کا اظہار کیا گیا اور ان کی مغفرت کی دعا کی گئی.

ایک فروگذاشت

مولانا عبدالحی حسنی (۱۲۸۶-۱۳۴۱ھ/ ۱۸۶۹-۱۹۲۲ء) عمر میں مولانا عبداللہ انصاری سے ۱۷ سال چھوٹے ہم عصر تھے. خاندانی روایت یہ ہے کہ مولانا عبدالحی حسنی ۳۰ سال تک ندوۃ العلماء کے نائب ناظم اور ناظم کے طور پر کام کرتے رہے. ان کا سانحہ ارتحال ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۲ء میں پیش آیا تھا جس کا مطلب ہے کہ جس سال کانپور اجلاس کے نتیجہ میں ندوۃ العلماء کو تنظیم علماء کے بجائے مدرسہ قرار دیا گیا اسی سال مولانا محمد علی مونگیری کے نائب کی حیثیت سے ۲۵ سالہ مولانا عبدالحی حسنی کو ندوۃ العلماء کا نائب ناظم مقرر کیا گیا تھا. اس وقت مولانا عبداللہ انصاری کی عمر ۴۲ سال تھی. یعنی زندگی کے تشکیلی دور میں کہ ایک باصلاحیت اور ذی علم نوجوان سے توقع تو یہی ہوتی ہے وہ اپنے بزرگوں کے ساتھ ارادت کا نہیں تو مؤدت کا تعلق رکھے گا. حسن ظن کا تقاضا بھی یہی ہے، لیکن **نزهة الخواطر** میں بعد کی تحریفات اور الحاقی عبارتوں نے خود مولانا سید عبدالحی حسنی کی شخصیت کو بھی خاصا داغدار کردیا ہے اور ایسا تاثر دیا ہے جیسے ان کو اپنے عہد کے ایک بزرگ عالم دین کے ساتھ دانشمندانہ تعلق نہ تھا.

مولانا عبدالحی حسنی کی اہم تالیف **نزهة الخواطر** میں مولانا عبداللہ انصاری کے اجمالی تذکرہ کی عبارت آرائی دیانت کے معیار پر پوری اترتی ہے نہ درست تاریخی بیان ہے. اول تو ایک ایسے شخص کے علمی مقام پر طعن کیا گیا جس کا ندوۃ العلماء کی تاسیس میں اہم فکری کردار اور عملی مساہمت تھی. اس شذرہ میں ان کا سنہ وفات ۱۳۴۴ھ دیا ہے. اس بیان میں فروگزاشت یہ ہے کہ ان کا انتقال بمبئی میں بتایا گیا ہے.

مات فی نحو اربع و اربعین و ثلاثه ماته والف فی بومبائی.(۱)

تقریباً ۱۳۴۴ھ میں بمبئی میں وفات ہوئی.

اس اطلاع کا پہلا حصہ تو درست ہے کہ تقریباً (بلکہ شروع) ۱۳۴۴ھ میں وفات پائی لیکن یہ صحیح نہیں کہ مولانا کی وفات بمبئی میں ہوئی تھی. مولانا کے اہل خاندان اور انبہٹہ

کے بزرگوں کی روایت واطلاع یہ ہے کہ مولانا عبداللہ انصاری کی وفات انبہٹہ پیرزادگان ضلع سہارنپور میں ہوئی اور وہیں خاندانی قبرستان میں تدفین ہوئی. انبہٹہ پیرزادگان کے ایک بزر گ جناب وکیل احمد انصاری (بھائی بھورے) تا حال حیات ہیں. ان سے روایت ہے کہ

> ۱۹۲۵ء میں جب مولانا عبداللہ انصاری کا انتقال ہوا اس وقت میری عمر آٹھ سال کی تھی اور مجھے ان کی نماز جنازہ خوب اچھی طرح یاد ہے.

مولانا عبداللہ انصاری کے احفاد کو یہ اطلاع دیتے ہوئے بھائی بھورے نے انصار انبہٹہ کے خاندانی قبرستان میں ان کی قبر کی نشان دہی بھی کی تھی.

انبہٹہ میں تربت کی نشان دہی

ایک خاندانی روایت اور ہے: ۱۹۶۹ء میں مولانا عبداللہ انصاری کے پڑ پوتے ارشد منصور غازی اپنے والد گرامی مولانا حامد الانصاری غازیؒ کے ہمراہ انبہٹہ پیرزادگان کے تاریخی مقامات کی زیارت کے لئے گئے تھے. اس موقع پر خاندانی قبرستان بھی پہنچے تھے جہاں مولانا حامد الانصاری غازی نے اپنے دادا مولانا عبداللہ انصاری کی قبر مبارک کی نشان دہی فرمائی تھی. وکیل احمد انصاری عرف بھائی بھورے نے بھی اسی جگہ قبر کی نشان دہی کی تھی. وکیل احمد انصاری صاحب سے ۱۹۹۹ء میں اس ملاقات کے بعد مولانا حامد الانصاری غازی کے بیٹے محمد طارق غازی نے مولانا عبداللہ انصاری کی قبر کی درستی کروا کر جو ڈھ گئی تھی، ان کے نام کا کتبہ لگوا دیا تھا جس کی تصویر اس کتاب میں موجود ہے.

درحقیقت **نزهة الخواطر** کی یہ غلطی مولانا عبدالحیؒ حسنی کے قلم سے اندراج نہیں ہے بلکہ بعد میں کسی ایسے شخص کا قلمی اضافہ ہے جو بظاہر نہ مذکورہ شخصیات سے واقف تھا نہ ان کے فضل و کمال کا معترف. اور یوں اصل زیادتی مولانا عبدالحی حسنی کے ساتھ ہوئی.

حسنی سے منسوب الحاقی بیان

مولانا عبدالحی حسنی کی وفات مولانا عبداللہ انصاری کے سانحہ ارتحال سے تین سال پہلے ۱۳۴۱ھ میں ہوئی تھی. لہٰذا یہ ثابت ہے کہ مولانا عبداللہ انصاری پر شذرہ ان کے قلم

سے نہیں نکلا. یہ بعد کا اضافہ ہے. شبہ کا فائدہ دیتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے اس الحاقی تحریر میں ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسوں کی دو رپورٹوں اور دو ہم نام علماء کی قرار داد ہائے تعزیت میں التباس ہو گیا ہے. مولانا عبداللہ انصاری کی وفات ۱۳۴۴ھ میں ہوئی اور اس سے ایک سال پہلے رجب شعبان ۱۳۴۳ھ (مارچ ۱۹۲۴ء) میں مولوی عبداللہ احمد حیؒ کی وفات پر اظہار افسوس کیا گیا تھا اور قرارداد تعزیت پیش ہوئی تھی. چونکہ ان دوسرے بزرگ کی وفات بمبئی میں ہوئی تھی اور ان کا نام بھی عبداللہ تھا تو الحاقی عبارت لکھنے والے نے بلا تحقیق خلط ملط ایک مہمل بیان درج کر دیا. مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی کا انتقال مولوی عبداللہ احمد حیؒ کے بعد ہوا اور سال بھر بعد کے اجلاس میں ان کے لئے قرارداد تعزیت منظور ہوئی تھی. اب یا تو شذرہ نویس کو مغالطہ ہو گیا یا کوئی اور وجہ تھی.

لیکن بات صرف یہی نہیں. حقیقت یہ ہے کہ **نزھۃ الخواطر** میں مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی کا ذکر محض خانہ پری ہے. جس میں ندوۃ العلماء کی تاسیس اور ترقی میں ان کا ذکر مفقود ہے حالانکہ اس عہد کی اہم مسلم تاریخی کتابوں میں یہ تفصیلات موجود ہیں اور خود آزاد برقونی موسوعہ ویکیپیڈیا میں بھی اس موقعہ کے بیانات میں مولانا عبداللہ انصاری کا تذکرہ مولانا شبلی نعمانی کے ساتھ ساتھ آتا ہے.

تاریخ دار العلوم دیو بند کی ایک غلطی

جناب سید محبوب رضوی نے **نزھۃ الخواطر** میں مندرج مولانا عبداللہ انصاری کے سنہ وفات کی اس اطلاع کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے:

> **نزھۃ الخواطر** جلد ہشتم میں ان (مولانا عبداللہ انصاری) کا سال وفات ۱۳۴۴ھ لکھا ہے جو درست نہیں ہے. اگرچہ ان کے انتقال کا صحیح سنہ معلوم نہیں ہو سکا مگر اتنی بات یقینی ہے کہ ۱۳۴۴ھ (۱۹۲۵ء) سے پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا. انبہٹہ میں اپنے آبائی قبرستان میں آسودہ خاک ہیں. (۲)

یہاں مغالطہ سید محبوب رضوی کو ہوا. **نزھۃ الخواطر** کی اطلاع جزوی طور پر

درست ہے کیونکہ یہ بات شبہ سے بالا ہے کہ مولانا عبداللہ انصاری (عمر تقریباً ۷۳ سال) ۱۳۳۹ھ میں حیات تھے. اس وقت کے متعدد مضامین اور رسائل میں ان کا ایک زندہ و موجود شخص کی حیثیت سے تذکرہ آیا ہے کہ وہ ندوۃ العلماء کے رکن تھے جو آخر تک رہے، اور ندوۃ العلماء کے بیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ ۱۱-۱۲ جمادی الثانی ۱۳۴۴ھ (۲۸-۲۹ نومبر ۱۹۲۵ء) میں ان کی وفات پر قرارداد تعزیت پیش ہوئی، جس کے الفاظ یہ ہیں:

> یہ جلسہ اپنے دلی رنج و غم کا اظہار مولوی عبداللہ صاحب ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی رحلت پر کرتا ہے. مرحوم ابتداء سے ندوۃ العلماء کے ارکان ہمدردان میں شامل تھے اور دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ غریق رحمت فرمائے.[۳]

اب اگر انتقال ۱۳۴۴ھ (۱۹۲۵ء) سے پہلے ہوا تھا تو تعزیتی قرارداد کے لئے جمادی الثانی ۱۳۴۴ھ (نومبر ۱۹۲۵ء) کے اجلاس تک کیوں انتظار کیا گیا تھا.

حواشی

۱- حسنی، مولانا عبدالحی. **نزهة الخواطر**. ۸:۲۸۶. حیدرآباد ۱۴۰۲ھ. بیروت. ۸:۱۲۹۱.

۲- رضوی، سید محبوب. **تاریخ دارالعلوم دیوبند**. ماہنامہ **الرشید**. ساہیوال. تاریخ دارالعلوم نمبر ۱۴۰۰ھ. ص ۱۸۶.

۳- خان، شمس تبریز. تاریخ ندوۃ العلماء. ۲:۲۹۸. لکھنؤ ۱۴۰۴ھ/۱۹۸۴ء.

باب : ۱۴

اجداد اولاد احفاد

مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی انصاریان سہارنپور کے علماء اور مشائخ کے ایک نامور خاندان سے تعلق رکھتے تھے. میزبان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوایوب خالد ابن زید نجاری خزرجی رضی اللہ عنہ کے سلسلہ اولاد میں چند خانوادے چنگیزی دور ظلمت میں ہرات، افغانستان، سے ہجرت کر کے موجودہ اتر پردیش کے شہر سہارنپور کے نواحی قصبات میں آباد ہو گئے تھے. اس ایوبی خالدی نسل میں بڑی تعداد میں اہل علم اور اہل اللہ پیدا ہوئے جن میں خواجہ سالار ہروی سہارنپوری، مولانا عبدالکریم سہارنپوری، مولانا عبدالستار سہارنپوری، مولانا مصطفیٰ سہارنپوری، مولانا رفیع الدین سہارنپوری، مولانا عبدالباقی سہارنپوری، مولانا محمد بقا سہارنپوری وغیرہ علماء وصوفیاء نے کئی نسلوں کے دوران شمالی ہند کے اس خطہ میں تبلیغ اسلام، تعلیم دین اور اصلاح باطن کا کام کیا جس کے نتیجہ میں اس ضلع میں کثیر تعداد میں لوگ شرف بہ اسلام ہوئے. ان بزرگوں کی سوانح کے لئے محمد طارق الانصاری غازی کی مبسوط سوانحی موسوعہ (انسائکلو پیڈیا) **تذکار الانصار** ملاحظہ کی جائے جو اقرا ایجوکیشن فاؤنڈیشن ممبئی نے شائع کی ہے (۱).

شیخ الاسلام مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی کا نسبی تعلق اسی علمی خاندان کی ایک ذیلی شاخ سے ہے.. ان کے اجداد میں شاہ غلام محمد سہارنپور کے باشندے تھے. ان کی شادی اہل دل کی بستی، نواحی مردم خیز قصبہ انبہٹہ میں صابری چشتی سلسلہ کے بزرگ حضرت شاہ ابوالمعالی کی پڑپوتی محفوظ النساء سے ہوئی تھی. اس کے بعد شاہ غلام محمد خود بھی انبہٹہ منتقل ہو گئے. شاہ غلام محمد کے صاحبزادہ شاہ قطب علی صاحب نسبت بزرگ اہل اللہ میں تھے. شاہ قطب علی کے صاحبزادہ شاہ احمد علی بھی شیخ طریقت تھے. شاہ احمد علی کے دو صاحبزادگان شاہ مجید علی

اور مولانا خواجہ انصار علی دنیائے علم اور دنیائے سیاست میں امتیازی مقام رکھتے تھے.

مولانا عبداللہ انصاری کے والد مولانا انصار علیؒ انیسویں صدی کے ایک تبحر عالم اور ریاست گوالیار کے مدار المہام کی حیثیت سے اپنے عہد کی سیاست کے ایک ممتاز نمائندہ تھے. وہ اور ان کے بھائی شاہ مجید علی اور ان کے دیگر برادران ولی اللٰہی تحریک کے رکن تھے جس کے ماتحت بڑی فراست اور سیاسی دوراندیشی سے ملک کی سیاسی یکجہتی کے لئے کسی بھی قسم کا خطرہ بننے والی طالع آزما ہندستانی ریاستوں میں اعلی عہدوں پر مسلم علماء کو پہنچا دیا گیا تھا تاکہ پانچ سو سال کی لگاتار انتھک محنت کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی برصغیر کی تاریخ کی سالمیت کی حفاظت کی جا سکے.

عمرانی بصیرت کے نمائندے

مولانا انصار علی، ان کے بھائی اور دیگر اہل خاندان مختلف ہندستانی ریاستوں میں سیاست کو انہی خطوط پر مؤثر کر رہے تھے. مولانا انصار علی کے بھائی، شاہ احمد حسن ابن شاہ احمد علی سندھ کی کسی ریاست میں اعلی عہدہ پر تھے. دوسرے بھائی شاہ مجید علی ابن شاہ احمد علی بھی مختلف ریاستوں میں ذمہ دار عہدوں پر برسرکار رہے تھے. شاہ مجید علی کے بیٹے مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوری طویل عرصہ تک جنوبی پنجاب کی ریاست بہاول پور کے جامعہ عباسیہ میں تدریس حدیث کے ساتھ نواب صادق محمد خاں کے معاملات اور عقائد کی اصلاح کرتے رہے تھے. مولانا انصار علی کے دوسرے بھتیجے، مولانا انوار احمد ابن شاہ حبیب محمد ابن شاہ احمد علی کو مولانا رشید احمد گنگوہی نے بہاول پور میں تعینات کیا تھا. ان کے تیسرے بھتیجے، مولانا منیر احمد انصاری ابن شاہ حبیب محمد ابن شاہ احمد علی بلوچستان کی ریاست قلات میں وزیر اعظم تھے، جہاں اسی زمانہ میں ۱۹۳۹ء میں ایک سال تک خود مولانا عبداللہ انصاری کے پوتے مولانا حامد الانصاری غازی ڈائریکٹر اطلاعات اور مدیر اعلی روزنامہ کوھسار رہے تھے.

مولانا انصار علی کی اولاد

دارالعلوم دیوبند کی دستاویزوں کے مطابق مولانا انصار علی کے تین بیٹے ہوئے

تھے: احمد حسین، عبدالرحمٰن اور عبداللہ. ان دستاویزوں سے یہ تو متعین ہو جاتا ہے کہ مولانا عبداللہ انصاری کی طرح ان کے دونوں بڑے بھائی احمد حسین اور عبدالرحمٰن بھی مدرسہ میں زیر تعلیم تھے. البتہ ان دونوں برادران بزرگ کے بارے میں مزید معلومات دستیاب نہیں ہیں، سوائے ڈاکٹر عابداللہ غازی کی اس یادداشت کے جس کا ذکر پہلے باب میں آچکا ہے کہ وہ مولانا عبدالرحمٰن انصاری ابن مولانا انصار علی کے ایک نا معلوم الاسم صاحبزادہ سے نوشہرہ پاکستان میں ۱۹۸۴ء میں قاری حمید میاں انصاری کے توسط سے ملے تھے. مولانا احمد حسین کے بارے میں اتنی معلومات بھی نہیں ہیں. کسی وجہ سے خاندان سے دونوں کا رابطہ قائم نہیں رہا تھا. معلوم نہیں آج کل ان کی اولاد کہاں آباد ہے.

مولانا عبداللہ انصاری

مولانا انصار علی کی نرینہ اولاد میں سب سے چھوٹے مولانا عبداللہ انصاری مشہور ہوئے کہ اول علی گڑھ اور دیوبند کی علمی تحریکوں کے مابین پہلا رابطہ بنے اور پھر مولانا ظہور الاسلام فتحپوری اور دیگر اکابر کے ساتھ علماء کی اس جماعت میں نمایاں تھے جس نے قدیم و جدید علوم کے مجوزہ مشترکہ مرکز کے طور پر لکھنؤ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تجرباتی بنا ڈالی تھی. اس انقلابی فکر کی تازگی مولانا محمد میاں منصور انصاری نے خود اپنے والد سے حاصل کی تھی.

مولانا عبداللہ انصاری رشتہ میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے بھانجے تھے اور داماد بھی ہوئے. مولانا نانوتوی کی بڑی صاحبزادی اکرام النساء (بی بی اکرامأ) مولانا عبد اللہ انصاری سے منسوب تھیں. شادی کی وہ تقریب بہت سادہ اور مسنون طریقے پر سرانجام پائی تھی جس کا تفصیلی ذکر ان کے پڑپوتے محمد طارق غازی نے ایک مضمون میں کیا ہے. مولانا نانوتوی نے اپنی چہیتی بڑی بیٹی کا نکاح انہی معمولی سادہ کپڑوں میں کیا جو وہ اس وقت پہنے ہوئے تھیں، اور انہی کپڑوں میں شوہر کے ساتھ رخصت کر دیا. ان سے دو بیٹے مولانا محمد میاں عرف منصور انصاری، مولانا احمد میاں انصاری نیز تین بیٹیاں امت السلام، امت الرحمٰن اور ام کلثوم یادگار تھیں. ان کی تفصیلات آگے آ رہی ہیں.

علمی ورثہ کی حفاظت

مولانا عبداللہ انصاری خوش قسمت تھے کہ ان کے علمی ورثہ کی حفاظت اولاد نے بھی کی. ان کی پانچویں نسل میں علمی روایت باقی اور مستحکم ہے. پہلی چار نسلوں میں کئی اہل قلم پیدا ہوئے اور ان کی تحریر کی ہوئی کتابیں مقبول عام ہیں. چوتھی نسل میں عربی، فارسی اور اردو کے ساتھ اب انگریزی میں بھی تحقیق وتصنیف کا سلسلہ جاری ہو چکا ہے. پانچویں نسل میں تحقیق وتصنیف کی یہ علمی روایت موجود ہے اگرچہ اس نسل میں ابھی کتابوں کی اشاعت پر توجہ نہیں ہوئی، تاہم رسائل واخبارات میں مضامین کی اشاعت کا سلسلہ ہے.

اس نسل میں علمی ذوق کی فراوانی کی نمائندگی کرنے والوں کی کمی نہیں ہے. اس تازہ کار نسل میں ہدایت اللہ ابن عبید اللہ منصور انصاری، عنایت اللہ ابن عبید اللہ منصور انصاری، صدیق منصور انصاری ابن مولانا سیف اللہ منصور انصاری، عمر منصور انصاری ابن قاری سیف اللہ منصور انصاری، احمد منصور انصاری ابن محامد اللہ انصاری، بشریٰ یاسمین عرف سیمیں غازی بنت ڈاکٹر عابداللہ غازی، رضی الدین اسد انصاری ابن پروفیسر احسان احمد انصاری (وطاہرہ انصاری بنت لطیف احمد الطف ابن امت السلام انصاری بنت مولانا عبداللہ انصاری) حمید الدین شمیم انصاری ابن پروفیسر احسان احمد انصاری (وطاہرہ انصاری بنت لطیف احمد الطف ابن امت السلام انصاری بنت مولانا عبداللہ انصاری) محمد منصور غازی ابن محمد طارق غازی، صبا نوید امین بنت ڈاکٹر عابداللہ غازی، صہیب حامد غازی ابن ڈاکٹر عابداللہ غازی، محمد علی غازی ابن سلمان منصور غازی، ثنا نورین غازی بنت سلمان منصور غازی، ہاجرہ منصور انصاری بنت قاری سیف اللہ منصور انصاری، عثمان منصور انصاری ابن قاری سیف اللہ منصور انصاری، محمد عرفان غازی ابن محمد خالد غازی، عمر محمد غازی ابن محمد خالد غازی، لبنیٰ غازی بنت محمد خالد غازی، محمد عمر غازی ابن ارشد منصور غازی، زینب غازی بنت ارشد منصور غازی، عفرا الانصاری غازی بنت محمد منصور غازی، عفاف الانصاری غازی بنت محمد منصور غازی، عافیہ الانصاری غازی بنت محمد منصور غازی اور

ہنیہ غازی بنت راشد منصور غازی سب الحمدللہ ذی علم، باصلاحیت اور اہل قلم ہیں اور مستقبل میں ان سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں.

مولانا محمد میاں منصور انصاری

مولانا عبداللہ انصاری کے سب سے بڑے صاحبزادے مجاہد جلیل مولانا محمد میاں منصور انصاری مہاجر کابل ایک عظیم تاریخی شخصیت تھے. اپنے والد کی طرح وہ دارالعلوم دیوبند کے فارغ، جید عالم دین اور نامور سیاسی رہنما تھے. انہوں نے برصغیر کی آزادی کی جدوجہد میں سرگرم حصہ لیا. شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کی ریشمی رومال تحریک کے صف اول کے قائد اور اس کے بنیادی ارکان ثلاثہ میں سے ایک تھے. دیگر دو ارکانِ مولانا عزیر گل اور مولانا عبیداللہ سندھی تھے تحریک کی منصوبہ سازی میں وہ شیخ الہند کے دست راست، اہم معاملات میں ان کے معتمد سفیر اور ان امور میں سب سے قابل اعتماد شاگرد تھے. اسی سلسلہ میں حجاز اور ہندستان سے افغانستان گئے اور افغانستان، وسطی ایشیا، روس اور ترکی کی متعدد تحریکوں میں حصہ لیا. تا حیات شیخ الہند کے مقاصد کے لئے کام کرتے رہے. کئی کتابوں کے مصنف ہیں. سیاسیات میں **تفسیر مُجمَلی سورۃ الفاتحہ: اساس انقلاب: مراقبۂ نماز ؛انواع الدول و حریت الملل ؛حکومت الٰھیہ ؛ دستور امامت امت** ؛فارسی ادب پر **شعر العجم** اور **ضرورت ترجمہ قرآن** ان کی تصانیف ہیں. اس کے علاوہ انہوں نے شیخ الہند کے ترجمہ قرآن اور تفسیری فوائد کو دری/ فارسی میں ترجمہ کروایا اور **تفسیر کابلی** کے عنوان سے اسے کابل سے شائع کروایا. ان کی علمی خدمات کا مقصد اسلام کی نشاۃ الثانیہ تھا. قیام کابل کے دوران حکومت افغانستان میں محکمۂ تعلیم میں ڈائریکٹر تھے. فتح سمرنا (ازمیر-Smyrna, now Izmir) کے وقت ترکی میں افغان سفارت کی سربراہی کی اور تہنیتی جشن میں خطاب کیا. رولیٹ کمیٹی (Rowlatt Committee) کے مطابق مولانا منصور انصاری تحریک ریشمی رومال کے سرگرم کارکن تھے. چونتیس سال تک جلا وطنی کی زندگی گزاری. روس اور مشرقی یورپ کی تمام اسلامی

ریاستوں کا دورہ کیا. ان کے مراسم اپنے زمانے کے اکثر صف اول کے انقلابیوں سے تھے جن میں لبیا کے شیخ احمد سنوسی اور مصر کے شیخ عبدالعزیز شاویش شامل تھے جو بڑی مدت انقرہ میں ان کے مہمان رہے تھے. ترکی سے واپس آکر افغانستان میں جلال آباد میں قیام کیا اور اسی خود گرفتہ جلاوطنی میں ۸ صفر ۱۳۶۵ھ (۱۱ جنوری ۱۹۴۶ء) کو کابل افغانستان میں وفات پائی. سرکاری اعزاز کے ساتھ تدفین لغمان میں حضرت لمک والد حضرت نوح علیہ السلام کے مقبرہ میں جلال آباد میں ہوئی. مولانا محمد میاں منصور انصاری کی سوانح اقرا ایجوکیشن فاؤنڈیشن ممبئی سے عنقریب شائع ہو رہی ہے جس میں پہلی بار ان کی زندگی کے مستند حالات تفصیل سے پیش کئے جا رہے ہیں. ان کے رسائل اور ان پر سیر حاصل تبصروں کی اشاعت کا انتظام بھی کیا جا رہا ہے.

مولانا منصور انصاری کی اولاد

مولانا محمد میاں منصور انصاری کی پہلی شادی اپنے رشتہ کے چچا مفتی اعظم مالیر کوٹلہ مولانا مفتی صدیق احمد مالیر کوٹلوی ابن مولانا شاہ مجید علی کی صاحبزادی حفصہ خاتون سے ہوئی تھی. ان سے چار اولاد ہوئیں: محمود میاں، حامد میاں، حمید میاں اور قدسیہ بیگم. محمود میاں تعلیم کے لئے اپنے ماموں کے پاس بہاولپور میں مقیم تھے کہ ۱۲ سال کی عمر میں اچانک انتقال ہو گیا.

حکیم الہند حامد الانصاری غازی

مولانا محمد میاں منصور انصاری کے دوسرے صاحبزادہ حامد میاں، حامد الانصاری غازی کے نام سے مشہور ہوئے وہ عظیم صحافی اور مفکر تھے انہوں نے سیکڑوں مقالے، صحافتی ادارئے، شذرات لکھے. ان کی کتابوں میں سیرۃ طیبہ پر ایک رسالہ **خلق عظیم** ہے جو نایاب ہے. اس کی نئی اشاعت کا انتظام کیا جا رہا ہے. مولانا حامد الانصاری غازی کی اہم تحقیق **اسلام کا نظام حکومت** اسلامی ریاست کی تکوین اور آئینی ہیئت پر ایک بنیادی کتاب ہے جو ندوۃ المصنفین دہلی سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی تھی. یہ کتاب پاکستانی یونیورسٹیوں میں سیاسیات اور قانون کی ڈگریوں کے لئے منظور شدہ ہے اور وہاں مسلسل

شائع ہو رہی ہے اور مقبول ہے. اس کا حالیہ ہندستانی ایڈیشن ممبئی سے اقرا ایجوکیشن فاؤنڈیشن نے ۲۰۱۱ء میں شائع کیا ہے.

علامہ غازی نے اردو صحافت کی بے مثال خدمت انجام دی. المحمود دیو بند، الانصار دیو بند، مہاجر دیو بند، مدینہ بجنور، ادبی دنیا لاہور، ماہنامہ ندائے حرم دہلی، سول اینڈ ملٹری گزٹ (اردو) لاہور، شاهکار بجنور، الجمیعۃ دہلی، روزنامہ جمہوریت بمبئی، جمہوریت ویکلی بمبئی، آئنہ بمبئی میں ان کی ادارتی خدمات تاریخ ساز ہیں. علامہ غازی کی حیات وخدمات پر چار کتابیں: ذکر غازی، فکر غازی، خطبات غازی اور شعری انتخاب نوید فردا اقرا انٹرنیشنل ایجوکیشنل فاؤنڈیشن شکاگو نے تیار کروائی ہیں جن کو اس کا ہندستانی ادارہ اقرا ایجوکیشن فاؤنڈیشن شائع کر رہا ہے.

مولانا حامد الانصاری غازی کی اولاد

مولانا حامد الانصاری غازی نے دو شادیاں کی تھیں. پہلی شادی میمونہ خاتون بنت پیر جی محمد میاں انبہٹوی سے ہوئی تھی جن سے ایک بیٹے ڈاکٹر عابد اللہ غازی (انبہٹہ ۱۹۳۵ء) اور ایک بیٹی عابدہ بیگم (بجنور ۱۹۳۶ء) ہوئیں. عابدہ بیگم کا انتقال ایک سال کی عمر میں بجنور میں ہوگیا تھا. میمونہ خاتون کا انتقال بھی کم عمر میں ہوگیا تھا. اس حادثہ کے دو تین سال بعد مولانا حامد الانصاری غازی کی دوسری شادی دار العلوم دیو بند کے مہتمم مولانا قاری محمد طیب کی دوسری صاحبزادی ہاجرہ نازلی سے ہوئی. ان سے مولانا غازی کے چار بیٹے اور ایک بیٹی ہوئی. ان کے حالات زندگی یہاں جمع کئے گئے ہیں.

ڈاکٹر عابد اللہ غازی

مولانا حامد الانصاری غازی کے سب سے بڑے صاحب زادے ڈاکٹر عابد اللہ غازی شکاگو میں مقیم ہیں. انہوں نے علی گڑھ، لندن سکول آف اکنومکس اور ہارورڈ یونیورسٹی، امریکہ میں تعلیم حاصل کی ہے. وہ اعلی پایہ کے مقرر اور اسی درجہ کے اہل قلم ہیں اور دنیا کے ان پانچ سو ممتاز مسلمانوں میں ان کا شمار کیا گیا ہے جو عہد جدید کے مسلم ذہنوں کو متاثر

کرتے ہیں. ڈاکٹر عابداللہ غازی نے اپنے والد کی ایماء پر ایک مبسوط و مکمل اسلامی نصاب تعلیم مرتب کیا ہے جس کی تجویز علامہ حامد الانصاری غازی نے فروری ۱۹۵۰ء میں جمعیۃ علماء ہند کے خطبۂ جونپور میں قوم کے سامنے رکھی تھی. اس وقت تو کسی نے اس آواز پر کان نہ دھرا لیکن برسوں بعد اس مقصد کے لئے ڈاکٹر عابداللہ غازی نے شکاگو میں اقرا انٹرنیشنل ایجوکیشن فاؤنڈیشن قائم کی اور ڈیڑھ سو سے زیادہ درسی کتابیں خود لکھیں اور دوسرے ماہرین تعلیم سے لکھوائیں. اس کام میں ان کی اہلیہ ڈاکٹر تسنیمہ خاتون کا مکمل تعاون انہیں حاصل تھا. ان کی شادی فتحپور رہسوہ میں تسلیمہ خاتون بنت بشیر الزماں خاں سے ہوئی. ان کے تین بیٹے راشد منصور غازی (لندن انگلستان ۱۹۶۶ء)، توام بیٹے صہیب حامد غازی اور اسامہ حمید غازی (بوسٹن، امریکہ ۱۹۷۲ء) اور دو بیٹیاں بشریٰ یاسمین غازی عرف سیمیں (لندن ۱۹۶۵ء)، اور صبا تسنیم غازی (بوسٹن، امریکہ ۱۹۷۰ء) ہیں. راشد منصور غازی کے تین بیٹے جبران غازی، راضان غازی اور شاہان غازی ہیں اور سب سے بڑی بیٹی ہبیہ غازی ہیں. یہ شکاگو، امریکہ، میں رہتے ہیں. صہیب اور اسامہ نے شادی نہیں کی. ڈاکٹر عابداللہ غازی کی تصنیفات میں بچوں کے لئے انگریزی میں سیرہ طیبہ کی کئی کتابوں کے علاوہ **درس نظامی** (انگریزی) میں مدارس دینیہ میں درس نظامی کے تحت پڑھائی جانے والی تمام کتب کا اجمالی تعارف کسی بھی زبان میں پہلی بار مرتب کیا گیا ہے. **راجہ رام موہن رائے** کی ہندو اصلاحی تحریک پر ان کا تحقیقی مقالہ بھی شائع ہو چکا ہے. اردو میں ایک ناول **انقلاب**، رواں شذرات کا مجموعہ **صریر خامہ** اور مجموعۂ شاعری **ذکر سمن عذاراں** شائع ہو چکے ہیں. ان کی خودنوشت **جہد مسلسل** بھی شائع ہوئی ہے اور اس کی دوسری جلد جو تحریک آزادی کی تاریخ کا ایک بیان ہے زیر قلم ہے.

مولانا غازی کی دوسری اہلیہ سے اولاد

مولانا حامد الانصاری غازی کی دوسری شادی ہاجرہ نازلی بنت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب سے ۱۹۳۹ء میں ہوئی. ان سے چار بیٹے محمد طارق غازی (دیوبند

۱۹۴۱ء)، محمد خالد غازی (دیوبند۱۹۴۴ء)،سلمان منصور غازی (دیوبند۱۹۵۰ء)، ارشد منصور غازی (بمبئی ۱۹۵۲ء)،اور ایک بیٹی شہناز غازی (دیوبند۱۹۴۶ء) ہوئیں. ہاجرہ نازلی اسلامی ذہن رکھنے والے مسلم گھرانوں میں نہایت مقبول مصنفہ تھیں .ان کے دو درجن ناول اور سو سے زیادہ افسانے شائع ہوئے ہیں .ان کے تمام ناول امریکن لائبریری آف کانگریس میں محفوظ ہیں اور ہندستان پاکستان میں نایاب ہیں .ان کا انتقال علی گڑھ میں مارچ ۲۰۰۴ء میں ہوا. یونیورسٹی کے قبرستان میں آسودہ خاک پاک ہیں.

محمد طارق غازی کی شادی نور جہاں بنت بشیر احمد انصاری ابن شبیر احمد انصاری انبہٹوی سے ہوئی جن سے ایک بیٹا محمد منصور غازی (حیدرآباد ۱۹۶۸ء) ہے. محمد منصور غازی برقی انجنیر ہیں. انہوں نے امریکہ کی بوسٹن یونیورسٹی سے انجنیر نگ میں بیچلرز ڈگری حاصل کی اور پرڈو (Purdue) یونیورسٹی سے ماسٹرس کیا. دوران تعلیم ہی ورمونٹ یونیورسٹی اور شکاگو یونیورسٹی سے عربی زبان کے ڈپلومے حاصل کئے اور اسلامی علوم حیدرآباد کے جامعہ سبیل الاسلام میں پڑھے. امریکی ادارہ المدینہ انسٹی ٹیوٹ سے وہ اوران کی اہلیہ اصول دین میں گریجویشن کررہے ہیں. شعر بھی کہتے ہیں. ان کی شادی عظمیٰ یاسمین بنت نجم الاسلام مثیل ابن مولانا جمیل احمد مجاہد ابن مولانا مفتی صدیق احمد مالیرکوٹلوی سے ہوئی. ان کے چار بیٹیاں عفرا الانصاری غازی (بیلویل، کینڈا: ۱۹۹۹ء)، عفاف الانصاری غازی (آٹوا، کینڈا: ۲۰۰۱ء)، عافیہ الانصاری غازی (آٹوا، کینڈا: ۲۰۰۳) اور عفیفہ الانصاری غازی (آٹوا، کینڈا: ۲۰۰۹ء) ہیں. محمد طارق غازی اردو اور انگریزی کے نامور صحافی اور اہل قلم ہیں. ہندستان میں روزنامہ **چنار** سری نگر، روزنامہ **عصر جدید** کلکتہ، ماہنامہ **سائنس** بمبئی، ہفتہ وار **ابوالکلام** بمبئی، انڈو عرب سوسائٹی بمبئی کے انگریزی پندرہ روزہ **انڈو عرب نیوزلیٹر** کے مدیر اعلی تھے. کچھ عرصہ ٹائمز آف انڈیا اور اکنومک ٹائمز آف انڈیا میں بھی کام کیا حجاز مقدس میں جدہ کے انگریزی روزنامہ **سعودی گزٹ** کے پہلے غیر یورپی، غیر امریکی، ہندستانی مسلمان مدیر تحریر تھے. ڈنمارک کے ایک ابلیسی اخبار کے شیطانی

کارٹونسٹوں نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی تو مسلمانان عالم کی جانب سے اس کے غیر جذباتی اور منطقی جواب میں ایک کتاب **دی کارٹونس کرائی (کارٹون زاری -The Cartoons Cry)** لکھی جو امریکہ سے شائع ہوئی ہے اور دانشواران مغرب کی ستائش کی مستحق ہوئی. ان کی دوسری اہم اور ضخیم تصنیف **نظریۂ تہذیب** فلسفۂ ارتقا، تہذیب وتمدن کی تاریخ کو ایک بالکل نئے زاویے سے پیش کرتی ہے. اس کتاب میں قرآنی ادوار تاریخ کا بیان و تجزیہ تاریخ نگاری کے جدید تجزیاتی پیمانوں کی اساس پر کیا گیا ہے. ان کی تیسری تالیف انصاریان جنوبی و سطی ایشیا اور دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ان کی اولادوں کے حالات پر دقیق تحقیقی سوانحی موسوعہ **تذکار الانصار** ہے. ان کے علمی تحقیقی مقالے ماہنامہ **معارف** اعظم گڑھ، ہندستان، اور سہ ماہی **الاقربا** اسلام آباد، پاکستان، میں پابندی شائع ہوتے رہتے ہیں.. سہ ماہی **اسلام اور عصر جدید** نئی دہلی میں بھی ان کے چند تحقیقی مقالے شائع ہوئے ہیں، چند مقالے گجراتی زبان میں ترجمہ ہوئے ہیں. شعر بھی کہتے ہیں. امم سٹڈیز ہاؤس، ٹورانٹو، کے بانی ڈائریکٹر ہیں.

محمد خالد غازی کی شادی صبیحہ بنت سید محمد احتشام کاظمی سے ہوئی جن سے ان کے دو بیٹے محمد عرفان غازی (ہنٹسویل، الاباما: ۱۹۸۴ء) اور عمر محمد غازی (فیرفیکس، ورجینیا: ۱۹۹۳ء) اور ایک بیٹی لبنیٰ غازی (فیرفیکس، ورجینیا: ۱۹۸۸ء) ہیں. یہ سب ورجینیا اور میریلینڈ کے علاقوں میں امریکہ میں آباد ہیں. محمد عرفان غازی کی شادی صغریٰ بنت چراغ علی سے ہوئی ہے. لبنیٰ غازی کی شادی فیضان جمیل سے ہوئی ہے اور دو بیٹیاں عمارہ نسیبہ اور عالیہ ہیں. عمر غازی کی شادی ابھی نہیں ہوئی ہے. محمد خالد غازی کمپیوٹر انجنیر اور میکگل یونیورسٹی مونٹریال کینڈا سے اسلامیات میں ایم اے ہیں. وہ ادارہ حکمت قرآن کے بانی ہیں اور علوم قرآن کی ترویج وتعلیم میں مشغول ہیں. اہل قلم ہیں اور گاہے ماہے شعر بھی کہتے ہیں. چند تحقیقی کتابیں زیر قلم ہیں.

سلمان منصور غازی کی شادی عظمیٰ ناہید بنت مولانا محمد سالم قاسمی سے ہوئی جن

سے ان کے ایک بیٹا محمد علی (دیوبند۱۹۸۲ء) اور ایک بیٹی ثنا نورین غازی (دیوبند۱۹۸۶ء) ہیں. محمد علی غازی کی شادی گورکھپور کی ڈاکٹر سماء سے ہوئی ہے. ایک بیٹا محمد ابراہیم غازی (۲۰۱۴ء) ہے. ثنا نورین غازی نے شادی نہیں کی. سلمان منصور غازی اقرا ایجوکیشن فاؤنڈیشن ممبئی کے ڈائریکٹر ہیں. اقرا انٹرنیشنل ایجوکیشن فاؤنڈیشن شکاگو کے تیار کئے ہوئے اسلامی نصاب تعلیم کو ہندستان اور عرب ممالک میں رواج دے رہے ہیں. اہل قلم اور شاعر ہیں. ان کے مضامین ملک کے مؤقر مجلّات و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں.

ارشد منصور غازی کی پہلی شادی طلعت بنت حکیم قمر الاسلام سے ہوئی تھی. اس شادی سے دو بیٹے یاسر غازی اور طلال غازی اور ایک بیٹی بشریٰ غازی ہوئے. دوسری شادی انبہٹہ کے لئیق احمد انصاری مرحوم کی نواسی مہ جبیں کہکشاں بنت رحمٰن صدیقی سے ہوئی جن سے تین بیٹے محمد عمر غازی (۱۹۹۴ء)، حسن غازی (۱۹۹۹ء) اور عبداللہ غازی (۲۰۰۱ء) اور ایک بیٹی زینب غازی (۱۹۹۷ء) ہیں. ارشد منصور غازی صاحب اسلوب و طرز شاعر ہیں. ان کا مجموعہ کلام **نصاب آگہی** شائع ہو چکا ہے.

مولانا غازی اپنی اکلوتی بیٹی شہناز غازی کو اپنا ''چھٹا بیٹا'' کہا کرتے تھے. ان کی شادی صحافی شمس کنول (اصل نام شمس الاسلام صدیقی) سے ہوئی تھی. ایک بیٹی ناشیہ چند دن کی تھی کہ انتقال ہو گیا تھا. شہناز غازی اردو کی مقبول مصنفہ ہیں. ان کے پانچ ناول- **بادل کا سایہ**، **شهابی**، **جوهی کی کلیاں**، **مهکتا آنچل** اور **آبگینه**، نیز شاہکار تخلیق **وقت کا مسافر** مختصر سوانحی مضامین کی ایک کتاب **کتب خانه گل**، دو سفرنامے **پیاروں کا پردیس** اور **چھاؤں تلے**، اور افسانوں کا ایک مجموعہ **دل کی زمیں** شائع ہو چکے ہیں. ان کے افسانے مختلف موقر ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں. انہوں نے ایک غریب خاندان کی بچی سلمیٰ تنویر کو متبنیٰ کر کے اسے اعلیٰ تعلیم دلوائی. سلمیٰ تنویر نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے درسیات میں ایم. اے. کیا ہے اور تعلیم و تدریس سے وابستہ ہیں. سلمیٰ تنویر کے شوہر عابد رضا خان تجارت کرتے ہیں.

قاری حمید میاں ابن مولانا منصور انصاری

مولانا محمد میاں منصور انصاری کے تیسرے صاحبزادے قاری حمید میاں انصاری تھے. مولانا منصور انصاری اپنے انقلابی دوروں کے بعد جلال آباد (افغانستان) میں مستقل قیام کی غرض سے تشریف لائے تو انہیں کسی سہارے کی ضرورت محسوس ہوئی. ان کی بیگم حفصہ خاتون نے اس وقت پھر قربانی دی اور چھوٹے بیٹے حمید میاں کو ان کی خدمت کے لئے روانہ کر دیا. اس کے بعد حمید میاں وہیں کے ہو رہے. مولانا منصور انصاری کے انتقال کے بعد خانگی ذمہ داریاں قاری حمید میاں کے حصے میں آئیں اور انہوں نے اپنے والد کی تمام افغان اولاد کی پرورش اپنی اولاد کی طرح کی، ان کی شادیاں کیں اور گھر آباد کئے لیکن وہ اپنا گھر کبھی نہ آباد کر سکے. ان کا انتقال حالتِ مہاجرت میں پشاور میں اگست ۱۹۸۹ء میں ہوا اور وہیں قبرستان شہداء افغانستان میں آسودہ خاک پاک ہیں.

حکیمہ قدسیہ بی بنت مولانا منصور انصاری

مولانا منصور انصاریؒ کی بڑی بیٹی قدسیہ بی کی شادی خاندان میں جمیل احمد سے ہوئی تھی جو کوئٹہ کے ایک بڑے سکول میں معلم تھے. شادی کے دو سال بعد ۱۹۳۵ء میں کوئٹہ کے زلزلے میں دونوں میاں بیوی ملبہ میں دب گئے تھے. قدسیہ بی زندہ نکل آئیں لیکن جمیل احمد شہید ہو گئے. قدسیہ بی کو ان کے بھائی مولانا حامد الانصاری غازی واپس دہلی لے آئے اور والد گرامی مولانا منصور انصاری کے حکم پر طبیہ کالج میں داخل کروا دیا. یہ بات ذکر کے لائق ہے کہ علماء کے خاندانوں میں عورتوں کی تعلیم کا قطعاً فقدان رہا ہے. اب اگر اس طرف توجہ ہوئی ہے تو بس اتنی کہ علماء کے خاندانوں کی لڑکیاں سکولوں اور یونیورسٹیوں میں جا رہی ہیں، ان کی دینی تعلیم کی طرف آج بھی ضروری توجہ نہیں ہے. مولانا منصور انصاریؒ کو اس ضرورت کا احساس، ترکی اور وسط ایشیا کی سیاحت کے بعد ہوا کہ عورتوں کی تعلیم اہم ہے. اس زمانے میں ترکی کی انقلابی ادیبہ خالدہ ادیب خانم کا بھی بہ شہرہ تھا.

قدسیہ بی نے حکیم اجمل خاں کے طبیہ کالج دہلی سے حکمت کی تکمیل کی، اول

آئیں اور گولڈ میڈل کی مستحق قرار دی گئیں. ان کی دوسری شادی دیوبند کے مشیر الحسن صدیقی سے ہوئی. ان سے کئی اولادیں ہوئیں لیکن صرف وسیع الزماں زندہ رہے جن کی شادی پور قاضی کی انور جہاں بیگم سے ہوئی مگر کوئی اولاد نہیں ہوئی. مشیر الزماں صدیقی کی پہلی بیوی سے دو بیٹے مطیع الزماں اور فصیح الزماں تھے. ان سے قدسیہ بی کو غیر معمولی محبت تھی. وہ اچانک پاکستان چلے گئے اس سے ان کو بہت صدمہ ہوا. دوسرے دیوبند کا خواتین سے متعلق ماحول بھی ان جیسی اعلیٰ تعلیمیافتہ خاتون کو راس نہیں آیا. تیسرے متواتر صدمات نے ان کی دماغی صحت کو متاثر کر دیا تھا. ان کا انتقال یکسوئی کے عالم میں دیوبند ہی میں ہوا. قاسمی قبرستان میں اپنی والدہ اور دوسرے عزیزوں کے ساتھ مدفون ہیں. کچھ عرصہ بعد ۲۰۰۴ء میں ان کے بیٹے وسیع الزماں کا بھی انتقال ہو گیا اور وہ بھی قاسمی قبرستان میں مدفون ہیں.

مولانا منصور انصاری کی دوسری شادی

مولانا منصور انصاری نے دوسری شادی صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختونخوا) کے قبائل آزاد میں باجوڑ کے ایک سادات خاندان میں زہرہ بیگم سے کی تھی. یہ سماجی ضرورت بھی تھی اور سیاسی بھی. زہرہ بیگم سے مولانا منصور انصاری کے دو لڑکے ہوئے عبید اللہ منصور انصاری اور قاری سیف اللہ منصور انصاری اور تین لڑکیاں امۃ اللہ، فردوسیہ اور امیت اللہ ہوئیں. امت اللہ کمسنی میں فوت ہو گئی تھیں. مولانا منصور انصاری کا انتقال ۱۱ر جنوری ۱۹۴۶ء میں جلال آباد میں ہوا اور لغمان میں حضرت نوح علیہ السلام کے والد حضرت لمک کے قبرستان میں سرکاری اعزاز کے ساتھ تدفین ہوئی.

افغانستان پر سوویت یونین کے جارحانہ حملہ اور قبضہ کے نتیجہ میں جو لاکھوں افراد بے گھر اور منتشر ہوئے تھے ان میں مولانا منصور انصاری کے بیٹے عبید اللہ منصور انصاری کا خاندان بھی بے وطن ہوا. اب وہ اور ان کی اولاد جرمنی کے شہر میں کاسل (Kassel) میں مقیم ہیں. ان کی اولاد نے جرمنی کی شہریت اختیار کر لی ہے. قاری سیف اللہ منصور انصاری اپنے آبائی گھر جلال آباد میں مقیم ہیں. سوویت جارحیت کے بعد ان کا خاندان پاکستان چلا آیا تھا. ان کی اولاد دو

احفاد کابل میں ہیں. ان کے چار بیٹوں کے نام خلفائے راشدین کے نام پر صدیق، عمر، عثمان اور غالب ہیں. تین بیٹیاں جمیلہ، حسینہ قدسیہ اور ہاجرہ ہیں. اولاد کا حال آگے بیان میں آرہا ہے.

عبید اللہ منصور انصاری اور قاری سیف اللہ منصور انصاری کی سرپرستی میں جلال آباد، افغانستان، میں مولانا منصور انصاری فاؤنڈیشن قائم کی گئی ہے. جس کے ماتحت صدیق منصور انصاری، عمر منصور انصاری اور ان کے بھائی بہن مولانا منصور انصاری کی سوانح اور ان کی تالیفات دری/ فارسی اور پشتو زبانوں میں شائع کر رہے ہیں. مولانا حامد الانصاری غازی کی کتاب **اسلام کا نظام حکومت** کا پشتو ترجمہ بھی انہوں نے شائع کیا ہے.

مولانا منصور انصاری کی افغان اولاد

مولانا محمد میاں منصور انصاری (زوجہ سیدہ زہرہ بیگم/ باجوڑ، علاوہ آزاد، صوبہ سرحد) = اولاد: امت اللہ. فردوسیہ. عبید اللہ. سیف اللہ. امیت اللہ.

☆ امت اللہ بنت مولانا منصور انصاری. کم سنی میں انتقال ہو گیا تھا.

☆ فردوسیہ بنت مولانا منصور انصاری (زوج عبد السبحان) = اولاد: صالحہ سبحانی عرف گل غٹوئی. اسد اللہ سبحانی. عزیز اللہ سبحانی. عصمت اللہ سبحانی. فرح ناز سبحانی. طیبہ سبحانی. رقیہ سبحانی عرف شہناز. فردوسیہ مرحومہ کے بیٹے کابل میں ہیں اور ان کی لڑکیاں جرمنی، لندن اور امریکہ میں رہتی ہیں. ان کی اولاد کی تفصیل حسب ذیل ہے.

صالحہ سبحانی صدیقی عرف گل غٹوئی (زوج عبد البصیر صدیقی) صالحہ کا قیام جرمنی میں ہے = اولاد: صفیہ صدیقی (زوج محمد زبیر ورساجی = اولاد: عزیر ورساجی. نُسیبہ ورساجی). زینب صدیقی (زوج جاوید ہاشمی = اولاد: حوانوحہ ہاشمی. الیاس ہاشمی). عبد الرحمٰن صدیقی. عبد اللہ صدیقی (منسوبہ پلواشہ). فرحت صدیقی. حبیب الرحمہ صدیقی. صفا صدیقی. یاسر صدیقی.

اسد اللہ سبحانی (زوجہ قدسیہ سبحانی) = لاولد انتقال ہو گیا.

عزیز اللہ سبحانی (زوجہ سے علحدگی ہو گئی) - اولاد: یاسمین سبحانی. سلمٰی سبحانی.

عصمت اللہ سبحانی (زوجہ حسینہ قُدسیہ منصور انصاری) = اولاد: عبدالباسط.

فرح ناز سبحانی (زوج غلام محی لدین صابر) = اولاد: صبرینا صابر. کریمہ صابر. سارہ صابر. شیلا صابر.

طیبہ سبحانی (زوج سید اسمٰعیل فاطمی) = اولاد: سید جلال فاطمی (زوجہ خاطرہ فاطمی) فریال فاطمی، سید اقبال فاطمی، سید جنید فاطمی.

رقیہ سبحانی عرف شہناز.

☆ عبیداللہ ابن مولانا منصور انصاری (زوجہ شیرین مرحومہ): اولاد:

ہدایت اللہ (زوجہ سمیرہ) = اولاد: نورا، مدینہ.

عنایت اللہ (زوجہ مرضیہ) = اولاد: حسیب، حوا.

مہ جبین (زوج فاروق) = اولاد: فرید، ادریس، ولید.

سارہ (زوج سفن پریدہ) = اولاد: یونس، الیاس.

زہرہ (زوج کولیاروز کرنس) = اولاد: امیرہ، صوفیہ.

☆ سیف اللہ ابن مولانا منصور انصاری (زوجہ بی بی مریم مرحومہ) = اولاد:

صدیق منصور انصاری (زوجہ رقیہ) = اولاد: مروہ، حمید حمزہ، محمد عباس، احمد طلحہ، سعد.

عمر منصور انصاری (زوجہ سالمہ انصاری بنت عبدالغفور و سلیمہ بنت امیت اللہ) = اولاد: سہیل، مریم، ایمان، ہدیٰ، عائشہ.

جمیلہ منصور انصاری (زوج اسلام الدین نجم).

حسینہ قُدسیہ منصور انصاری (زوج عصمت اللہ سبحانی) = اولاد: عبدالباسط.

عثمان منصور انصاری (زوجہ ملیحہ انصاری) = اولاد: ماریہ، ضحیٰ.

غالب منصور انصاری.

ہاجرہ منصور انصاری (زوج سید عمر یوسف زئی) = اولاد: ریان (بیٹی).

☆ امیت اللہ بنت مولانا منصور انصاری: (زوج عبداللہ قریشی) = اولاد:

ریحانہ (زوج حامد) = اولاد: صلاح الدین، قانتہ، اسامہ، سائحہ، وجیہہ، سعد.
سلیمہ (زوج عبدالغفور) = اولاد: عبد الصبور، سالمہ (زوج عمر ابن سیف اللہ انصاری)، عبدالصمد، عبدالاحد، عبدالواسع.
احمد سلیم قریشی مرحوم (زوجہ کریمہ قریشی) = اولاد: فاطمہ، حنا.
احمد بشیر قریشی (زوجہ نادیہ) = اولاد: عبداللہ، احمد بلال، عبدالباسط، عبدالہادی، محمد مزمل.
احمد زبیر قریشی (زوجہ ملائی قریشی) = اولاد: احمد شعیب، سمیّہ، سوما، ثنا.
امیت اللہ مرحومہ بنت مولانا منصور انصاری کی اولاد افغانستان، پاکستان اور امریکہ میں ہے. ان کے بیٹے احمد بشیر قریشی اور احمد زبیر قریشی اپنی اولاد کے ساتھ امریکہ میں مقیم ہیں.

مولانا احمد میاں انصاری

شیخ الاسلام مولانا عبداللہ انصاری کے دوسرے صاحبزادے مولانا احمد میاں انصاری تھے. ان کے متعلق زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں. ان کی شادی برکت بیگم سے ہوئی تھی. وہ عالم فاضل شخص تھے. تعلیم سے فراغت کے بعد ابتدا میں پیہاڑ (راجستھان) میں مدرس تھے. بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں دینیات کے پروفیسر ہو گئے تھے. مولانا مناظر احسن گیلانی اور سید محبوب رضوی نے لکھا ہے کہ وہ مولانا عبداللہ انصاری کے بعد ناظم دینیات مقرر ہوئے تھے. (۲) بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اطلاع صحیح نہیں. مگر تاریخی اور خاندانی روایات اس خیال کی تردید کرتی ہیں.

مولانا احمد میاں انصاری کی بڑی بیٹی محمودہ بیگم اور دو بیٹے حمد اللہ انصاری اور محامد اللہ انصاری تھے. محمودہ بیگم نے بھی مولانا منصور انصاریؒ کی ایما پر حکیم اجمل خاں کے طبیہ کالج دہلی سے قابلہ (obstetrician) کی سند حاصل کی تھی اور اعلیٰ نمبروں سے کامیاب ہوئی تھیں. علی گڑھ میں مستقل قیام رہا. ان کی دو یا چار لڑکیاں ہوئیں مگر زندگی نے وفا نہ کی. شوہر کے انتقال کے بعد کراچی میں بھائیوں کے پاس چلی گئی تھیں. وہیں انتقال ہوا. مولانا احمد میاں انصاری کے دونوں بیٹے تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے تھے اور کراچی میں

رہے. حمداللہ انصاری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے گریجویشن کے بعد آزادی سے پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں افسر رابطۂ عامہ (PRO) تھے. محامداللہ انصاری کاروباری سلسلہ میں دہلی، بمبئی اور آزادی کے بعد کراچی میں مقیم رہے. کراچی کے نمایاں تاجروں میں شمار تھا. کراچی ایوان تجارت کے سکریٹری جنرل اور مسلم کمرشیل بنک کے اعلی نائب صدر تھے. ان کی شادی دیو بند اور منگلور کے مسلم لیگی رہنما اور زمیندار سید محتشم کاظمی کی بڑی صاحبزادی سیّدہ بیگم سے ہوئی تھی.

مولانا احمد میاں انصاری کی اولاد کی تفصیل حسب ذیل ہے:

اولاد مولانا احمد میاں انصاری

مولانا احمد میاں انصاری ابن مولانا عبداللہ انصاری (زوجہ برکت بیگم) = اولاد:

محمودہ بیگم (زوج شاہ فاروق حسین صابری).

حمداللہ انصاری (زوجہ آمنہ خاتون بنت حاجی انیس احمد انصاری).

محامداللہ انصاری (زوجہ سیدہ بیگم بنت سید محتشم کاظمی).

❁ محمودہ بیگم بنت مولانا احمد میاں انصاری (زوج شاہ فاووق حسین صابری) = لاولد.

❁ حمداللہ انصاری ابن مولانا احمد میاں انصاری (زوجہ آمنہ خاتون بنت حاجی انیس احمد) = اولاد:

شاہد انصاری مرحوم (زوجہ خدیجہ انصاری) = اولاد: دو لڑکیاں اور ایک لڑکی.

ساجد انصاری مرحوم (زوجہ خولہ خاتون) = لاولد. ساجد بجلی کے حادثے سے متاثر ہوکر مفلوج رہے پھر انتقال ہوگیا خولہ عزیز آباد (پاکستان) میں رہتی ہیں.

حمیرہ (زوج ضیا انصاری مرحوم).

ناہید انصاری (زوج آصف).

❁ محامد اللہ انصاری ابن مولانا احمد میاں انصاری (زوجات: سیدہ نصرت کاظمی بنت سید محتشم کاظمی اور زبیدہ دل جان قریشی) = اولاد:

رفعت صبیحہ (زوج: انعام احمد عثمانی)
انجم فرحت (زوج: سید محمود عالم شاہ مرحوم)
کشور نکہت (زوج: سجاد احمد قریشی)
رعنا طلعت (زوج: سرور علی تھانوی مرحوم)
مسعودہ کوثر عرف مونا انصاری (زوج: مخدوم ہارون الرشید)
حمیدہ تبسم عرف سیما انصاری (زوج: مظہر الاسلام خان)
احمد منصور انصاری (زوجہ: نینا شیخ / شیخ صادق علی کی اولاد میں)
غزالہ تسنیم (زوج: سید درجات حسین)
ثریا نزہت (زوج: عقیل کریم الدین خواجہ)

احمد منصور انصاری عمارتی انجینئر ہیں. ان کی شادی انبہٹہ کے انصاری خاندان میں ہوئی جو سابق ریاست خیر پور سندھ نیز کراچی اور مشرق وسطی میں آباد ہے. اس خاندان کے جد اعلیٰ شیخ صادق علی خیر پور اسٹیٹ کے وزیر اعلیٰ تھے انہوں نے انبہٹہ میں ایک مدرسہ قاسم العلوم قائم کیا تھا جو تقسیم کے بعد بند ہو گیا تھا. بعد میں مقامی لوگوں نے اسے دوبارہ جاری کیا.

مولانا عبداللہ انصاری کی دختری اولاد - ا

مولانا عبداللہ انصاری کی تین بیٹیاں اکرام النساء بنت مولانا محمد قاسم نانوتوی سے ہوئیں: امت السلام، امت المنان اور ام کلثوم. ان میں امت السلام اور امت المنان کی اولاد کا حال ملتا ہے جو آگے بیان میں آئے گا. ام کلثوم کی شادی حکیم حافظ علی انبہٹوی سے ہوئی تھی مگر اولاد کی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی. امت السلام کی شادی پروفیسر رشید احمد سالم انصاری ابن شاہ مجید علی ابن شاہ احمد علی ابن شاہ قطب علی سے ہوئی تھی جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں فارسی کے صدر شعبہ تھے. ۱۹۲۰ء کی خلافت تحریک میں جب شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی تحریک پر مولانا محمد علی کی قیادت میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم ہوئی تو وہ انگریزوں کے حامی علی گڑھ سے استعفٰی دے کر جامعہ ملیہ سے منسلک ہو گئے. وہاں سے سبکدوشی کے بعد

اپنے داماد پروفیسر احسان احمد انصاری ابن حکیم آزاد انصاری، رکن دارالترجمہ، کی دعوت پر حیدرآباد گئے. پروفیسر احسان احمد انصاری دارالترجمہ میں شعبۂ نفسیات و فلسفہ کے سربراہ تھے اور جامعہ عثمانیہ کے طلبہ کے لئے اس شعبہ کی لاتعداد کتابیں انہوں نے اردو میں ترجمہ کیں. یہ مضامین وہ جامعہ عثمانیہ میں پڑھاتے بھی تھے. ان کے خسر پروفیسر رشید احمد انصاری کچھ عرصہ حیدرآباد میں قیام کے بعد آخر عمر میں دہلی واپس آ گئے تھے. محرم ۱۳۴۰ھ/ اکتوبر ۱۹۲۲ء میں وہیں ان کی وفات اور تدفین ہوئی. انہوں نے فارسی ادبیات کی بہت سی کتابیں تصنیف کیں. ان کے انتقال کے بعد ان کی بیگم امت السلام اپنے داماد پروفیسر احسان احمد انصاری کی دعوت پر حیدرآباد منتقل ہو گئیں اور وہیں ۱۹۴۲ء میں ان کا انتقال ہوا. حیدرآباد کی نواحی بستی رامناتھ پور کے عالمگیری قبرستان میں دیگر اعزہ کے ساتھ مدفون ہیں.

امت السلام اور پروفیسر رشید احمد انصاری کے دو بیٹے لطیف احمد اَلطف اور ڈاکٹر حنیف احمد تھے. تین بیٹیاں امۃ الرحمٰن، امۃ السبحان اور امۃ الدیان تھیں.

مولانا عبداللہ انصاری کی دوسری بیٹی امت المنان کی شادی مولوی محمد ابراہیم مدنی سے ہوئی تھی جن کی اولاد کی تفصیل آخر میں آئے گی. ام کلثوم کی شادی حکیم حافظ علی انبہٹوی سے ہوئی تھی. ان کی اولاد کا حال نہیں ملتا.

☆ امت السلام بنت مولانا عبداللہ انصاری (زوج پروفیسر رشید احمد سالم انصاری) = اولاد:

لطیف احمد الطف.

ڈاکٹر حنیف احمد انصاری.

امۃ الدیان (زوج معز الدین احمد) = لاولد.

امۃ الرحمٰن (زوج پروفیسر احسان احمد انصاری). اولاد کا بیان آگے آرہا ہے.

امت السبحان بنت پروفیسر رشید احمد سالم انصاری (زوج احمد حسن/علیحدگی ہوگئی تھی تو بچوں کی پرورش ان کے ماموں ڈاکٹر حنیف احمد انصاری نے کی تھی) = اولاد:

=احمد مظفر حسن.

=ظفر حسن.

=حمیرا (زوج انور).

=عائشہ (عاشو آپا).

=منی آپا.

پروفیسر رشید احمد سالم انصاری کے صاحب زادگان لطیف احمد الطف اور ڈاکٹر حنیف احمد انصاری کے کوائف زندگی اور اولاد کی تفصیلات مہیا نہ ہوسکیں. تقسیم سے پہلے ان سب کا قیام حیدرآباد میں تھا اور نواحی قریہ رامناتھ پور میں پروفیسر احسان احمد انصاری کی کوٹھی احسان منزل ان سب کا مرکز اجتماع تھی. بعد میں ان میں سے اکثر افراد اور خاندان پاکستان منتقل ہوگئے تھے اور وہاں سے یورپ اور امریکہ کے ملکوں میں جا کر آباد ہوئے.

مولانا لطیف احمد الطف انصاری نے اپنے نواسے رضی الدین اسد کو بتایا تھا کہ انہوں نے اور پروفیسر احسان احمد انصاری نے بابائے اردو مولوی عبدالحق کی اردو انگریزی لغت کی تحقیق وتدوین میں کم سے کم ۶۰ فی صدی مساہمت کی تھی لیکن بابائے اردو نے اس مشہور عام لغت میں ان دونوں اہل علم کا شکریہ نہ سہی ذکر تک بھی نہیں کیا. بابائے اردو کی علمی اخلاقیات کے بارے میں ایسی ہی شکایت اختر حسین رائے پوری نے بھی کی تھی جس کا ذکر ان کی بیٹی حمیدہ اختر نے اپنی سرگزشت **ھمسفر** میں کیا ہے.

احسان احمد انصاری کی اولاد

مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی کی نواسی امۃ الرحمٰن بنت پروفیسر رشید احمد سالم انصاری کی شادی حیدرآباد میں دارالترجمہ کے پروفیسر احسان احمد انصاری ابن حکیم الطاف احمد آزاد انصاری ابن محمد حسن سے ہوئی تھی. ممتاز شاعر حکیم آزاد انصاری سہارنپوری شاہ مجید علی ابن شاہ احمد علی کے نواسے، ان کی بیٹی محمود النساء زوجۂ محمد حسن کے بڑے صاحبزادہ تھے ان کی شادی منیبہ خاتون سے ہوئی تھی. ان کی ایک بیٹی حسینہ خاتون تھیں جو غالباً صفیہ خاتون بنت

جمیل احمد کی والدہ تھیں. اگر یہ اندازہ درست ہے تو یہ جمیل احمد ریاست حیدرآباد کے صدر ڈاک خانہ میں ایک اعلی عہدہ پر فائز تھے

.امت الرحمن بنت پروفیسر رشید احمد سالم انصاری سے پروفیسر احسان احمد انصاری کے پانچ بیٹے نورالدین محمود، نجم الدین مسعود، ضیاء الدین احمد، شمس الدین محمد اور محی الدین احمد، نیز دو بیٹیاں رضیہ سلطانہ اور زہرہ سلطانہ تھیں. پروفیسر احسان احمد انصاری نے دوسری شادی طاہرہ انصاری بنت لطیف احمد الطف ابن پروفیسر رشید احمد سالم انصاری سے کی تھی جن سے چار بیٹے شہاب الدین نصیر، رضی الدین اسد، رفیع الدین حمید، حمید الدین شمیم اور تین بیٹیاں لبنی، بشریٰ اور حمرا ہوئیں. ان کے بیٹے ٹورانٹو، کینیڈا میں مقیم ہیں. تفصیل حسب ذیل ہے:

امت الرحمن بنت پروفیسر رشید احمد سالم انصاری (زوج احسان احمد انصاری) = اولاد:

رضیہ سلطانہ بنت احسان احمد انصاری (زوج سید ریاض احمد) = اولاد:

سید حفیظ اختر (زوجہ صبیحہ علی) = اولاد: سلمان، حسن، سفیان.

سید کلیم اختر (زوجہ سانڈرا) = اولاد: عمر، سیما، ثوبیہ (ثوبیہ).

سید فہیم اختر مرحوم (زوجہ نجمہ) = اولاد: ثنا، عثمان.

زہرہ سلطانہ بنت احسان احمد انصاری (زوج سید محمود حسن) = اولاد:

طارق محمود (زوجہ زہرہ جعفری) = اولاد: شعیب طارق، بلال طارق.

انجم لیلیٰ محمود (زوج آصف کمال) = اولاد بلال صدیقی.

منصور محمود (زوجہ سلمیٰ) = اولاد: عثمان، سمیہ، ابوبکر، زید، طوبیٰ، ثوبیہ (ثوبیہ) طٰہٰ.

سہیل محمود (زوجہ سیدہ فاطمہ رقیہ) = اولاد: حذیفہ، اسامہ، عریبہ.

ہما محمود (زوج وقار جاوید قریشی) = اولاد: عائشہ، عاصمہ، عمر، مصطفیٰ.

نورالدین محمود ابن احسان احمد انصاری (زوجہ محمودہ عثمان) = اولاد:

زیبا انصاری (زوج اسمٰعیل احمد آصف) = اولاد: محمد احمد بابر، محمد علی آصف.

شیما محمود (زوج شیخ محسن منور).

تجمل احسان (زوجہ عائشہ) = اولاد: رحما، ندا، ثمون.
اجمل عمران (زوجہ شائستہ/حکیم بشیر احمد انصاری/محبوب نگر/ کی نواسی) = اولاد: ہبہ، احسان احمد، حسن محمود، ثنا.
افشاں انصاری (زوج سید نیر سعید) = اولاد: سمیرا، زُنیرہ، ہارون محمد.
عظمٰی انصاری (زوج سیف بقائی).
نجم الدین مسعود ابن احسان احمد انصاری (زوجہ افتخار سلطانہ) = اولاد:
اطہر مسعود انصاری (زوجہ سارہ بنت محی الدین احمد) = اولاد: مریم، فراز، زارہ، شیرین.
ثمینہ سلطانہ (زوج سید حماد اللہ حسینی) = اولاد: عثمان، سلمان.
صبا مسعود انصاری (زوج عامر شاہ) = اولاد: مناعم، معز، منال، مبین.
ضیاالدین احمد ابن احسان احمد انصاری (پہلی زوجہ سیدہ زہرہ جمال) = اولاد:
محمد آصف انصاری (زوجہ ماہین) = اولاد: ریان، عیان، اَلِسفہ.
عرفان احمد انصاری (زوجہ شائستہ قدوسی) = اولاد: حارث، علینا.
ضیاالدین احمد ابن احسان احمد انصاری (دوسری زوجہ رعنا کہکشاں احمد) = اولاد:
نبیل تنویر. جاوید تنویر. مصعب تنویر.
شمس الدین محمد ابن احسان احمد انصاری (زوجہ ساجدہ جمال) = اولاد:
رضوان احمد (زوجہ-) = اولاد: فریال، اویس، زینب، محمد.
احسان احمد (زوجہ نغمہ صدیقی) = اولاد: نعیمہ، عبداللہ.
شہلا انصاری (زوج قدوسی) = اولاد: مہرین، نیرہ.
محی الدین احمد ابن احسان احمد انصاری (زوجہ سعیدہ علوی) اولاد:
سارہ (زوجہ اطہر مسعود ابن نجم الدین مسعود) = اولاد: مریم، فراز، زارہ، شیرین.
زبیر احمد انصاری (زوجہ افشین)

ثمرہ انصاری (زوج سلیم باٹلی والا) اولاد: رابعہ.

پروفیسر احسان احمد انصاری کی دوسری شادی مولانا عبداللہ انصاری کے نواسے لطیف احمد الطف ابن پروفیسر رشید احمد سالم انصاری کی دختر طاہرہ انصاری سے ہوئی. ان کی اولاد کی تفصیل حسب ذیل ہے:

طاہرہ انصاری بنت لطیف احمد الطف (زوج احسان احمد انصاری) = اولاد:

=شہاب الدین نصیر انصاری ابن احسان احمد انصاری (زوجہ شمیم دوحدوالا/ دوسری بیوی لیوبا شاپرکو- لاولد) = اولاد: شمع انصاری.

=رضی لدین اسد انصاری ابن احسان احمد انصاری (زوجہ بشریٰ آصف علوی) = اولاد:

عمر محمود

نوید انصاری = اولاد: عیسیٰ

فرح انصاری.

=رفیع الدین حمید انصاری ابن احسان احمد انصاری (زوجہ شہناز خان) = اولاد: عالیہ ،سعدیہ

=حمید الدین شمیم انصاری ابن پروفیسر احسان احمد انصاری(زوجہ صائمہ/ دوسری زوجہ- سلمیٰ) = اولاد: علی انصاری، حسن انصاری، ارسلان انصاری، ثمونہ (شمعونہ؟)

=لبنیٰ سلطانہ انصاری بنت احسان احمد انصاری (زوج جاوید بشیر) = اولاد: مرتضیٰ جاوید، عمیر جاوید، اسماجاوید

=بشریٰ سلطانہ انصاری بنت احسان احمد انصاری (زوج محمد عادل حسن) = اولاد: سبین، عائشہ، ماریہ.

=حمرا سلطانہ انصاری بنت احسان احمد انصاری(زوج نادر پاشا، عظیم الدین خان) = اولاد: نازش پاشا، عروج پاشا.

مولانا عبداللہ انصاری کی دختری اولاد - ۲

☆امت المنان بنت مولانا عبداللہ انصاری(زوج مولوی محمد ابراہیم مدنی)=اولاد:

اسرائیل مدنی(راضیہ خاتون)=اولاد:جمیل مدنی/خلیل مدنی زوجہ--)= اولاد:

افشاں،رخشاں،سیما.

یامین مدنی،یاسین مدنی،سموئیل مدنی،

نعیمہ(زوج احمد عبدالرحیم)=اولاد:بکن بھائی،عارف عبدالرحیم.

حسینہ(زوج محمد علی ہاشمی)=اولاد:ان کی اولاد امریکہ و پاکستان میں آباد ہے.

طیبہ(زوج--فاروقی)=اولاد:ان کے بیٹے امداد فاروقی پاکستان میں ہیں.

اسرائیل مدنی کے ایک بیٹے جمیل مدنی کا لندن میں انتقال ہوا دوسرے خلیل مدنی لندن میں مقیم ہیں اور ان کی تین لڑکیاں افشاں،رخشاں اور سیما تینوں صاحبِ اولاد ہیں اور امریکہ میں شادو آباد ہیں.

☆ ام کلثوم بنت مولانا عبداللہ انصاری کی شادی حکیم حافظ علی انبہٹوی سے ہوئی تھی جو ۱۹۴۵-۱۹۴۷ء کے دوران انبہٹہ کانگریس کے صدر تھے.اولاد کی تفصیل نہیں مل سکی.

لطیف احمد الطف ابن پروفیسر رشید احمد سالم انصاری اور ان کے بھائی ڈاکٹر حنیف احمد انصاری کے حالات زندگی،شادی اور اولاد کی تفصیلات مہیا نہ ہو سکیں.مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی کے دو بڑے بیٹوں مولانا احمد حسن انصاری اور مولانا عبدالرحمٰن انصاری اور باقی دو بیٹیوں کے حالات کی تفصیل بھی مہیا نہیں ہو سکی.

حاشیہ

۱- غازی،محمد طارق الانصاری. **تذکار الانصار**.اقرا ایجوکیشن فاؤنڈیشن ممبئی.

۲- رضوی،سید محبوب. **تاریخ دارلعلوم دیوبند**.ص۱۸۶.

اس باب کی ترتیب میں ڈاکٹر عابداللہ غازی کی خاندانی یادداشتوں سے بھی مدد لی گئی ہے.

مراجع

الف

امداد اللہ، حاجی (مہاجر مکی)۔ **مجموعہ مکتوبات** قلمی۔

امداد، عرفان۔ ماہنامہ **الفرقان** لکھنؤ۔ اپریل ۱۹۷۹ء۔

امروہی، محمد ضیاء الدین احمد العلوی۔ **مراۃ الانساب**۔ رحیمی پریس۔ سوائی جے پور۔ ۱۹۱۷ء۔

انبہٹوی، مولانا مشتاق احمد۔ **انوار العاشقین**۔ صوفی فاؤنڈیشن۔ پنڈی بہاء الدین۔ ۱۳۹۸ھ۔

انبہٹوی، مولانا مشتاق احمد۔ **انوار العاشقین**۔ مجلس اشاعت العلوم/عثمان پریس۔ حیدرآباد۔ ۱۳۳۲ھ۔

انبہٹوی، مولانا مشتاق احمد۔ **التحفۃ الصادقیہ**۔ لاہور۔ ۱۳۲۹ھ۔

انصاری، مولانا عبداللہ (انبہٹوی)۔ **آغاز اسلام**۔ مطبع مجتبائی۔ دہلی۔ ۱۹۰۸ء۔

انصاری، مولانا عبداللہ (انبہٹوی)۔ **بکٹ کہانی یا بارہ ماسہ ربانی**۔ مطبع احمدی علی گڑھ۔ سنہ ندارد۔

انصاری، مولانا عبداللہ (انبہٹوی)۔ **درد نہانی بارہ ماسہ ربانی / بکٹ کہانی**۔ مطبع احمدی علی گڑھ۔ سنہ ندارد۔

انصاری، مولانا عبداللہ (انبہٹوی)۔ **خود نوشت**۔ قلمی۔ بلا سنہ۔

انصاری، مولانا عبداللہ (انبہٹوی)۔ **رہنمائے تصوف**۔ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ۔ ۱۳۴۰ھ۔

ب

بارہ بنکوی، شیخ الطاف الرحمن۔ **احوال علمائے فرنگی محل**۔ مطبع مجتبائی لکھنؤ۔ سنہ ندارد۔

برناوی، مولانا علاء الدین۔ **چشتیہ بہشتیہ**۔

بکداش، سائد۔ **الامام الفقیہ المحدث محمد عابد السندی الانصاری**۔ دار البشائر الاسلامیہ۔ بیروت۔ ۱۴۲۳ھ/۲۰۰۲ء

پ

پانی پتی، شیخ اسماعیل۔ **مکتوبات سرسید**۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ۔ لاہور۔ ۱۹۸۵ء۔

ت

تھانوی، شیخ محمد۔ **انوار محمدی**۔ مطبع ضیائی میرٹھ۔ ۱۲۹۱ھ

تھانوی، مولانا اشرف علی۔ **امداد الفتاوی**۔ دار الاشاعت۔ کراچی۔ سنہ ندارد۔

منتخب

ڈاکٹر رضیہ حامد

ح

حالی، مولانا الطاف حسین. **حیات جاوید**. انجمن ترقی اردو. دہلی. ۱۹۳۹ء۔

حسنی، مولانا عبدالحی. **نزهة الخواطر**. دار ابن حزم. بیروت. ۱۹۹۹ء۔

حسنی، مولانا عبدالحی. **نزهة الخواطر**. دائرۃ المعارف. حیدرآباد. ۱۹۸۱ء۔

حسین، مشتاق. **خطوط سرسید**. علی گڑھ. سنہ ندارد۔

حسین، میر ولایت. **آپ بیتی یا ایم لے او کالج کی کہانی**. علی گڑھ. ۱۹۷۰ء۔

خ

خان، شمس تبریز. **تاریخ ندوة العلماء لکھنو**- ج:۲. ندوۃ العلماء لکھنو. ۱۴۰۴ھ۔

ر

رامپوری، مولوی وحید الدین. **مرقومات امدادیہ**. مکتبہ برہان. دہلی. ۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء۔

رضوی، سید محبوب. **تاریخ دارالعلوم دیوبند**. ماہنامہ الرشید. ساہیوال. ۱۹۸۰ء۔

ز

زبیری، مولوی محمد امین. **تذکرۂ سر سید**. لاہور. سنہ ندارد۔

زبیری، مولوی محمد امین. **تذکرۂ محسن**. دہلی. ۱۳۵۳ھ۔

ع

عباس، اصغر. **سرسید کی تعزیتی تحریریں**. ایجوکیشنل بک ہاؤس. علی گڑھ. ۱۹۸۹ء۔

علوی، ڈاکٹر تنویر احمد. **بارہ ماسہ کی روایت– مطالعہ و متن**. دہلی اردو اکیڈمی. دہلی. ۱۹۸۸ء۔

علی، سر رضا. **اعمال نامہ** (آپ بیتی). خدا بخش لائبریری. پٹنہ. ۱۹۹۲ء۔

غ

غازی، محمد طارق الانصاری. **تذکار الانصار** (سوانحی موسوعہ) اقرا ایجوکیشن فاؤنڈیشن ممبئی. ۲۰۱۸ء

ف

فتحپوری، مولانا عبدالوحید صدیقی. **حیات ظہور—سوانح مولانا ظہور الاسلام فتحپوری** فتحپور. ۱۹۹۴ء۔

ک

کاندھلوی، مولانا احتشام الحسن. **حالات مشائخ کاندھلہ**. اشاعت دینیات. دہلی. سنہ ندارد۔

ککے زئی، فضل الدین. **مضامین سرسید – مشمولہ تہذیب الاخلاق**. لاہور. ۱۹۱۰ء۔

کیرانوی، مولانا محمد سعید عثمانی. صدائے حرم – روئداد مدرسہ صولتیہ. ۱۳۴۷-۱۳۴۸ھ
۸۴-۱۹۳۱ء
کیرانوی، مولانا محمد سلیم عثمانی. زبانِ حال – مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کی پچاس سالہ سرگزشت. دفتر مدرسہ صولتیہ. دہلی. ۱۹۴۱ء.

گ

گنگوہی، مولانا عبداللہ. ظِل صُفّہ – حالات مدرسہ تھانہ بھون. بلائی سٹیم پریس. ساڈھورہ. ۱۳۳۰ھ.
گیلانی، مولانا مناظر احسن. سوانح قاسمی. دارالعلوم. دیوبند. ۱۳۷۳ھ.

م

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس. روداد. اجلاس نہم ۱۸۹۴ء. مفید عام پریس علی گڑھ. ۱۸۹۵ء.
محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس. روداد. اجلاس علی گڑھ. ۱۹۰۵ء.
مدرسۃ العلوم علی گڑھ. اجلاس ٹرسٹیان. روداد ۳۴. مطبع احمدی علی گڑھ. ۱۹۰۴ء.
مدرسہ عربیہ. دارالعلوم. دیوبند. روداد سال ۱۲۸۳ھ.
مدرسہ عربیہ. دارالعلوم. دیوبند. روداد سال ۱۲۸۴ھ.
مدرسہ عربیہ. دارالعلوم. دیوبند. روداد سال ۱۲۸۵ھ.
مدرسہ عربیہ. دارالعلوم. دیوبند. روداد سال ۱۲۸۶ھ.
مدرسہ عربیہ. دارالعلوم. دیوبند. روداد سال ۱۲۸۷ھ.
مدرسہ عربیہ. دارالعلوم. دیوبند. روداد سال ۱۲۸۸ھ.
مدرسہ عربیہ. دارالعلوم. دیوبند. روداد سال ۱۲۸۹ھ.
مدرسہ عربیہ. دارالعلوم. دیوبند. روداد سال ۱۲۹۰ھ.
مدرسہ عربیہ. دارالعلوم. دیوبند. روداد سال ۱۲۹۱ھ.
مدرسہ عربیہ. دارالعلوم. دیوبند. روداد سال ۱۲۹۲ھ.
مطبع مجتبائی. فہرست کتب و مطبوعات مطبع مجتبائی. دہلی. ۱۹۰۵ء.
میرٹھی، مولانا عاشق الٰہی. تذکرۃ الخلیل. دارالکتاب. دیوبند. ۲۰۰۳ء.
میرٹھی، مولانا عاشق الٰہی. تذکرۃ الخلیل. سہارنپور. ۱۳۹۵ھ.
میرٹھی، مولانا عاشق الٰہی. تذکرۃ الرشید. دارالکتاب. دیوبند. ۲۰۰۲ء.

میرٹھی، مولانا عاشق الٰہی. **تذکرۃ الرشید**. سہارنپور. ۱۹۷۷ء.

میرٹھی، مولانا عاشق الٰہی. **مکاتیب رشیدیہ**. میرٹھ. ۱۳۲۴ھ.

ن

نامعلوم مدیر. ماہنامہ معارف. اعظم گڑھ. **مکتوب شبلی بنام سرسید** ۳:۱۱.

نامعلوم مرتب. **ناموران علی گڑھ — دوسرا کاروان**. سہ ماہی فکر و نظر علی گڑھ. ۱۹۹۶ء.

نانوتوی، حکیم امیر احمد عشرتی. **مکتوبات یعقوبی مع بیاض یعقوبی**. اشرف المطابع تھانہ بھون. ۱۹۲۹ء

نانوتوی، مولانا محمد قاسم/ انصاری، مولانا عبداللہ. **اجوبہ اربعین**. مطبع ضیائی. میرٹھ. ۱۹۹۱ء.

نانوتوی، مولانا محمد یعقوب. **حالات طیب—سوانح حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی**. بہاول پور. ۱۲۹۷ھ.

نانوتوی، مولانا محمد یعقوب. **حالات طیب—سوانح حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی**. نسخہ مرتبہ: مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی. مکتبہ نور. کاندھلہ. سنہ ندارد.

ندوۃ العلماء. روئداد اجلاس اول. کانپور.

ندوۃ العلماء. روئداد اجلاس دوم. لکھنؤ. مطبع انتظامی. کانپور.

ندوۃ العلماء. روئداد اجلاس سوئم.

ندوۃ العلماء. روئداد اجلاس چہارم.

ندوۃ العلماء. روئداد اجلاس نوزدہم.

ندوۃ العلماء. روئداد اجلاس بستم.

ندوی، اسحاق جلیس. **تاریخ ندوۃ العلماء لکھنو**- ج:۱. دفتر نظامت دار العلوم. ۱۴۰۳ھ.

ندوی، اکرام خان. **وقار حیات — سوانح وقار الملک**. ایجوکیشنل کانفرنس. کراچی. ۱۹۸۴ء.

ندوی، سید سلیمان. **مکاتیب شبلی**. مطبع معارف. اعظم گڑھ. ۱۹۲۵ء.

ندوی، سید سلیمان. **یاد رفتگان**. مکتبہ الشرق. کراچی. ۱۹۹۵ء.

ندوی، مولانا محمد ساجد قاسمی. **حضرت شیخ الہند: شخصیت، خدمات و امتیازات**. مرکز الکوثر التعلیمی والخیری. مراد آباد. ۲۰۱۴ء

نیا نگری، مولوی قاسم. **مجموعہ مکتوبات مولانا محمد یعقوب نانوتوی**. مطبع احمدی. علی گڑھ. ۱۳۲۷ھ.

■■

معاصرین کی قدردانی کے نمونے

ڈاکٹر عابداللہ غازی

مولفہ

شہناز کنول غازی

مضامین اہلِ فکر و فن

ڈاکٹر ذاکر حسین
ڈاکٹر نورالحسن نقوی
سید حامد
ڈاکٹر محمد قاسم صدیقی
ڈاکٹر محمد مظفرالدین فارقی
میر تراب علی ید اللہی
اشہد رفیق ندوی
امین حیدر
پروفیسر محمد حبیب
پروفیسر مسعودالحسن
حکیم سید ظل الرحمٰن
ڈاکٹر خلیق انجم
ڈاکٹر محمد یوسف اعظمی
مجتبیٰ حسین
عبید اقبال عاصم
افتخار امام صدیقی

قیمت: Rs. ۳۰۰

اقرا ایجوکیشن فاؤنڈیشن

A-2 Firdaus. 24 Veer Savarkar Road. Mahim (W) Mumbai 400016.
India Tel: +91-22-2444-0494

Email: contact@iqraindia.org www.iqraindia.org

تاریخ فہمی کا بالکل نیا انداز

نظریۂ تہذیب

تاریخ نویسی کا مختلف جدید اسلوب

محمد طارق غازی

کی ساحرانہ تحریر کا شاہکار

۴۰ سال کی سوچ اور وسیع مطالعہ کا شاہ اثر ثمرہ

عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کی ۴۹/ا اہم تفاسیر اور قرآنیات، تاریخ، عمرانیات، فلسفہ، انفرادی و اجتماعی نفسیات، اِنسیات، طبیعیات، حیاتیات، جغرافیہ کی ۳۰۰ کتابوں کے حوالوں سے معمور ایک بے نظیر تحقیق

قیمت: ۵۰۰ روپے   یورپ اور امریکہ میں: ۲۵ ڈالر

سوانح مولانا حامد الانصاری غازی

ذکرِ غازی

ڈاکٹر عبید اقبال عاصم

حکیم الہند کی زندگی کے عجیب و غریب اور دلچسپ واقعات

- سترہ سال عمر تھی. جوانی کا زمانہ خواہشوں اور امنگوں کی تکمیل پر اکساتا ہے لیکن ان کی زندگی کا نصب العین تکمیل مقاصد تھا.
- ایک سوال یہ ہے کہ ہندستان سے انگریز حکومت کے انخلاء کے مطالبہ کی منطق کیا تھی. ہندستان کی تاریخ میں یہ آواز انگریزوں کے آنے سے پہلے کبھی نہیں اٹھی تھی اور کیوں نہیں اٹھی تھی؟
- دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ اجلاس سے پہلے مولانا غازی نے امت کے مستقبل کا پہلا قافلہ دارالعلوم کے ذی شعور طلبہ کو بنایا تھا اور اساتذہ کی ایک نشست میں ان سے تعاون کی درخواست کی تھی.
- رہنماؤں کو مخاطب کر کے کہا کہ جب کوئی ظالم قوم اسلام کے خلاف کھڑی ہوتی ہے تو اللہ اس سے انتقام لیتا ہے اور وہ، یوں اس قوم کے گلے میں اسلام کا پٹہ ڈال کر اسلام کی چوکیداری اس کے سپرد کر دیتا ہے.
- مولانا غازی چاہتے تھے کہ ہندستان کا مسلمان اس ملک کو کچھ دینے والا بن جائے لینے والا نہیں.
- ان کی عملی زندگی حقیقتاً سیدنا ابوبکر صدیقؓ کی زندگی سے مماثل تھی جب آپ اکثر جذبۂ خدمت خلق سے سرشار گھر کے لئے اللہ کا نام چھوڑ جاتے.
- وہ نوجوانوں سے کہتے تھے کہ بنیاد کا پتھر بنو جو کسی کو نظر نہیں آتا لیکن بلند و بالا عمارت کو قائم رکھتا ہے.

بہت جلد پیش کی جا رہی ہے

اقرا ایجوکیشن فاؤنڈیشن

A-2 Firdaus. 24 Veer Savarkar Road. Mahim (W) Mumbai 400016. India

Tel: +91-22-2444-0494

Email: contact@iqraindia.org www.iqraindia.org

سوانح مولانا حامد الانصاری غازی

فکر غازی

حکیم الہند مولانا حامد الانصاری غازی کے افکار عالیہ کا شاہکار انتخاب

اسلام کا نظام حکومت، مدینہ بجنور، جمہوریت ویکلی بمبئی کی نگارشات

☆ ایشیا نے یورپ کو مذہب عطا کیا تھا۔ اب اس کو حکومت کا طرز اور سلیقہ بھی عطا کرنا چاہیے۔

☆ بصیرت کی آنکھ دیکھنا نہیں چاہتی مگر مجبوراً دیکھتی ہے کہ انسان ایک خدا کی جگہ خدا کی مخلوق کو پوج رہا ہے۔

☆ یہ ایک کلیہ ہے کہ توحید کا زمانہ زندگی کی تنظیم و توحید کا دور ہوتا ہے اور شرک کے دور میں زندگی کے اجزاء متفرق اور منتشر ہو کر انسانی بدبختی اور پستی کو نمایاں کر دیتے ہیں۔

☆ ماضی کا غم ہے۔ حال کا فکر نہیں۔ آخر مستقبل کا عروج کیسے حاصل ہوگا۔

☆ جو قوم اپنی راہ سے علیحدہ ہو جاتی ہے وہ ہر اُس راہ پر چل نکلتی ہے جو سامنے آ جاتی ہے۔

☆ دنیا کا پہلا انسان پہلا سائنسداں تھا۔

☆ دنیاوی طرز کی موجودہ حکومتیں اپنے پسندیدہ اوصاف کا سلسلہ روما اور یونان سے ملا رہی ہیں تو اس کا سبب سیاسی تعصب کے علاوہ اور کسی شئے کو قرار نہیں دیا جا سکتا۔

بہت جلد پیش کی جا رہی ہے

اقرا ایجوکیشن فاؤنڈیشن

A-2 Firdaus. 24 Veer Savarkar Road. Mahim (W) Mumbai 400016. India

Tel: +91-22-2444-0494

Email: contact@iqraindia.org www.iqraindia.org

سوانح مولانا حامد الانصاری غازی

خطبات غازی

آزادی اور تقسیم ہند کے بعد مسلمانان ہند کے لئے حکیمانہ تدابیر

خطبہ دیوبند / اپریل ۱۹۴۷ء

❁ ہمارا پہلا قافلہ ۱۲/انسانوں پر مشتمل تھا، دوسرا تین ہزار پر، جب انگریز آئے تو ہم دو کروڑ تھے. آج (۱۹۴۷ء میں) دس کروڑ ہیں. اگر ہم ہندوؤں کو قتل کرتے تو یہ دس کروڑ مسلمان کہاں سے آتے؟

❁ ہمارے جماعتی نظام میں اول تو صلاحیت مند نوجوان کارکن بہت کم ہیں اور جتنے موجود ہیں انہیں سطح پر ابھرنے کے مواقع میسر نہیں.

خطبہ جونپور / فروری ۱۹۵۰

❁ بزرگوں کو ابھی ان علمی اور قانونی کاموں کا اندازہ نہیں ہے جو خالص علمی اور قانونی انداز میں اسلام کے بلند اصولوں کو مجروح کرنے کے لئے دوسرے علمی اداروں میں ہو رہے ہیں اور اس مقصد کے لئے لاکھوں روپیہ پانی کی طرح بہایا جارہا ہے. ان کوششوں کا مقابلہ ایک مرکزی نظام کے بغیر نہیں ہوسکتا.

خطبۂ کشمیر

❁ اس میلہ انور شاہی میں ہم لوگوں کا یہاں جمع ہونا پورے کشمیر کو ایک یونیورسٹی کی شکل دینے کے لئے ہے جو شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی زبان میں قرطبہ یونیوسٹی کے ہم پایہ ہو.

بہت جلد پیش کی جائے گی

اقرا ایجوکیشن فاؤنڈیشن

A-2 Firdaus. 24 Veer Savarkar Road. Mahim (W) Mumbai 400016. India

Tel: +91-22-2444-0494

Email: contact@iqraindia.org www.iqraindia.org

مولانا حامد الانصاری غازی کا شعری ارمغان

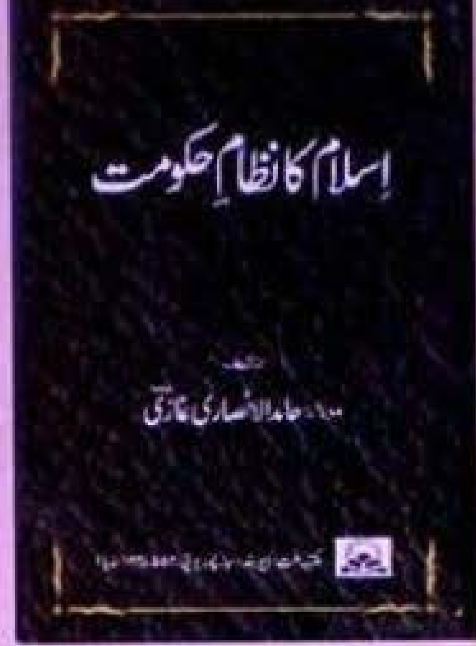
نویدِ فاران

بیسویں صدی کی نوجوان مسلم نسلوں کا ذہنی تجزیہ شعر کے اسلوب میں
جنوبی ایشیا کی تحریک آزادی کا ایک پہلو

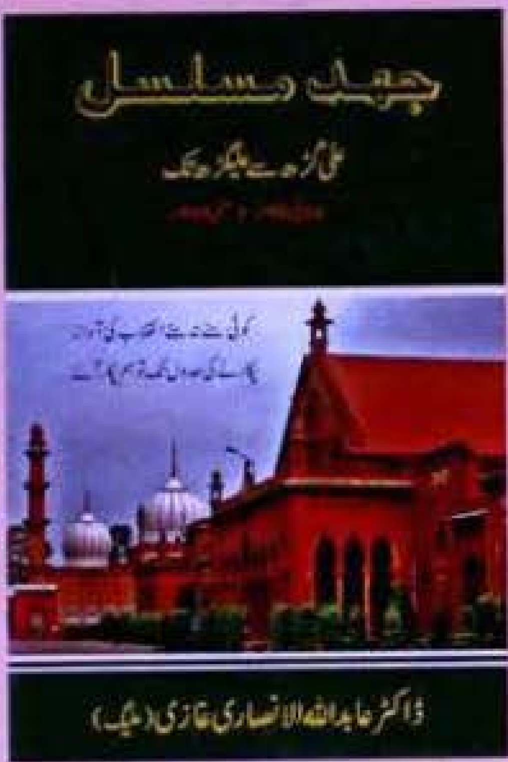
وہ شعر کہتے تھے مگر شاعر نہیں تھے
ان کے اشعار میں ان کی نثری تحریروں کی گونج ہوتی تھی
مولانا غازی کا انقلابی کلام

بہت جلد پیش کیا جا رہا ہے

اقرا ایجوکیشن فاؤنڈیشن
A-2 Firdaus. 24 Veer Savarkar Road. Mahim (W) Mumbai 400016. India
Tel: +91-22-2444-0494
Email: contact@iqraindia.org www.iqraindia.org



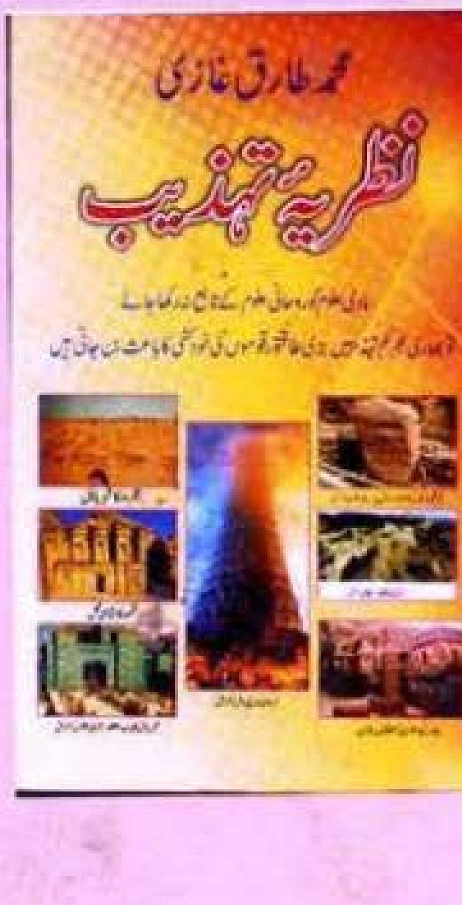
اسلام کا نظامِ حکومت تحقیق اور تصنیف کے میدا
میں مولانا حامد الانصاری غازیؒ کا کارنامہ ہے۔ یہ شاہکار کتاب ا
کے برسوں کے مطالعے، فکر، تلاش و تحقیق کا نتیجہ ہے۔ یہ کتاب ایک
عجیب و غریب صحیفہ ہے جو دنیا کی بہترین قوم یعنی خیر امت،
امت وسطیٰ کو دنیا میں بہترین حکومت برپا کرنے کا فرض یاد دلاتا ہے۔



جہدِ مسلسل۔ علی گڑھ سے علی گڑھ تک ڈاکٹر عابد اللہ غازی

ڈاکٹر عابد اللہ غازی کی سوانح کا وہ باب جس میں ان کے علیگڑھ
میں گزارے ہوئے آٹھ سالہ دور طالب علمی کی دلچسپ داستان ہے
۔اس دور کی تہذیب اور اخلاقی قدروں کے قصے اور تحریر میں قوتِ
اظہار کی فراوانی کے سبب یہ کتاب ایک قیمتی ادبی تحفہ ہے جسے پڑھ کر
آپ ڈاکٹر غازی کے دلچسپ انداز بیان سے حظ اٹھائیں گے

نظریۂ تہذیب



چالیس سال کے غور و فکر اور مطالعہ کا حاصل۔ مادی علوم کو روحانی
علوم کے تابع نہ رکھا جائے تو بھاری بھر کم تہذیبیں بڑی طاقتور
قوموں کی خودکشی کا باعث بن جاتی ہیں تہذیبوں کے عروج و
زوال کا فلسفہ قرآنی بیان کی روشنی میں علم، ملت،
مادیت، زوال کے چار عنوانات پر مشتمل بسیط مقدمہ
اور پانچ تہذیبوں کے خاتمہ کا حیرت انگیز تجزیہ۔
قیمت ۔۵۰۰ ہندستانی روپے - ۲۰ امریکن ڈالر

ISBN 978-81-936231-6-9

Price.Rs.300/-

IQRA' Education Foundation
A-2 Firdaus, 24 Veer Savarkar Road, Mahim West
Mumbai-400016 (India)
Tel: +91 22 2444 0494 Email: contact@iqraindia.org
www.iqraindia.org